زینتھ لائف انشورنس کمپنی لمیٹڈ

کے کاروبار کا شاندار ریکارڈ

سال	آمدنی	بیمہ	[illegible]	[illegible]
۱۹۱۶	۴۳۰۷			
۱۹۲۱	۸۸۰۹۱	۵۰		
۱۹۲۶	۱۹۵۲۸	۳۱۱۰۸۸	۲۴۰۸۲۱	۳۹۸۷۴۷
۱۹۳۱	۴۶۷۲۸۲	۶۹۴۴۷۸	۷۴۴۰۷	۹۸۳۰۰۵
۱۹۳۷	۷۵۶۱۱۰	۲۰۰۰۴۶۳	۲۰۳۹۲۵۸	۲۲۳۸۸۳۱

ممبروں میں جو رقم تقسیم کی گئی وہ پندرہ لاکھ روپے سے زائد ہے

بارسوخ ایجنٹوں کی معقول مشاہرہ پر

ہر ایک شہر میں ضرورت ہے

مسٹر ایس۔ اے۔ ایم بشیر برانچ مینجر

زینتھ لائف انشورنس کمپنی لمیٹڈ۔ دیال سنگھ بلڈنگ۔ دی مال۔ لاہور

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی، ادبی باتصویر رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۳۰ عالمگیر خاص نمبر ۱۹۳۹ء نمبر ۱

۱۵ دسمبر ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

حافظ محمد عالم صاحب ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شایع کیا۔

ملاحظات

اُردو جس نازک دَور میں سے گذر رہی ہے وہ قارئین کرام سے پوشیدہ نہیں ہے۔ مخالفین اُردو اس کا نام و نشان مٹانے پر تلے ہوئے ہیں بلکہ اب تو بوجوہ ان کی کوششیں اور زیادہ بار آور ہونے کے امکانات پیدا ہوگئے ہیں۔

ان حالات میں بہی خواہان اُردو کا اولیں فریضہ ہے کہ وہ پوری تندہی سے مخالفین کے مقابلہ میں متحد ہوجائیں اور اپنی جان سے عزیز زبان کی حفاظت میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کریں۔

"عالمگیر" کی خدمات اس باب میں ناظرین کرام سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ یہ رسالہ پندرہ سال سے برابر جاری ہے اور آج تک اس کی ایک اشاعت بھی کبھی ناغہ نہیں ہوئی۔ ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں یہ واحد علمی و ادبی پرچہ ہے جس نے اُردو زبان کی تہذیب و ترقی میں اکثر رسائل و جرائد سے زیادہ اور بڑھ چڑھ کر روپیہ، محنت اور وقت صرف کیا۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ہم نے زبان و ادب کی خدمت کے مقابلے میں جلب منفعت کو اپنا شعار نہیں بنایا اور عالمگیر کا گذشتہ ریکارڈ ہمارے اس دعوی کی تصدیق میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

عالمگیر کے خاص اور سالانہ نمبروں بلکہ اس کی ہر اشاعت کی معنوی و صوری شان کو دوبالا کرنے کیلئے روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے۔

ہمارے عزائم خدا تعالےٰ کے فضل و کرم سے بہت بلند ہیں۔ ہم عالمگیر کو دُنیائے ادب کا زیادہ سے زیادہ کامیاب رسالہ بنانا چاہتے ہیں لیکن ہم اپنے مقاصد میں اُس وقت تک کما حقہ کامیاب نہیں ہوسکتے جب تک کہ معاونین کرام ہمارا ہاتھ نہ بٹائیں۔

ابتک بھی جو ترقی عالمگیر نے کی ہے خدا تعالےٰ کے فضل و کرم کے بعد وہ بھی ناظرین کرام اور قلمی معاونین عظام ہی کی مشترکہ کوششوں کی رہین منت ہے۔ اگر ان کے مساعی ہمارے شامل حال نہ ہوتے تو ہمارے لئے کامیابی کے اس بام رفیع تک پہنچنا بہت مشکل تھا جس تک کہ بفضلہ تعالیٰ اب ہم پہنچ چکے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ ناظرین کرام نہ صرف اپنی سرپرستی ہی جاری رکھینگے بلکہ عالمگیر کی توسیع اشاعت کے لئے بھی اپنے حلقہ احباب میں پوری کوشش فرمائینگے۔

اس کے عوض میں یقین رکھئے کہ ہمارے عزائم بھی بلند تر ہوتے جائینگے اور ہم نہایت استقلال کے ساتھ جادۂ ترقی پر گامزن ہونے کے لئے اپنے آپ کو تیار پائیں گے۔

عالمگیر کا "خاص نمبر" حسب اعلان پیش خدمت ہے۔ قلت گنجائش کے باعث ہم اس کے ایک ایک مضمون پر اجمالی نگاہ ڈالنے سے قاصر ہیں اور ویسے بھی اس کی تعریف میں اپنی ہی زبان سے زمین و آسمان کے قلابے ملانا درست نہیں۔ صاحب ذوق حضرات خود ہی اندازہ لگا لینگے کہ ہماری کوششیں کس حد تک بار آور ہوئی ہیں۔ لیکن یہ عرض کردینا شاید غیر ضروری نہیں کہ اس کو کامیاب بنانے کے لئے ہم اپنی تمام امکانی کوششوں کو بروئے کار لائے ہیں۔

اس نمبر کی کامیابی میں سب سے زیادہ ہاتھ ہمارے قلمی معاونین کا ہے۔ باوجود وقت کی قلت کے اُنھوں نے اپنے بیش قیمت مضامین نظم و نثر ہمیں ارسال فرما کر رسالہ کی زیب و زینت کو چار چاند لگائے۔ ہم ان کے بصمیم قلب شکر گذار ہیں۔ نیز ہم اپنے مستقل خریدار حضرات کی خدمت میں بھی اپنے جذبات تشکر پیش کرتے ہیں در حقیقت

ان کی اعانت ہمارے لئے بہت حوصلہ افزا ہے۔ جن گرامی قدر حضرات نے نئے خریدار بہم پہنچائے اور عالمگیر کی توسیع اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان کی مہربانی اور کاوش کو بھی ہم کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔ پھر اس نمبر کو بروقت شائع کرنے میں دفتر اور عالمگیر الیکٹرک پریس کے کارکنوں اور عملہ کتابت نے بھی اپنا اپنا کام بروقت ختم کرنے کے لئے پوری محنت وجانفشانی سے کام لیا۔

ہمیں افسوس ہے کہ بعض اہل قلم حضرات کے مضامین دفتر میں دیر سے پہنچنے یا بہت زیادہ طویل ہونے کی وجہ سے شریک اشاعت نہیں ہوسکے انشاء اللہ تعالےٰ انھیں جنوری کے پرچہ میں ضرور شایع کردیا جائیگا۔

جون ۱۹۳۹ء میں شایع ہونے والے عالمگیر کے معرکہ آرا سالنامے کی تیاری جنوری ۳۹ء سے ہی شروع کردی جائیگی۔ اس لئے جن حضرات کے مضامین ایک معیّنہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جائیں گے صرف اُنہی کو شریک اشاعت کیا جائیگا۔ تاکہ ادارہ کو ان کی ترتیب وتہذیب کیلئے زیادہ سے زیادہ وقت مل سکے اور کتابت وطباعت اطمینان سے ہوسکے۔ اس دفعہ مضامین دیر سے موصول ہونے کی وجہ سے ہمیں غیر معمولی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔

سالنامہ عالمگیر ۱۹۳۹ء

جون میں حسب معمول عالمگیر کا ہنگامہ پرور سالنامہ شایع ہوگا۔ اس کی تیاریاں عنقریب شروع ہونے والی ہیں۔ مضامین کی ترتیب فروری کے آخر تک عمل میں آجائے گی جو اہل قلم حضرات فروری کے آخر تک اپنے مضامین بھجوا دینگے ان کو موزوں جگہ پر شائع کرنے میں ہمیں آسانی ہوگی۔ سالنامہ کے لئے نہایت دیدہ زیب تصاویر زیر انتخاب آچکی ہیں۔ تفاصیل اپنے وقت پر شائع ہونگی ویسے عالمگیر کا سالنامہ جس پایہ کا ہوتا ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ ہم صرف ایک فقرہ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ پیش آمدہ سالنامہ آپ کی توقعات سے بہت بالا ہوگا۔

اُردو ادب کی خدمت کے لئے ایک اور کام جو ہم نے کیا ہے وہ "عالمگیر بکڈپو" کا قیام ہے۔ اس میں ہر قسم کی علمی وادبی کتابیں ہر وقت فروخت کے لئے موجود رہتی ہیں۔ ہم قارئین "عالمگیر" سے پرزور استدعا کرتے ہیں کہ وہ اپنی ضروریات کی تمام کتابیں ہمیشہ عالمگیر بکڈپو سے خریدا کریں۔ اس طرح سے آپ کو دو فائدے ہونگے۔

ا۔ آپ کو تمام کتابیں بکفایت بسہولت، بحفاظت اور جلد از جلد مل جائینگی۔

۲۔ آپ اپنے محبوب رسالہ عالمگیر کی جائز امداد کریں گے۔ کیونکہ کُتب کی فروخت سے جتنا منافع ہوتا ہے وہ سب رسالہ کی بہتری وبہبودی کے لئے صرف کردیا جاتا ہے۔

عالمگیر بکڈپو کی ایک مختصر فہرست کتب رسالہ ہذا میں شائع ہوئی ہے آپ اُسے ایک نظر ضرور ملاحظہ فرمایئے یقین ہے کہ اس میں بعض ایسی کتابیں شریک ہونگی جن کے مُطالعہ کی فی الحقیقت آپ کو ضرورت ہے۔ پس سب سے پہلی فرصت میں وہ کتابیں عالمگیر بکڈپو سے طلب فرمایئے۔

ادارہ

ارشاداتِ عالیہ

استاذ السلطان نواب فصاحت جنگ حضرت جلیل مدظلہ جانشین امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ

بہاریں لٹا دیں جوانی لٹا دی — تمھارے لئے زندگانی لٹا دی

عجب حوصلہ ہم نے غنچے کا دیکھا — تبسم پہ ساری جوانی لٹا دی

صبا نے تو برسائے گل فصلِ گل میں — گھٹا نے مئے ارغوانی لٹا دی

اداؤں پہ کر دی فدا ساری ہستی — نگاہوں پہ دنیائے فانی لٹا دی

ستمگر نے رنگینیٔ خوابِ شیریں — سنی جب ہماری کہانی لٹا دی

بہت جان پیاری تھی لیکن اجل سے — ملی جب نئی زندگانی لٹا دی

نہ کھونا تھا غفلت میں عہدِ جوانی — عجب رات تھی یہ سہانی لٹا دی

نہ کی حسن کی قدر اے ماہ کامل — فقط رات بھر میں جوانی لٹا دی

جلیل آپ کی شاعری پر کسی نے
نگاہوں کی جادو بیانی لٹا دی

تخیلاتِ عالیہ

از عالیجناب نواب اختر یار جنگ بہادر اختر مینائی سابق ناظم و معتمد سرکارِ عالی صیغۂ مذہبی

عشق بازی میں نام کرنا تھا ‖ کام اے دل تمام کرنا تھا

مل کے اُس بیوفا سے پچھتائے ‖ دُور ہی سے سلام کرنا تھا

دو گھڑی بیخودی ہوئی تو کیا ‖ شغلِ شُرب مدام کرنا تھا

کیا فقط تھے کلیم ہی مشتاق ‖ ہم سے بھی کچھ کلام کرنا تھا

موت کے وقت فکرِ عقبےٰ ہے ‖ پہلے ہی اہتمام کرنا تھا

جس طرف دیکھو آپ ہیں موجود ‖ یُوں نہ دیدار عام کرنا تھا

وعدہ اپنا وہ کرتے کیوں پُورا ‖ کام میرا تمام کرنا تھا

شیخ اور جام کی طلب ساقی ‖ جُھک کے اُن کو سلام کرنا تھا

فائدہ کیا غزل سے اے اختر

وصفِ شاہِ نظام کرنا تھا

مُصطفےٰ کمال

از مولانا اظہر امرتسری

اے مُصطفےٰ کمال تری تیغِ آبدار
ترُکی میں تھی محافظِ آئینِ کردگار

تیرا عتاب تھا چمنِ کُفر کی خزاں
تیرا کرم تھا گلشنِ اِسلام کی بہار

آئینۂ جہاد میں تو نے دکھا دیا
اُس زندگی کا حُسن جو ہے شاد و کامگار

دھوتی اگر نہ خونِ شجاعت سے تیری قوم
رہتی جبینِ شرق غلامی سے داغدار

اب ہو رہی ہے شوکتِ افرنگ اس میں دفن
کھودا تھا قیصری کے لئے تو نے جو مزار

ہر انقلابِ دہر نے تھامی تری رکاب
جس دم ہوا تو مرکبِ ایام پر سوار

تیرے چراغِ جوش کے آگے نہ آ سکا
اُٹھا اگرچہ بارہا افرنگ کا شرار

تو نے اُٹھا کے تیغ کہی کیا پتے کی بات
فردوس کی ہے راہ میں میدانِ کارزار

انسانیت کا آئینہ ہوتا کبھی نہ صاف
کرتا اگر نہ دُور غلامی کا تو غبار

آنے کو ہے وہ روز کہ معشوقۂ فرنگ
بخشیگی تیری قوم کا آئینۂ وقار

کر دیگا اُٹھ کے غازیٔ عصمت کا دستِ جوش
پیراہنِ غلامیٔ مشرق کو تار تار

ظاہر میں تو جہاں سے عدم کو چلا گیا
باطن میں تو حیاتِ ابد سے ہے ہمکنار

مرتا نہیں وہ موت سے، جو کامگار ہے
جو نامراد ہے، وہ اجل کا شکار ہے

اتا ترک مرحوم کی آخری تصویر

از جناب پروفیسر حامد حسن صاحب قادری سینٹ جانسن کالج آگرہ

مجلہ ارمغان طہران بابت ماہ فروردین ۱۳۱۷ شمسی جو اسی ماہ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں ایران سے وصول ہوا ہے۔ اس میں ایک فاضل ایرانی آقا سے محیط طباطبائی نے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی خبر وفات سن کر ترجمان حقیقت کے عنوان سے ایک مقالہ تحریر کیا ہے جس میں علامہ مرحوم کے ساتھ اپنی دوستی غائبانہ اور ارادت مندی کا اظہار اور ان کے کمال شاعری کا اعتراف بڑے محبت بھرے الفاظ میں کیا ہے۔ اس مضمون کا ترجمہ پیش کرنے سے قبل ہم ایک اور ایرانی سخنور و نقاد کی رائے اقبال کی ذات و شاعری کے متعلق درج کرتے ہیں۔

علامہ اقبال کی وفات سے ٹھیک دس سال قبل اپریل ۱۹۲۸ء میں حیدرآباد (دکن) کی انجمن علمی و ادبی (جامعہ معارف) کے ایک جلسہ میں داعی الاسلام آقا سید محمد علی پروفیسر نظام کالج نے اقبال کی فارسی شاعری کے متعلق ایک مضمون پڑھا تھا۔ یہ مضمون فارسی زبان میں تھا۔ ہم اس کے بعض حصوں کا خلاصہ اردو میں پیش کرتے ہیں۔

آقا محمد علی فرماتے ہیں کہ اقبال کے فارسی نغموں کی شہرت تمام ایشیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور ان کو "طوطی شکر شکن"، "دربلبل شیراز" کا مرتبہ حاصل ہو گیا ہے۔ اقبال کے کلام پر غالب کے رنگ کا اثر ہے۔ ہندوستان میں نصف صدی قبل غالب فارسی کا بہترین شاعر تسلیم کیا جاتا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ غالب کے بعد ہندوستان کی آنکھیں اقبال نے روشن کی ہیں کسی قدیم نقاد نے استادوں کی جانشینی کا مسئلہ اس شعر پر ختم کیا تھا۔

زخسرو چو نوبت بہ جامی رسید ؛ بہ جامی سخن را تمامی رسید

غالب نے اس پر یہ اضافہ فرمایا:-

زجامی و عرفی بہ طالب رسید ؛ زعرفی و طالب بہ غالب رسید

اب میں اس مضمون پر یہ اضافہ پیش کرتا ہوں:-

چو غالب زہند وستاں رخت بست ؛ بجائے وے اقبال دانا نشست
یقیں داں سخن دانی پارستاں ؛ بماند بہ ہندوستاں جاوداں

اقبال کی قومی و ملکی نظمیں ایران کے شعرائے عصر حاضر عارف قزوینی اور بہار مشہدی کی وطنی نظموں کے مقابلے میں لائی جا سکتی ہیں۔ میری رائے ہے کہ اگر اقبال ایران میں پیدا ہوئے ہوتے اور فارسی میں وطنی نظمیں لکھتے تو ایران کے اساتذہ سخن کی صفوں میں ان کی جگہ ہوتی۔ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ میرے دل پر اقبال کی اردو قومی نظموں کا جس قدر اثر ہوا اتنا ایران کے شعرائے جدید کے کلام کا نہیں ہوا۔

اس کے بعد آقا محمد علی ایرانی نے اقبال کی پہلی فارسی تصنیف "اسرار خودی" پر تبصرہ کیا ہے۔ اس کا موضوع اور ترتیب مضامین کو بیان کیا ہے۔ اسرار خودی کے مختلف مقامات سے نمونے دیئے ہیں۔ مولانائے روم کی مثنوی معنوی کی ایک حکایت کے مقابلے میں اسرار خودی سے حکایت نوجوانے از مرد کہ پیش علی ہجویری آمد پیش کر کے دونوں کا اسلوب بتایا ہے۔ اسرار خودی کے طرز بیان کا لکھتے ہیں۔ کہ اگرچہ آجکل کے ایرانی شعرا اس کو اسلوب ہندی کہتے ہیں۔ لیکن یہ طرز ادا ہندوستان کی خصوصیت نہیں ہے۔ بلکہ عہد

متوسطین میں ایران کے شعرا کا بھی اسلوب شعر یہی تھا۔ پھر متاخرین نے اپنا طرز بدل دیا۔ اور متوسطین کی بلاغت اور اظہار علم و فضل کے شوق کو ترک کر کے صاف و واضح کہنے لگے۔ لیکن اقبال نے اپنی مثنویاں عوام کے لئے نہیں بلکہ خواص کے لئے لکھی ہیں۔ اگرچہ اقبال کا پیغام تمام مسلمانوں کے لئے ہے۔ لیکن اُنھوں نے اپنا مخاطب علما و حکمائے اُمّت کو بنایا ہے یا اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مغربی تہذیب یافتہ طبقے کو۔ چنانچہ ان لوگوں میں اسرارِ خودی نہایت مقبول ہوئی۔ اگر اقبال آسان و سلیس اور عام فہم زبان میں لکھتے عوام اور زاہدانِ خشک ان پر کفر کے فتوے لگا دیتے۔

اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی دونوں کی فارسی زبان کے متعلق آقا محمد علی کی یہ رائے ہے کہ اقبال کی فارسی ایران کی زبان سے کچھ زیادہ متغائر نہیں ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ بعض عربی و فارسی الفاظ اردو میں جن معنوں کے لئے بولے جاتے ہیں اور ایران کی فارسی میں ان کا وہ مفہوم نہیں ہے اقبال نے ان الفاظ کو ہندوستانی رواج کے مطابق استعمال کیا ہے لیکن یہ بات کہیں کہیں اور خاص خاص الفاظ میں ہے۔ باقی زبان وہی ہے جو ایران میں مستعمل ہے۔

آقا محمد علی نے رموزِ بیخودی کے موضوع و مضمون و ترتیب کی بھی تشریح کی ہے، اور اتحادِ اسلام (پان اسلام ازم) پر بڑی بحث کی ہے اور رُموز کے بھی نمونے درج کئے ہیں۔ پھر اقبال کی تیسری کتاب پیامِ مشرق پر اسی طرح تبصرہ کیا ہے۔ اس کی زبان کے متعلق کہتے ہیں۔ کہ اسرار و رموز کے مقابلے میں پیامِ مشرق کی زبان واضح تر و شیریں ترین ہے اور اس کا اسلوب شعر متاخرین شعرائے ایران سے بہت مشابہ ہے۔ پیامِ مشرق کے تمام حصوں (لالۂ طور، مے باقی، نقشِ فرنگ وغیرہ) سے نمونے پیش کئے ہیں۔

آخر میں اقبال کی چوتھی تصنیف "زبورِ عجم" پر نقد و نظر کی ہے۔ اور اس کی زبان کے متعلق لکھا ہے۔ کہ "زبورِ عجم" کی غزلیات، زبان و بیان میں پیامِ مشرق کی غزلوں سے بھی بہتر ہیں اور مولانا روم کی غزلوں کے ہم پلّہ ہیں" اس کے بھی مختصر نمونے درج کئے ہیں۔

اسی فاضلِ ایرانی کے یہ تبصرے اور یہ رائیں اقبال کی فارسی کے لئے بڑی سند ہیں اور ان کی سعی و کاوش، وسعتِ نظر اور ذوقِ سلیم کے لئے شاہد عادل ہیں۔ عصرِ حاضر کے مسلمانانِ ہند کو قدیم فارسی سے بھی (جس میں ان کی تاریخ، تہذیب، مذہب، کلچر سب کچھ بھرا پڑا ہے) برائے نام ربط و تعلق رہ گیا ہے۔ ایران کی جدید فارسی سے اتنا بھی نہیں۔ اس حالت میں اقبال لاہور میں بیٹھ کر فارسی میں شاعری کرتے اور کتابوں پر کتابیں لکھتے ہیں۔ ان کو اپنے نصب العین، موضوعِ تصنیف اور پیغام شاعرانہ کے لئے یا فلسفہ و تصوّف کے مطالعہ کی ضرورت ہے یا سنائیؔ و عطارؔ و رومیؔ کی شاعری سے تعلق ہے۔ ان کو نہ متاخرین ایران قاآنیؔ و نشاطؔ و عندلیبؔ سے کچھ واسطہ، نہ معاصرین عارفؔ و بہارؔ و اشرفؔ سے کچھ بحث۔ لیکن انھوں نے فارسی زبان اپنے پیام کو عالمگیر بنانے کے لئے اور اہلِ زبان کی نظر میں مقبول بنانے کے لئے اختیار کی ہے اس لئے وہ عالم کی رفتار سیاست اور افتادِ ذہنیت کے ساتھ ساتھ ایران کی رفتارِ زبان کا بھی بغور مطالعہ کرتے جاتے ہیں اور مذاقِ صحیح کی رہنمائی سے ایک کے بعد دوسری تصنیف میں نہ صرف موضوع و پیغام کے لحاظ سے ارتقا پیدا کرتے جاتے ہیں۔ بلکہ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اہلِ ایران کے محاورہ و روزمرّہ سے قریب تر لاتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر ایک ایرانی بھی کہہ اٹھتا ہے کہ اب ہندوستانی نہیں بلکہ ایرانی بول رہا ہے۔

اب ہم دوسرے ایرانی شاعر و ادیب، فاضل و نقّاد کے مقالہ کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ اس کا عنوان و آغاز یہ ہے:-

ترجمانِ حقیقت

محمد اقبال شاعر فارسی سرائے ہندوستان

درجہاں نتواں اگر مردانہ زیست ❊ ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست

(اقبال)

اقبالِ سخن سرائے نامی ہند و ایران کی ۶۳ ویں سالگرہ کا جشن ابھی تمام دنیا میں اقبال کے قدر دانِ فضل و ادب کے لئے مسرت و شادمانی کا سلسلہ جنباں ہو رہا تھا۔ کہ ناگہاں ان کی وفات کی خبرِ ناگوار نے شرق و غرب کے دوستوں اور ارادتمندوں کے دلوں کو داغدار و سوگوار بنا دیا میں چند سال سے اقبال کے آثارِ ادبی کا شیدا و فریفتہ تھا۔ اور ہم دونوں کے درمیان دوستی کا رابطہ قائم تھا۔ ایک ماہ پیشتر میں نے اخبارات کے وسیلہ سے اقبال کی شصت سالہ سالگرہ منعقدہ ۹ جنوری ۱۹۳۸ء (۱۷ / بہمن ۱۳۱۶ ہجری شمسی) کا مژدہ سنا تھا۔ اور میں چاہتا تھا۔ کہ اقبال کا ادبی

قرض جو میرے ذمہ ہے اسی کو ان دنوں میں ادا کروں، اور میں ایک زمانے سے جو اُن کے فارسی دیوانوں کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اس کا نتیجہ کسی مختصر کتاب یا مقالہ کی صورت میں اقبال کے قدر شناسانِ ایران کی خدمت میں پیش کر کے ان سے درخواست کروں کہ اس کشورِ ایران میں بھی شعرا و صاحبانِ فضل و ادب کی طرف سے اس شاعرِ شیریں زبان کا شکر و پاس ادا کیا جائے۔ لیکن اس واقعہ غم انگیز نے میرے سلسلہ خیالات کو ایسا توڑا اور اس قدر افسردہ دل اور پریشان خاطر کر دیا کہ پھر قلم کو طاقتِ نگارش اور زبان کو یارائے گذارش ہی نہ رہا اور میں خاموش ہو کر بیٹھ رہا۔

اتفاق سے میرے ایک دوست مجھ سے ملنے آئے۔ ان کو میرے ارادے کا علم تھا۔ باتوں باتوں میں اقبال کا ذکر چھڑ گیا۔ انہوں نے اقبال کے متعلق مقالہ لکھنے کی فرمائش کی اور اس قدر اصرار کیا کہ آخر مجھے راضی ہونا پڑا۔ اب میں اقبال کی روحِ پاک اور فکرِ تابناک سے ہمت چاہتا ہوں اور ایک مختصر مقالہ پیش کر کے اپنی نازیبائی و کوتاہیِ سخن کی معافی چاہتا ہوں۔ بقول لسان الغیب حافظ شیرازی:-

کہ شعرِ تر انگیزد خاطر کہ حزیں باشد ٭ یک حرف ازیں دفتر گفتیم و ہمیں باشد

اصل مقصد کی طرف آنے سے پہلے میں تمام دوستانِ شعر و ادب کی طرف سے خاندان و پس ماندگانِ اقبال کی خدمت میں تعزیت پیش کرتا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ جس طرح اُس کی نظرِ لطف نے غالب و شبلی کی وفات کے بعد ڈاکٹر اقبال جیسا سخنور ہندوستان میں احیائے شعرِ فارسی کے لئے پیدا کر دیا تھا دوبارہ نگاہِ کرم ڈال کر اقبال کے خاندان سے یا اور فضلائے زبانِ فارسی میں سے کسی کو پیدا کر دے جو اسی شعلۂ مقدس کو کہ مسعود سعد سلمان، امیر خسرو، فیضی، غنی اور بیدل کی یادگار ہے روشن رکھے اور اقصائے عالم کو منور کرے۔ خصوصاً اقبال کے فرزندِ دلبند جاوید کے لئے جس کے مستقبل کے لئے اقبال نے "جاوید نامہ" کے خاتمہ میں امیدیں ظاہر کی ہیں۔ اور جس کو اپنے مرتبۂ معنوی کا وارث قرار دیا ہے۔ خدا سے دعا کرتا ہوں کہ جاوید بھی اسی طرح ایران و ہند کے درمیان ارتباطِ ادبی قائم رکھے۔

میں اقبال کی نسبت اپنی ارادت مندی کے اظہار کے لئے یہ چند شعر جو اقبال کے ادبی نام کی طرح ترجمانِ حقیقت ہیں پیش کرتا ہوں:-

اے صبا اے پیکِ دور افتادگاں ٭ اشکِ ما بر خاکِ پاکِ او رساں
اے صبا اے رہ نوردِ تیز گام ٭ بر طوافِ مرقدش زنگ خرام
چونکہ در خوابست پا آہستہ نہ ٭ غنچہ را آہستہ تر بکشا گرہ
خوش نوائے نکتہ سنجِ خاوری ٭ اے کہ می زیبد ترا لفظِ دری
محرمِ راز ہم با ما راز گو [illegible] ٭ [illegible] بانگ [illegible]
اے بہ آغوشِ سحاب ما چو برق ٭ روشن و تابندہ از نورت شرق
سوختیم از گرمیِ آوازِ تو ٭ اے خوش آں قومے کہ داند راز تو
از غمِ تو ملتِ ما آشناست ٭ می شناسیم ایں نوا با از کجاست

اقبال کی ادبی شہرت ۱۸۹۹ء سے شروع ہوئی۔ اس وقت سے ۱۹۰۵ء تک جب انہوں نے یورپ کا سفر کیا اور ۱۹۰۸ء [illegible] تک سے مراجعت کے بعد بھی وہ اردو زبان میں شاعری کرتے رہے۔ یورپ کی سیر، بلادِ اسلامیہ کی حالت کا مطالعہ اور فلسفہ کی تحصیل اقبال کے دل و دماغ پر خاص طور پر اثر انداز ہوئے، اور اسلام و تعلیماتِ اسلام اور ممالکِ اسلامیہ کے ساتھ نہایت دلسوزی و غمخواری پیدا کر دی جو ہنگامِ مرگ تک ہمارے شاعر کی بہترین رفیق و مونس رہی۔ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۴ء تک ممالکِ افغانستان، ترکی، ایران، مصر میں حوادثِ غم انگیز رونما ہوئے۔ ان سب واقعات نے خصوصاً ایران میں ہمسایہ سلطنتوں کی دخل اندازی اور جنگِ بلقان میں دولتِ عثمانی کی شکست نے اقبال کو بے حد متاثر کیا۔ ان کی مشہور نظم "شکوہ" انہی تاثرات کا نتیجہ تھی۔

"شکوہ" کا اثر بانگِ رعد کی طرح تمام ہندوستان میں پھیل گیا اور لوگوں کو مغلوب دولتِ عثمانیہ کی خیر خواہی پر آمادہ کر دیا۔ اتفاق سے یہ اثر جنگِ بین الملل کے اثر سے متصادم ہو گیا اور حکومتِ ہند کو اقبال کے غیر معمولی نفوذ و اثر کی طرف متوجہ کر دیا۔ اور خاتمہ جنگ تک حکومت نے اقبال پر نظر رکھی۔

جنگِ عالمگیر کے دوران میں افواجِ عثمانی کی یورپ و ایشیا

ؔ دیوان اصل میں نظموں کے مجموعہ کو کہتے ہیں خواہ کسی قسم کی ہوں۔ یہی مفہوم مقالہ نگار ایرانی کا مقصود ہے۔ ہم آجکل ہندوستان میں صرف غزلوں کے مجموعہ کو دیوان کہتے ہیں۔ حالانکہ اب سے پہلے یہاں بھی یہ لفظ عام تھا۔ چنانچہ سودا کے مرثیوں کے مجموعہ کو دیوان مرثیہ کہتے تھے۔

(قادری)

میں نقل و حرکت کو پر اُمید نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ جس وقت سیاہ برطانیہ نے بین النہرین کو ترکوں سے لے لیا تو اقبال کی امیدیں پامال ہو گئیں اور اُن کے ذہن و فکر میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا۔ اب وہ غیر پر اعتماد و توسّل کے قائل نہ رہے۔ اور اپنا جدید فلسفہ شائع کرنا شروع کر دیا جس کی اساس خود پروری ہے اور جس کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے نسل کی خاص طور پر تربیت کی جائے۔ اقبال نے اپنے زمانے کے تصوف کو سُست عرفاں پایا۔ اس لئے اسی میں جان ڈالنے کے لئے تصوف کا وہ نظریۂ عمل پیش کیا جو خاندانِ صفوی کے زمانے میں اختیار کیا گیا تھا یعنی "اعتماد نفس"۔ اس کے بعد اقبال نے فارسی و اُردو میں جو نظمیں لکھیں اور یورپ و ایشیا وغیرہ میں جو تقریریں انگریزی زبان میں کیں وہ سب حقیقت میں اسی فکر اساسی کی تفسیر تھیں۔

اقبال لندن سے مراجعت کے بعد اتحادِ اسلام" (پان اسلام ازم) کی فکر میں تھے جو سید جمال الدین افغانی، مرزا آقا خان کرمانی، شیخ محمد عبدہ، اور سلیم حلیم پاشا کی یادگار تھی۔ لیکن جنگ بین الملل نے اقبال کے اس اعتقاد کی بنیادیں ہلا دیں۔ اور ایک فکر جدید وجود میں آ گئی۔ اب اقبال کو یقین ہو گیا کہ ان ممالک دُور افتادہ میں ایک وحدت سیاسی کا پیدا کرنا ممکن نہیں ہے۔ بلکہ ان کشور ہائے اسلامیہ میں سے ہر ایک کو الگ الگ اپنی اپنی ذات و قوت پر اعتماد کر کے اپنے لئے استقلال و عظمت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ابھی آتش جنگ فرو نہ ہوئی تھی۔ بلکہ اس کی سرنوشت بھی معلوم نہ تھی کہ اقبال کی مثنوی "اسرار خودی" (۱۹۱۶ء میں) شائع ہوئی۔ اس مثنوی نے مسلمانان ہند میں ایک شورش برپا کر دی اور وہ اقبال کی مخالفت پر کھڑے ہو گئے۔ اس لئے کہ اس مثنوی میں اقبال نے عرفانِ سُست اور تصوف منجمد پر اعتراض کیا تھا۔ اور اس طرح کے شعرائے تصوف نگار پر نکتہ چینی کی تھی۔ آخر اقبال نے مجبور ہو کر وہ ناپسندیدہ اشعار حذف کر دیئے۔ چنانچہ مثنوی کے جدید ایڈیشن میں جو اقبال نے اپنے دستخط سے خود مجھے بھیجا تھا۔ ان اشعار کا کوئی اثر نہ تھا۔ تاہم اقبال اپنے میدان فکر پر قائم رہے اور ۱۹۱۸ء میں دوسری مثنوی "رموزِ بیخودی" شائع کی۔ جو نام پر پہلی کتاب کی ضد نظر آتی ہے۔ لیکن حقیقت میں ان کے اسی نظریہ کی مفسّر ہے

عالمگیر جنگ کی آگ بجھ گئی، اور لوگ ہر جگہ منتظر تھے کہ زیردست و ضعیف قوموں کا انجام کیا ہوتا ہے۔ ہندوستان میں بھی دولت برطانیہ کے ایفائے وعدہ کا انتظار تھا۔ اقبال بھی نتیجہ کے لئے چشم براہ تھے۔ لیکن ۱۹۱۹ء کے آتے ہی معلوم ہو گیا کہ ان ممالک کے لئے کوئی اُمید باقی نہیں ہے۔ تو پھر از سرِ نو اقبال کی بلبل طبع نغمہ سرا ہوئی، اور اس مرتبہ دنیائے جدید کی ہر چیز کو مورد انتقاد بنا ڈالا۔

اسی زمانے میں ایک انگریز عارف مشرب خاور شناس (مستشرق) نکلسن نے اسرار خودی کا فصیح ترجمہ مع مقدمۂ انتقادی انگریزی زبان میں شائع کر کے اقبال کو یورپ و امریکہ کی مجالس ادبی میں روشناس کرایا۔ ناقدین مغربی نے ادبی مجلّوں اور روزناموں میں اس پر تبصرہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقبال بھی اپنے ہموطن ٹیگور کی طرح دنیا کے ممتاز شاعر تسلیم کر لئے گئے۔ ۱۹۲۲ء میں انتظار ہو رہا تھا کہ نوبل پرائز" اقبال کو دیا جائیگا۔ حکومت ہند نے اسی سال اقبال کا مرتبۂ فضل و ادب مان کر ان کو "سر" کا خطاب دیا۔ لیکن اقبال آزاد منش تھے اور شہرت طلبی سے دُور۔ اس لئے انہوں نے نہ نوبل پرائز حاصل کرنے کے لئے کوشش کی نہ "سر" کے خطاب سے کوئی دلبستگی ظاہر کی۔ بلکہ وہ ہمیشہ یہی چاہتے تھے کہ ان کا نام بغیر سرکاری خطاب کے لیا جائے چنانچہ ہند و افغان و ایران کے لوگ ان کو "علامہ اقبال" یا "شیخ اقبال" یا "ڈاکٹر اقبال" کہتے تھے۔

۱۹۲۲ء میں اقبال کی شاعری کا نفوذ و اثر ہندوستان میں اتنا وسیع ہو گیا، اور اُن کے دوستداروں اور ارادتمند اس قدر کثرت سے پیدا ہو گئے کہ ہندوستان کے پیشوایانِ سیاسی مثلاً مولوی محمد علی وغیرہ نے اقبال کو بھی سیاست میں شریک کرنا چاہا۔ لیکن وہ اپنی آزاد منشی کے سبب سے دست کش رہے۔ تاہم ان کے دوست باوجود ان کے انکار کے ہر کام میں اُن سے مشورہ کرتے تھے۔ ۱۹۲۳ء میں اقبال نے محمد علی کے ہندو لیڈروں کے ساتھ تعاون عمل کی مخالفت کی۔ اقبال کی یہ رائے تھی کہ برادرانِ وطن کے ساتھ مسلمانوں کی ہمکاری بے شرط و قید مصلحت کے خلاف ہے لیکن محمد علی نے ان کی رائے نہ مانی اور گاندھی کے معاون و ہم کار بنے رہے۔ آخر ۱۹۳۱ء میں جب محمد علی گول میز کانفرنس کے لئے لندن جانے لگے تو اُن کو تلخ تجربہ سے مجبور ہو کر اپنے دیرینہ

دوست اقبال سے اپنی غلطی کا اعتراف کرنا پڑا۔

۱۹۲۲ء میں نادر خان سپہ سالار (مرحوم نادر شاہ امیر کابل) کی کوشش مردانہ سے امان اللہ خان کی سلطنت کو استقلال کامل حاصل ہوا تو اس بات سے اقبال کو اس قدر خوشی ہوئی کہ انہوں نے ۱۹۲۳ء میں اپنا جدید دیوان "پیام مشرق" امان اللہ خان کے نام سے معنون کر کے شائع کیا اس دیوان نے اقبال کو فارسی زبان کا "شاعر کامل" ثابت کر دیا۔

رفتہ رفتہ اقبال کی شہرت تمام کشور ہائے اسلامی پر چھا گئی چنانچہ ۱۹۳۱ء میں ان کو فلسطین میں انجمن اسلامی کی شرکت کے لئے دعوت دی گئی اسی زمانے میں وہ گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے لندن گئے۔ وہاں سے واپسی میں بیت المقدس گئے اور نمائندگان اسلامی کے دوش بدوش صف اوّل میں ان کو جگہ دی گئی۔ اس لئے کہ وہ شہرت ملی و سیاسی کے ساتھ اہمیت ادبی و دینی بھی رکھتے تھے! اور اس فضیلت نے ان کو تمام ارکان مجلس سے ممتاز کر دیا تھا۔

اس کے بعد اقبال کو کسالت مزاج اور گرفتگی آواز کے آثار شروع ہو گئے لیکن ابھی شدت نہ ہوئی تھی کہ مرحوم نادر شاہ کی طرف سے اصلاحات تعلیمی کے مشورہ کے لئے اقبال کو افغانستان بلایا گیا۔ اور فوق العادہ احترام کے ساتھ کابل میں اُن کی پذیرائی کی گئی۔ کابل سے اقبال نے آثار تاریخی کے مشاہدہ کے لئے خصوصاً حکیم سنائی اور سلطان محمود غزنوی کے مزارات کی زیارت کے لئے غزنی و قندھار کا سفر کیا۔ "ارمغان سفر افغانستان" کے طور پر اقبال نے ایک مختصر تصنیف "مسافر" لکھی جو ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی۔ اقبال کے اس سفر کے زمانے میں مجھے اُمید تھی کہ میں بھی کابل پہنچ کر اقبال سے ملاقات کروں گا۔ لیکن کچھ ایسے ناگوار واقعات پیش آ گئے کہ اس سعادت سے محروم رہ گیا۔

اسی سال "انجمن آثار ملی ایران" کی طرف سے اقبال کو جشن ہزارہ فردوسیؔ میں ایران آنے کی دعوت دی گئی۔ لیکن ان کی کسل مندی مزاج اس امر سے مانع رہی کہ کم سے کم ایک بار ان کے قدم اس سرزمین پر آ جاتے جس کی ادبیات کی خدمت کے لئے انہوں نے اپنی زندگی کا بہترین دور وقف کر دیا تھا۔ اس مانع سفر سے ان کے ایرانی دوست بہت متاثر ہوئے لیکن ان لوگوں کو بڑی مسرت ہوتی تھی جب ادیب فاضل آقائے سرور خان گویا (جو جشن فردوسی میں افغانستان کے نمائندہ تھے) اکثر مجالس میں اقبال کے دوستوں سے ان کے وہ اوصاف حمیدہ و فضائل بیان کرتے تھے۔ جو آقا سرور خان نے کابل میں دیکھے تھے۔ اسی سال موسم سرما میں اقبال نے میرا لکھا ہوا رسالہ "عقیدۂ دینی فردوسی" اردو میں ترجمہ کیا۔ اور جیسا کہ آقائے سرور خان گویا کے خط سے مجھے اطلاع ملی اقبال نے اپنے مقدمہ کے ساتھ اس رسالہ کو لاہور میں شائع کیا۔ لیکن افسوس کہ مجھے اس کی کوئی کاپی دستیاب نہ ہوئی کہ میں اس کے دیباچہ کے متعلق اس مقالہ میں ذکر سکتا۔

مارچ ۱۹۳۶ء میں اہل بنگال نے ہندوؤں کے مصلح فیلسوف "سری رام کرشنا" کا صد سالہ جشن ولادت کلکتہ میں منعقد کیا۔ اور اسی کے سلسلہ میں مذاہب عالم کی کانفرنس بھی مقرر کی گئی جس کی شرکت کے لئے تمام ممالک عالم سے لوگوں کو بلایا گیا مجھے بھی ہندوستان آنے کی دعوت دی گئی تھی اور میں اسی امید سے خوش تھا کہ اس مرتبہ اس سخنور بزرگ (اقبال) کے دیدار سے مشرف ہونے کا موقع ملے گا۔ لیکن بدقسمتی سے رقعۂ دعوت اتنی دیر میں میرے پاس پہنچا کہ کانفرنس شروع ہو چکی تھی۔ اور افسوس کہ ہمارے شاعر بھی کسالت مزاج کے سبب سے شرکت کانفرنس سے معذور رہے۔

۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو تمام ہندوستان میں اقبال کا جشن شصت سالہ نہایت افتخار و شادمانی کے ساتھ منایا گیا حیدرآباد میں سب سے بڑا جلسہ ہوا (اعلیٰحضرت اعظم جاہ ولی عہد دکن خود اس جشن کے سرپرست تھے)۔ ابھی اس جشن کی یاد شیریں کا اثر دلوں میں باقی تھا کہ ناگاہ اقبال کی خبر وفات نے ان کے ہوا خواہان دور و نزدیک کے دلوں کو داغدار و مصیبت زدہ بنا دیا۔

نوٹ:- خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ دینا نہایت ضروری ہے۔ "منیجر"

سہ دیکھئے پیام مشرق کے لئے بھی رائے آقا محمد علی داعی الاسلام نے ظاہر کی ہے (ناد ری)

سہ معلوم نہیں یہ واقعہ کہاں تک درست ہے۔ اہل لاہور اس پر روشنی ڈالیں۔ (قادری)

بالکل سچا واقعہ

از حضرت عزیزؔ مسعودی گورکھپوری

کیف پرور رات تھی بھیگی ہوئی برسات کی!
دل میں لہریں اُٹھ رہی تھیں خوشنما جذبات کی
جا رہا تھا لکھنؤ "پریاگ" سے ہوتا ہوا
اس طرح کہ جاگتا کچھ اور کچھ سوتا ہوا
صبح کو کاشی کے اسٹیشن پہ اک "حورِ جواں"
جس کے ہر انداز میں خاموش تھیں سو بجلیاں
نیند کی کچی "شراب" آنکھوں کے پیالوں میں لئے
نیم خوابی "کا فسانہ" بکھرے بالوں میں لئے
"شوخ ہرنی" کی طرح وہ سامنے کی بیدٹ پر
آکے بیٹھی ڈالتی چاروں طرف چنچل نظر
پہلے گھبرائی ہوئی سانسوں کی "لے" کو ناز سے
کرکے قابو میں یہ پوچھا دلنشیں آواز سے

"مہرباں"! یہ پوچھ سکتی ہوں کہاں جائینگے آپ؟
کب "الہ آباد" پہنچوں گی یہ بتلائیں گے آپ!

اللہ، اللہ کیف زا تھا کتنا اندازِ بیاں
دُور بجتی ہوں کہیں "چاندی" کی جیسے گھنٹیاں
میں نے قصداً گفتگو کو طُول دینے کے لئے
اُس کے اندازِ بیاں کا لُطف لینے کے لئے
ہنس کے پوچھا آپ کا گھر کیا "الہ آباد" ہے؛
میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے کچھ کچھ یاد ہے
"مالوی کالج" بنارس یا "الہ آباد" میں
"لکھنؤ" کے "اگزبیشن" یا "امین آباد" میں
آپ کے ساتھ ایک لڑکی اور تھی مستِ شباب
جس کے ماتھے پر تھا اِک چھوٹا سا رنگیں "آفتاب"

نرم و نازک انگلیوں کو پیچ دے کر ناز سے
لے کے اِک چھوٹی جمائی دلفریب انداز سے

مُسکرا کے اس طرح اُس نے دیا مجھکو جواب!
صبح کو ہنستا ہے جیسے شوخ کلیوں کا شباب
"پڑھتی ہوں" کاشی "۔ "الہ آباد" ہے میرا مکاں"
لکھنؤ میں ہے بڑے بھائی کی کپڑے کی دُکاں
"لکھنؤ میں آپ کو میں نے بھی دیکھا ہے کہیں"
یا "حسین آباد" میں یا "شیعہ کالج" کے قریں

میری اُس کی گفتگو پہنچی ابھی تک تھی یہیں
چلتے چلتے رُک گئی گاڑی کی نبضِ آتشیں

---

۱ الہ آباد، ۲ بنارس، ۳ ہندو یونیورسٹی بنارس، ۴ لکھنؤ کا مشہور پارک و بازار، ۵ لکھنؤ کا ایک مشہور محلہ، ۶ لکھنؤ کا ایک مشہور کالج

شکار یا شکاری

ایک بہترین جذباتی و نفسیاتی افسانہ

از پروفیسر سید علی عباس صاحب حسینی ایم۔ اے

ہم تینوں آدمی گاؤں سے باہر جانے کے قصد سے اپنے اپنے گھروں سے نکلے تھے۔ جاڑوں کا زمانہ تھا۔ پاس والی جھیل میں چڑیاں بڑی کثرت سے گرتی تھیں۔ خیال تھا کہ دو گھنٹہ کے شکار میں بیس پچیس سرخاب اور دوسری چڑیاں اگر ہاتھ آگئیں تو صبح کی سیر و تفریح کے ساتھ شام کے کبابوں کا مفت انتظام ہو جائیگا۔

وقت بھی وہ تھا جب دیہی دیویاں پیتل کے لوٹے دست سیمیں میں ایک خاص انداز سے شرماتی جھجکتی، گھونگھٹ نکالتی۔ بدن چراتی جنگلوں سے پلٹتی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی ململجی ساری، ان کے خمار آلود چہرے۔ اور کسی جانے پہچانے مرد کو دیکھکر آپس کا معصومانہ ٹھٹول اور پر ترنم قہقہہ لیا ہی بھلا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ شبنم سے بھیگے اور ہلکے سے کہرے سے ڈھکے ہوئے درختوں پر رہنے والی چڑیوں کا اپنے اپنے گھونسلوں کے قریب چہچہانا اس سہانی فضا میں کبھی کسی کسان کے گھر سے بیلوں کو کھول کر کھیتوں کی طرف لے چلنے کے لئے "للکارے" کی آواز آ رہی تھی تو کبھی کسی اہیر کے کھونٹے سے بندھے ہوئے بچھڑے کے بولنے کی —— اور ہم لوگ بندوقیں کندھوں پر رکھے کارتوسوں کی پیٹیاں گلے میں لٹکائے ہنستے۔ فقرے کستے چلے جا رہے تھے۔

زمین نم تھی۔ سبزہ بھیگا ہوا تھا ہوا ٹھنڈی تھی اور سامنے سیاہی مائل دھندلے دھندلے کھیت تھے۔ معلوم ہوتا تھا۔ ہم خود نہیں جا رہے ہیں بلکہ فضا کی موسیقیت ہمیں اپنے نہ بہکنے والے دھارے میں بہلائے لئے جا رہی ہے۔ نہ تھکان تھی نہ کسل۔ اور نہ پیدل چلنے میں کسی قسم کی کوئی اذیت۔ گویا ہم اپنے پیروں اور ٹانگوں کے سہارے نہیں چل رہے تھے (بلکہ جوانی۔ بیفکری اور سرشاری کے دوش پر سوار تھے۔)

ہم نے گاؤں کے باہر کے کھیتوں کو طے کرکے کچھمی پور کا رخ کیا۔ اب کھیتوں کی حالت بدل گئی۔ گاؤں سے متصل مزروعہ حصہ سطح تھا۔ یہ کھیت "دھنکر" تھے۔ یہ برسات میں پانی سے بھر جایا کرتے تھے ان میں دھان ہوتا تھا اس لئے ان کی زمین ناہموار تھی سطح کھیتوں میں ہمارے پاؤں برابر پڑتے تھے گر ہم اسی طرح چلنے لگے تھے جس طرح بدمست، شرابی چلتے ہیں۔ مگر فضا نے اس ناہموار حرکت کو اسی قدر خوشگوار بنا دیا تھا جس قدر کہ جھولے کے ہچکولے ہوتے ہیں۔ ہم بڑھے چلے جا رہے تھے خوش ہوتے چلے جا رہے تھے۔

آفتاب کے اچھالے ہوئے گلال نے مشرقی افق کے دامن کو رنگ دیا سبز اور کاہی چیزوں پر بھی ہلکی سرخی دوڑ گئی۔ کہرے میں نقرئی چمک پیدا ہوئی اور راستہ ذرا صاف دکھائی دینے لگا۔ ہم نے قدم تیز کئے —— اور تیز کئے خیال تھا ہم شکاریوں کے پہنچنے سے پہلے چڑیاں آکر پلٹ نہ جائیں۔

کچھمی پور نصف میل پر تھا۔ جھیل ایک فرلانگ سے کم پر تھی آبی چڑیوں کا شور سنائی دینے لگا تھا۔ کہ اُپلوں کے ٹوکرے سروں پر رکھے دو عورتیں آتی دکھائی دیں ایک جوان اور ایک بوڑھی۔ جوان عورت کے چہرے کی ہڈیاں اُبھری ہوئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے تھے اور پیٹ نکلا ہوا تھا۔

بوڑھی عورت میانے قد کی دبلی پتلی تھی۔ چہرے کو جھریوں نے

سوکھے ہوئے آم کی قطع کا بنا دیا تھا۔ مگر چال میں بلا کی سرعت تھی کہ وہ بار بار جوان عورت کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جاتی اور اسے بار بار رک کر ساتھ والی کو ہمت دلانا اور پکارنا پڑتا تھا۔

ہونے والی ماں آہستہ آہستہ تھوڑی دور چلتی لڑکھڑاتی، تھمتی، اوراُپلوں سے بھرا ہوا ارہر کا بڑا ٹوکرا ایک ہاتھ سے سنبھالتی۔ دوسرے سے پیٹ پکڑتی، پھر دو چار قدم چلتی۔ پھر رک جاتی تھی۔ جب بوڑھی عورت اسے پکارتی تو وہ ذرا سا جھجک کر آگے بڑھتی اور اس کے برابر آجاتی تھی دس بارہ قدم دونوں برابر چلتیں۔ پھر سن آگے اور کمسن پیچھے ہو جاتی۔ گویا کہ یہ روزانہ کا منجا ہوا راستہ نہ تھا۔ بلکہ دنیاوی زندگی کی کاواک راہ تھی جس میں بڑے چھوٹوں کو اور بوڑھے جوانوں کو راستہ دکھاتے ہمت دلاتے چلتے ہیں۔

ہم اس سماں کو دیکھتے جاتے تھے اور ان سے قریب ہوتے جاتے تھے۔ ہماری آپس کی باتیں خاموشی سے بدل گئی تھیں۔ ہماری ہنسی بالکل مفقود ہو گئی تھی۔ ہمارے قدم آہستہ پڑ رہے تھے اور ہم میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر کچھ سوچنے لگا تھا۔

ہمارے برابر آتے ہی جوان اہیرن نے سر سے کھسکی ہوئی ساری کا آنچل کھینچکر گھونگھٹ نکالنے کی کوشش کی اور آہ کرکے بیٹھتے بیٹھتے گر پڑی۔ جھوا ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اُپلے بکھر گئے۔ ہم ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے اپنی بندوق احمد کو دیدی اور جلدی جلدی اُپلے سمیٹ کر جھوے میں رکھنا شروع کر دیئے۔

ہونے والی ماں کی پیشانی پر پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے چھلک رہے تھے۔ وہ خوفزدہ اور گھبرائی ہوئی نظروں سے پٹتی ہوئی بوڑھی عورت کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اُس نے پاس آکر پوچھا۔ "کا ہے رے؟"

جوان عورت رک رک کر بولی۔ "اب —— نا —— چلا جات ہے"۔

دوسری اہیرن اس کی بغل میں بیٹھکر اپنے دونوں ہاتھوں سے جھوا سر سے اتارنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے لپک کر سہارا دیدیا ٹوکرا اتار کر علیحدہ رکھدیا گیا۔

جوان عورت نے کراہ کر ٹانگیں پھیلا دیں۔ پھر سمیٹ لیں بوڑھی اہیرن نے گھبرا کر ہماری طرف دیکھا۔ ہم بڑے بڑے دیدے نکالے گھور گھور کر اس سماں کو دیکھ رہے تھے۔

وہ جھڑکنے والے لہجہ میں بولی۔ "ایہاں سے ہٹ جاؤ"۔

ہم لوگ شرمندہ و خجل آگے بڑھے ابھی دو ہی چار قدم گئے ہونگے کہ کراہتی ہوئی عورت نے کہا۔

"گھبر —— گھبر ——"

میں نے پلٹ کر پوچھا۔ "کہاں، چھیدی پور میں؟"

بوڑھی عورت بولی۔ "ہاں! سکھوا اہیر کے ایہاں"۔

میں نے احمد سے اپنی بندوق لے لی۔ ان سے اور اشہر سے کہا کہ چھیدی پور میں سکھو کو بلا لائیں۔ ان دونوں نے میری صورت دیکھی سرمایہ داری کی گود میں پلے ہوئے زمینداروں کے لڑکے شکار کھیلنے نکلے تھے نہ کہ رعایا پرجا کی زچگی میں ہاتھ بٹانے۔

میں نے کہا۔ "جاؤ بھی۔ خدمت ہی میں عزت ہے!"

وہ مسکرائے مگر خاموش چھیدی پور کی طرف لمبے لمبے قدم رکھتے ہوئے روانہ ہو گئے۔ میں اہیرنوں کی طرف پشت کرکے دور کے ایک کھیت کی مینڈ پر بیٹھ گیا۔

سورج کی پہلی کرن نے اوس کے ہر قطرے کو موتی کی طرح چمکا دیا ایک چڑیا پاس والے درخت پر کھیت سے اُڑ کر گھونسلے میں آئی اور اپنے بچوں کو دانہ بھرانے لگی۔ لچھمی پور کے مندر کے گھنٹوں کے بجنے کی آواز ہلکی ہلکی سنائی دی۔ جوان اہیرن زور سے چیخی۔ "کہاں —— کہاں کہاں" کی خوش آئند صدا پیدا ہوئی اور بوڑھی عورت نے جھپٹ کر ایک بچہ کو گود میں اُٹھالیا۔

اس نے مجھے پکارا۔ "بھیا جاکو —— !"

میں نے تھوڑی دور آگے بڑھ کر اپنا شکاری چاقو اسکی طرف پھینکدیا ——،

چند منٹ بعد پھر اُس نے کہا۔ "بھیا، یہاں آؤ ——"

میں رکتا جھجکتا اُدھر بڑھا۔ ماں نے دونوں ہاتھوں سے مُنہ چھپا لیا۔ بوڑھی عورت بچہ کا مُنہ اپنے آنچل سے پونچھتی چند قدم آگے

آئی تو اُسے بیوی طرف مڑ کر بولی۔

"اِہ کا جیل ہاں نہلا دُو —!"

میں نے بندوق زمین پر رکھ دی اور بچہ کو ہاتھوں میں لے لیا۔

— ماں نے لالی بے چہرے ہاتھ ہلا کر کہا۔ "نا ہیں نا ہیں"

میں ٹھٹکا تو دلیر بھڑک کر بولی۔

"اچھا تکیے دو۔ تم اسکا دھولا دو"

مجھے بڑی گھن معلوم ہوتی تھی۔ جی چاہتا تھا اس چیختے ہوئے مضغۂ گوشت کو وہیں زمین پر پھینک دوں۔ مگر خیال آیا امانت ہے اس پر جبر کیا اور اُسے شیشہ کے برتنوں کی طرح سنبھالتا ہوا چل کھڑا ہوا۔ جھیل تک کا ندی پہنچا۔ وہاں آبی چڑیوں کا میلا لگا تھا۔ کچھ اُڑ رہی تھیں کچھ پانی پیر رہی تھیں۔ کچھ ڈبکیاں لگا رہی تھیں اور کچھ آپس میں لڑ رہی تھیں۔ میں نے حسرت سے ان پر نظر ڈالی۔ پھر اپنے ہاتھوں پر۔ بندوق کی جگہ بچہ تھا۔ زندگیاں ختم کرنے والے آلے کی جگہ زندگیاں قائم رکھنے کی ایک نئی مشین۔

میں نے بچہ کو دھویا۔ وہ برابر چیختا رہا مگر جب میں نے اس کا جسم اپنے ریشمی رومال سے پونچھ ڈالا تو وہ خاموش ہو گیا۔ اور اس نے اپنی جلد جلد جھپکتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ اس بے بسی کے دیکھنے نے نہ جانے میرے دل میں کیا کیفیت پیدا کر دی کہ میں نے جھک کر اس اہیر کے لونڈے کی پیشانی چوم لی۔

میں نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ میری اس وقتی کمزوری کا دیکھنے والا کوئی انسان نہ تھا۔ چڑیاں ہی چڑیاں تھیں۔ پر کھجاتی ہوئی شور مچاتی ہوئی لڑتی ہوئی اور مچھلیاں پکڑتی ہوئی۔

میں تیز قدم رکھتا ہوا بچہ کو سینے سے لگائے پلٹا۔ زچہ تڑپ اور کراہ رہی تھی بوڑھی اہیرن اس سے کہہ رہی تھی۔ "ارے ذرا صبر کر اولاد ہے" مجھے دیکھتے ہی اُس نے بچے کو لینے کیلئے ہاتھ بڑھا دیئے۔ ماں بھی مسکرا دی، جس طرح آئینہ آفتاب کے سامنے رکھ دینے سے چمک اٹھتا ہے میں یاسنا کی اس ضو فشانی کی تاب نہ لا سکا۔ میں نے امانت جلد جلد سے واپس کر دی اور اپنی بندوق اٹھا کر جھیلی مینڈھ کی طرف پلٹ آیا۔

چھیدی پور کی طرف سے لوگوں کے پکارنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اور کچھ لوگ دوڑتے ہوئے آتے دکھائی دیئے۔ تھوڑی دیر میں چار اہیر ایک ڈولی لئے ہوئے آپہنچے اور ان کے پیچھے پیچھے احمد و اشہر۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا۔ "سکھو کون ہے؟" ایک جوان ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ زرد تھا۔ پیشانی پسینے سے تر تھی اور آنکھوں سے خوف ظاہر ہو رہا تھا۔

میں نے مسکرا کر کہا۔ "بیٹا مبارک!"

دفعتہً اس کے چہرے پر بالکل اسی طرح سرخی دوڑ گئی جس طرح ابھی کچھ دیر قبل اوس سے بھیگے ہوئے سبزہ پر آفتاب کی سنہری کرنیں دوڑی تھیں اس نے جھرجھری سی لی۔ پھر وہ میرے قدم چھونے کیلئے جھک گیا میں نے روکتے ہوئے کہا۔

"ارے یہ کیا کرتا ہے! جا ادھر جا، اپنے بچے اور بیوی کو دیکھ!"

وہ مسکراتا ہوا ادھر بڑھا جدھر اس کی شریک زندگی کو دوسرے اہیر بوڑھی اہیرن کی مدد سے ڈولی میں لٹا چکے تھے۔ سکھو نے لپک کر بچے کو گود میں لے لیا دو اہیروں نے ڈولی اٹھائی۔ بوڑھی اہیرن نے اپنا اپلوں کا ٹوکرا سنبھالا اور چوتھے اہیر نے زچہ کا جھوا سر پر رکھ لیا۔

جب یہ قافلہ ہمارے برابر پہنچا تو میں نے احمد اور اشہر کی جانب دیکھا اور انھوں نے میری طرف۔ ہم نے اپنی بندوقوں میں کارتوس بھرے اور ایک بار تینوں آدمیوں نے ہوائی فیر کر دیئے۔

زچہ ڈولی میں لیٹی دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے تھی۔ اس نے اس فیر پر منہ سے ہاتھ ہٹا لئے۔ ہماری طرف مسکرا کر دیکھا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔ ہم بندوقیں سیدھی کر کے اسی طرح کھڑے ہو گئے جس طرح بڑے افسروں کو معمولی سپاہی سلامی دیتے ہیں۔

احمد سے خاموش نہ رہا گیا مسکرا کر بولا "ارے ہمیں بھول نہ جانا جب اس لونڈے کا کوئی کام کرنا تو ہمیں بھی بلانا۔ اب ہم بھی اس کے آدھے باپ ہیں"

سکھو مسکرا دیا۔ بوڑھی عورت زچہ کی طرف سے بولی "جر درجر در"

جب یہ قافلہ آگے بڑھ گیا تو ہم نے پھر ایک دوسرے کو دیکھا جھیل کی جانب نظر کی اور تینوں آدمیوں نے ایک ساتھ اپنی اپنی گردن ہلائی میں نے کہا۔ "بس آج کا شکار ہو چکا"

احمد بولا۔ "اور کیسا تنکار! انسانی زندگی کا تنکار"
میں نے کہا۔ "نہ جانے تنکا ہے یا تنکاری"۔ احمد نے رجائی آواز میں کہا۔ "چاہا یا تمر لگا ہے۔ کوئی مذاق ہے۔ اللہ نے چاہا تو معمولی تنکاری نہ ہوگا۔ یزداں گیر"
میں نے مایوسانہ لہجہ میں کہا۔ "ہاں یزداں گیری ہی کی سامان تو ہیں۔ اُپلوں کا جھوا۔ دھنکر میں پیدائش اور جھیل میں غسل"
احمد بحث کرنے کے انداز میں بولا۔ "اس سے کیا ہوتا ہے — روح اللہ بھی تو اصطبل میں پیدا ہوئے تھے"
اشہر ابھی تک خاموش تھا جھڑک کر بولا! "میاں احمد تمہاری اور مجید کی یہی باتیں تو مجھے ناپسند ہیں۔ ایک معمولی اہیرن نے ایک کالا سا لونڈا دھنکر میں اُپلے ڈھوتے ہوئے جنا اور تم دونوں اس میں طرح طرح کے معنی پہنانے لگے۔ روح اللہ خلیل اللہ اور خدا جانے کن کن بزرگوں سے تشابیں دیکر ایک تکلیف دہ واقعہ کو خوش آئند صورت میں پیش کرنا تم دونوں کا خاص حصہ ہے"۔
احمد نے کہا۔ "اجی آخر اسے تکلیف دہ سمجھے ہی کیوں۔؟"
اشہر نے اسی تیور سے کہا۔ "اس لئے کہ تم میں اپنی غربت کے احساس کا مادہ بھی نہیں رہ گیا جو اس طرح کے واقعات کا سبب ہے یقین نہیں سجھائی دیتا کہ ہندوستان کی غربت اب اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اس طرح کی حالت میں بھی عورتیں جفاکشی کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ سکھو سے پوچھا اسے ایسی حالت میں کیوں جانے دیا۔ وہ سر جھکا کر بولا۔ کا کریں بھیا! گھر واں کوئی پیسا نا رہا اور کہیں بالاوہ اپلا بیچ لائیں دو چار آنہ مل جائی تو سیوریاں کام آئی"۔ میرا اور احمد کا سر جھک گیا۔
دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ زمین سوکھی جا رہی تھی۔ درخت اور سبزے سے شادابی غایب ہو رہی تھی۔ اور گاؤں کے قریب مطلع پر غبار سا چھایا ہوا تھا۔

دل کی آنکھ

مترجمہ جناب افسر ماہ پوری

بیشک رات ہزاروں آنکھیں
رکھتی ہے اور
دن صرف ایک آنکھ کا مالک ہے۔
تاہم جب شاہ خاور
غروب ہو جاتا ہے تو دنیا بھیانک تیرگی میں
ملفوف ہو جاتی ہے۔
بیشک دماغ ہزاروں آنکھوں سے
مزین ہے اور
دل صرف ایک آنکھ رکھتا ہے۔
تاہم اگر دل کی آنکھ
تجلی محبت سے عاری ہو جاتی ہے تو
زندگی کی تمام درخشانیاں
تاریکی کے ہولناک قعر میں گر جاتی ہیں۔

(ایف۔ ڈبلیو۔ بارڈین)

سوکھی پتیاں

مترجمہ افسر ماہ پوری

فی الحقیقت سوکھی پتیوں میں
نغمہ کی ایک خفیف لہر بھی موجود نہیں ہے۔
پھر بھی حتی الوسع
وہ گانے کی جدوجہد کرتی ہیں
جب میں ان کے قریب سے گذرتا ہوں
میرے دل کے شکستہ ساز میں بھی
نغمہ کی ایک ہلکی موج مرتعش ہو جاتی ہے
اور ایک غمناک کیفیت
میری رگ رگ میں حلول کر جاتی ہے
اگرچہ یہ سوکھی ہوئی پتیوں کی آواز ہے
مگر میرا دل اسے
نغمہ کی موجوں سے
کم نہیں سمجھتا۔

(جی۔ میریڈتھ)

کیا ہو نہ سکا؟

ایک درد انگیز بہترین غزل

از حضرت طالب باغپتی

پردہ تو کیا او پردہ نشیں، تاہم کچھ پردہ ہو نہ سکا!
دل نے جب چاہا دیکھ لیا، گو مجھ سے نظارا ہو نہ سکا

تم نے کتنا سمجھایا تھا؟ پھر یاد آئے! پھر یاد آئے!
دل آہ تمہارا بن کر بھی کمبخت تمہارا ہو نہ سکا

کچھ آنسو تھے، کچھ آہیں تھیں، کچھ درد و الم کے قصے تھے!
ٹوٹے ہوئے دو دل ملتے تھے، دنیا کو گوارا ہو نہ سکا

آنکھوں میں محبت اشک بنی، پرشوق نگاہیں اٹھ نہ سکیں!
آخر وہ کبھی کے چل بھی دیئے، دل کہتا ہی آنا ہو نہ سکا

یوں کرنا تھا، یوں ہونا تھا، سب جھپانے کی باتیں ہیں!
انسان محبت کی خاطر کیا کر نہ سکا؟ کیا ہو نہ سکا

تم پھر عیادت آ نہ سکے، بیمار محبت چل ہی بسا!
تقدیر کا لکھا مٹ نہ سکا، تدبیر سے اچھا ہو نہ سکا

جو دل کے راز کی باتیں تھیں الفاظ میں طالب آ نہ سکیں!
روداد محبت ختم ہوئی، اظہار تمنا ہو نہ سکا!

شاعر موت کے دروازے پر

مرنے سے پہلے بعض مشہور شعراء کے آخری کلمات

از جناب مولانا محمد عبد(؟) صاحب قریشی

۱۔ خواجہ کمال الدین اسمٰعیل

خلاق المعانی خواجہ کمال الدین اسمٰعیل فارسی زبان کے یکتا قادر الکلام اور صاحبِ طرز شاعر تھے اور اصفہان کے رہنے والے تھے۔ کہتے ہیں کہ جب چنگیزی لشکر دنیائے اسلام کو تاخت و تاراج کر رہا تھا۔ تو اس کا ایک دستہ روکتائی خان کی سرکردگی میں اصفہان پہنچا۔ شہر پر قبضہ کرنے کے بعد خان نے قتل عام کا حکم دیا۔ ایک تاتاری سپاہی نے خواجہ کمال الدین اسمٰعیل کو خنجر سے زخمی کیا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ مرتے وقت آپ نے ایک رباعی کہی اور اپنے ہی خون سے اپنے گھر کی دیوار پر لکھ دی۔ یہ آپ کا آخری کلام تھا جو آپ نے اپنے وصال سے پہلے کہا۔ اس کے بعد وہ کسی سے کوئی بات نہ کر سکے۔ وہ رُباعی یہ ہے:-

دل خون شد و شرطِ جانگدازی اینست
در حضرتِ او کمینہ بازی این است
با این ہمہ خود ہیچ نمی یارم گفت !
شاید کہ مگر بندہ نوازی این است !

(یعنی) دل خون ہو گیا اور جانگدازی کی شرط یہی ہے، اس کے حضور میں سب سے ادنیٰ بازی یہی ہے، اس کے باوجود میں کچھ نہیں کہہ سکتا شاید بندہ نوازی اسی کا نام ہے۔

۲۔ شیخ فرید الدین عطار

جس زمانے میں ہلاکو خان نیشاپور پر حملے کر رہا تھا شیخ فرید الدین عطار وہیں مقیم تھے جب تاتاریوں نے شہر پر قبضہ کر لیا تو ہلاکو خان نے قتل عام کا حکم دے دیا۔ گیر و دار کا ہنگامہ گرم ہوا۔ شہر میں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ بڑے بڑے زعیم گرفتار ہوتے کئی بے گناہ مارے گئے۔ ایک تاتاری نے شیخ فرید الدین عطار کو بھی پکڑ لیا۔ وہ آپ کو مقتل کی طرف لے جا رہا تھا کہ آپ پر وجد کی حالت طاری ہو گئی۔ اور آپ نے فرمایا کہ یہ نمدے کی ٹوپی سر پر رکھ کر اور تیغ ہندی کمر سے باندھ کر ترکستان سے شاید تم دوستوں کو دھوکہ دینے آ رہے ہو تمہارا خیال ہے کہ ہم تمہیں شناخت نہیں کر سکیں گے۔ مگر تم کسی رنگ روپ اور کسی بھیس میں ہو ہم تمہیں پہچان لیں گے۔

اسی اثنا میں ایک تاتاری سپاہی آیا اور اس نے کہا کہ یہ غلام مجھے دے دو میں اس کے عوض میں ایک سو روپیہ دیتا ہوں۔ شیخ نے فرمایا کہ مجھے نہ بیچنا میری قیمت بہت زیادہ ہے۔ اتنے میں ایک اور تاتاری گھاس کا گٹھا لے کر آیا اور کہنے لگا کہ اس گٹھے کے بدلے یہ غلام میرے حوالے کر دو شیخ نے کہا کہ بے شک مجھے فروخت کر دو کیونکہ میری قیمت اس سے بھی کم ہے۔ پہلا تاتاری بھڑک اٹھا۔ اس نے شیخ کو قتل کرنے کے لئے بٹھایا شیخ نے فی البدیہہ یہ رباعی کہی:-

دلدار بہ تیغ بر و دست اے دل ہیں ☆ بر بند میان و بر سر پا بہ نشیں
وانگہ بہ زبان حال میگو کہ بہ نوش ☆ [illegible] باز پسیں

(ترجمہ) اے دل! دیکھ!! دلدار نے تلوار پر ہاتھ مارا!! تو بھی کمر باندھ لے اور سرنگوں ہو کر بیٹھ جا، اور اس وقت زبان حال سے کہہ کر، یار کے ہاتھ سے پیالہ لے اور آخری شربت نوش کر۔

جب سر تن سے جدا ہونے لگا تو آپ نے فرمایا ؎

در راہ تو رسم سرفرازی این است ٭ عشاق ترا کمینہ بازی این است
با این ہمہ از لطف تو نومید نیم ٭ شاید کہ ترا بندہ نوازی این است

(یعنی، تیری راہ میں سرفرازی کی رسم یہ ہے، تیرے عاشقوں کی ادنےٰ بازی یہ ہے۔ اس کے باوجود میں تیرے لطف و کرم سے مایوس نہیں ہوں (شاید تیری بندہ نوازی یہ ہے)

اس کے بعد وہ کوئی بات نہ کر سکے۔

۳۔ پہلوان محمود پوریا

پہلوان محمود پوریا ایک زبردست صوفی اور صاحب دل بزرگ تھے جب آپ کا آخری وقت آیا تو آپ کے مرید آپ کے گرد جمع ہوئے آپ بستر مرگ پر پڑے دم توڑ رہے تھے۔ ایک مرید نے کہا:۔

"اے آقا! کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ تاکہ ہم آپ کی آخری خواہش پوری کرنے کے لئے جان لڑا دیں"

یہ سن کر آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور آپ نے رقت آمیز لہجے میں فرمایا ؎

چہ پرسی چہ می بایدت وقت مرگ ٭ بہ جز وصل جاناں چہ می بایدم
جدائی مبادا مرا از خدا ٭ دگر ہر چہ پیش آیدم شایدم

(ترجمہ) موت کے وقت کیا پوچھتے ہو کہ تجھے کیا چاہئے، محبوب کے وصل کے سوا اور کس چیز کی ضرورت ہے، بس خدا سے جدائی نہ ہو۔ اس کے علاوہ جو کچھ پیش آئے مجھے منظور ہے۔

۴۔ مولانا لطف اللہ نیشاپوری

مولانا لطف اللہ نیشاپوری فارسی کے ایک خوش گو شاعر تھے۔ نام ان کا نصیب ہلکا تھا اس لئے بدقسمتی میں بہت شہرت رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں بہت سی عجیب و غریب روایات آپ کے نام منسوب ہیں۔ ایک مرتبہ آپ اپنے دوستوں اور شاگردوں کے ساتھ ندی پر کپڑے دھونے گئے مولانا کی پگڑی ابھی نئی تھی۔ جب آپ نے اسے دھو کر زمین پر پھیلایا تو ہوا کا ایک بگولا آیا اور پگڑی کو اڑا لے گیا۔ ہر چند مولانا نے اس کا تعاقب کیا مگر پگڑی نہ ملی۔ آپ مایوس ہو کر واپس چلے آئے اور اسی وقت آپ نے یہ قطعہ کہا ؎

طالعے دارم آنکہ از پئے آب ٭ گر روم سوئے بحر بر گردد
ور بہ دوزخ روم پئے آتش ٭ آتش از یخ فسردہ تر گردد
ور زکوہ التماس سنگ کنم ٭ سنگ نایاب چوں گہر گردد
ور سلامی برم بہ نزد کسے ٭ ہر دو گوشش بحکم کر گردد
اسپ تازی اگر سوار شوم ٭ زیر رانم رواں چو خر گردد
ایں چنیں حادثات پیش آید ٭ ہر کرا روزگار بر گردد

باہمہ شکر نیز باید گفت
کہ مبادا ازیں بتر گردد

(یعنی، میں ایسی قسمت کا مالک ہوں کہ اگر پانی کے لئے بحر کے پاس جاتا ہوں تو وہ بربن جاتا ہے۔ آگ کے لئے دوزخ کے پاس جاتا ہوں تو آگ ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ پہاڑ سے پتھر کی درخواست کرتا ہوں تو پتھر گوہر کی طرح نایاب ہو جاتا ہے۔ سلام کے ارادے سے کسی کے نزدیک جاتا ہوں تو اس کے دونوں کان بہرے ہو جاتے ہیں۔ اسپ تازی پر سوار ہوتا ہوں تو وہ گدھے کی چال چلنے لگتا ہے۔ غرض زمانے میں کوئی ایسا حادثہ نہیں جو مجھے پیش نہ آتا ہو ؎

وہ بدنصیب ہوں۔ وہ فدیۂ حوادث ہوں
کہ بجلیوں کو بھی میرا ہی آشیانہ ملا

اس کے باوجود مجھے شکر ہی کرنا پڑتا ہے۔ مبادا اس سے بھی برا حال نہ ہو جائے۔ اس کے بعد آپ نے ایک رباعی کہی جس میں زمانے کی شکایت اس طرح کی ؎

فریاد ز دست فلک بے سروبن ٭ کاندر بر من نہ نو گذارد نہ کہن
با این ہمہ ہیچ برنمی آرم گفتن ٭ گر زیں کہ بتر ہم کند کہ گوید کہ مکن

(ترجمہ) فریاد ہے اس بے سروپا آسمان کے ہاتھ سے جو میرے پاس نہ نئی چیز چھوڑتا ہے نہ پرانی، اس کے باوجود میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر وہ اس سے بھی بدتر سلوک کرے تو اسے کون روک سکتا ہے۔

اسی طرح ایک دفعہ آپ نے چند کبوتر بھونے اور نان خریدنے کے لئے بازار آئے۔ آپ کے دوستوں کو مذاق سوجھا۔ انہوں نے بھنے ہوئے کبوتر نکال لئے اور ان کی جگہ زندہ کبوتر دیگچی میں بند کر دیئے

جب مولانا واپس آئے اور دیگچی کا ڈھکنا اُٹھایا۔ تو کبوتر پھر سے اُڑ گئے
مولانا بڑے حیران ہوئے حسرت بھری نظروں سے دیر تک آسمان کی طرف
دیکھتے رہے اور پھر فرمایا کہ خدا وندا! میں تو تیری قدرت اور ہستی کا پہلے ہی
قائل ہوں مجھے ان معجزوں کی کیا ضرورت تھی۔ اگر اسی قسم کے اعجاز دکھانے
تھے تو اپنے منکرین میں سے شدّاد۔ نمرود اور فرعون کو دکھانے ہوتے۔

آخری عمر میں آپ اسفرئیں کے گاؤں میں گوشہ نشین ہو گئے۔

۵۰۱ھ کا واقعہ ہے کہ ایک دن آپ کے دوست آپ سے ملنے آئے
مکان کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اُنھوں نے بہت سی آوازیں دیں اور
دروازہ کھٹکھٹایا۔ مگر کوئی جواب نہ آیا۔ ایک شخص بڑی مشکل سے مکان
کی چھت پر چڑھا۔ اور وہاں سے نیچے اُتر کر مولانا کے کمرے میں پہنچا
مولانا اپنے سجادہ پر سربسجود پڑے تھے۔ وہ بہت دیر تک آپ کے پاس
کھڑا انتظار کرتا رہا۔ مگر مولانا نے سر نہ اُٹھایا۔ وہ بھاگا بھاگا باہر
آیا مکان کا دروازہ کھول کر تمام دوستوں کو اندر لے گیا۔ اور انھوں نے
دیکھا کہ مولانا سجدہ میں سر رکھ کر جان حق تعالےٰ کے سپرد کر چکے ہیں۔
وہ بہت روئے۔ شہر والوں کو خبر دی۔ وہ نماز جنازہ پڑھنے کے لئے وہاں
جمع ہو گئے۔ جب آپ کو مصلّے سے اٹھا کر چارپائی پر چت لٹایا گیا تو آپ
کے دائیں ہاتھ سے کاغذ کا ایک پُرزہ نکلا جس پر آپ نے مرتے وقت
یہ رباعی لکھی تھی ؎

دی شب ز سرِ صدق و صفا آں دلِ من ٭ در میکدہ آں روح فزائے دلِ من
جامے بمن آورد کہ بستاں و بنوش ٭ گفتم نخورم۔ گفت برائے دلِ من

(ترجمہ) کل رات میرے دل کی سچائی اور صفائی سے وہ دل کی روح
بڑھانے والا۔ میکدہ میں ایک پیالہ میرے پاس لایا کہ لے اور پی جا۔
میں نے کہا میں نہیں پیتا۔ اُس نے کہا میرے دل کی خاطر پی لے۔

کہتے ہیں کہ تمام حاضرین اس رباعی کو پڑھ کر رو پڑے اور سب
پر ایک کیفیت سی طاری ہو گئی۔

۵۔ خواجہ نظام الملک طوسی

خواجہ نظام الملک طوسی ایک زبردست وزیر اور علم و فن کا
مربّی تھا۔ بغداد کی نظامیہ یونیورسٹی آپ کی علم نوازی اور معارف پروری
کی ایک زندہ یادگار اور سیاست نامہ آپ کے تدبّر اور تبحر علمی کا ایک
بیّن ثبوت ہے۔ آپ نے الپ ارسلان اور جلال الدین ملک شاہ سلجوقی
کی خدمت بڑی وفاداری سے کی۔ مگر آخری عمر میں بعض سیاسی وجوہ
کی بنا پر ملکہ ترکان خاتون سے آپ کی اَن بن ہو گئی جو ملک شاہ کے مزاج
پر اتنی حاوی تھی کہ اس نے نظام الملک کو معزول کرا کے تاج الملوک کو
وکیل سلطنت مقرر کرا دیا۔

نظام الملک جب بغداد کے حملے سے واپس لوٹ رہا تھا تو نہاوند
کے مقام پر چند ملاحدہ نے آپ پر حملہ کر کے آپ کو زخمی کر دیا۔ زخم کاری
لگا۔ نظام الملک اس کی تاب نہ لا سکا۔ اور وہیں فوت ہو گیا۔ جب آپ کا
آخری وقت قریب آیا اور آپ کو زندگی کی اُمید نہ رہی تو آپ نے کاغذ کے
ایک پرزے پر یہ قطعہ لکھ کر بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔

چہل سال باقبال تو اے شاہِ جہاں بخت ٭ زنگِ ستم از چہرۂ آفاق ستردم
طغرائے نکونامی و توقیع سعادت ٭ نزدِ ملکُ العرش بالطاف تو بردم
چوں شد ز قضا مدت عمرم نود و شش ٭ در حدِ نہاوند بیک زخم بمُردم
بگذاشتم آں خدمتِ دیرینہ بہ فرزند ٭ اورا بخدا و بخداوند سپردم

(یعنی) اے شاہِ جہاں بخت! میں نے تیرے اقبال سے چالیس سال
تک زمانے کے چہرے سے ظلم کا میل دور کیا۔ تیری مہربانی سے میں
نیک نامی کا نشان اور نیک بختی کی دستاویز خداوند مالک عرش کے پاس
لے گیا۔ جب میری عمر چھیانوے برس کی ہوئی تو تقدیر سے میں نہاوند کی
حد پر ایک زخم کے ساتھ مر گیا۔ میں نے اپنی پرانی خدمت اپنے فرزند کے
لئے چھوڑی اور اسے خدا اور حضور کے سپرد کیا۔

اس قطعہ کا اثر بادشاہ کے دل پر اتنا ہوا کہ وہ بے اختیار رو
پڑا اور اپنے کئے پر بہت پشیمان ہوا۔

۶۔ سلطان محمود غزنوی

سلطان محمود غزنوی کے نام سے کون واقف نہیں۔ وہ ایک
زبردست سپہ سالار، ایک بے نظیر کشور کشا اور منصف مزاج بادشاہ
تھا۔ اس کی علمی سرپرستی کے افسانے اب تک زبان زد خلائق ہیں اس
کی دولت مندی ایک ضرب المثل بنی ہوئی ہے جب اس کی موت کا وقت

قریب آیا۔ تو زندگی کا ایک ایک واقعہ اس کی نظروں میں پھر گیا۔ اور اس نے
ان واقعات سے متاثر ہو کر کہا ؎

بہ زخم تیغ جہانگیر و گرز قلعہ کشائے ٭ جہاں مسخر من شد چو تن مسخر رائے
بسے قلاع کشادم بیک نمودن دست ٭ بسے مصاف شکستم بیک فشردن پائے
چو مرگ تاختن آورد ہیچ سود نکرد !
بقا بقائے خدا ایست و ملک ملک خدائے

(ترجمہ) جہان کو فتح کرنے والی تلوار اور قلعہ شکن گرز سے دنیا میری اسی
طرح مطیع ہو گئی جس طرح بدن عقل کا تابع ہوتا ہے۔ میں نے ایک ہی مرتبہ کے
اظہار قوت سے بہت سے قلعے فتح کئے اور ایک ہی ثابت قدمی سے بہت
سی جنگوں میں شکست دی۔ لیکن جب موت نے حملہ کیا کوئی بات مفید نہ ہوئی
زندگی خدا کی زندگی ہے اور بادشاہی خدا کی بادشاہی ہے۔

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

۷۔ حکیم سنائی

حکیم سنائی پانچویں صدی ہجری میں غزنی کے ایک زبردست ادیب
فاضل فلسفی اور باکمال شاعر تھے۔ شروع شروع میں وہ بہرام شاہ کے
درباری شعرا میں ملازم تھے اور بادشاہ کی مدح میں قصیدے لکھ لکھ کر منہ
مانگا صلہ پاتے تھے۔ مگر آخری عمر میں طبیعت نے پلٹا کھایا اور آپ نے اس
وقت کے مشہور صوفی شیخ ابو یوسف ہمدانی کے ہاتھ پر بیعت کر کے اپنا سب
کچھ چھوڑ چھاڑ دیا۔ اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ جب بہرام شاہ نے
اپنی ہمشیرہ کا عقد آپ سے کرنا چاہا تو آپ نے انکار کر دیا۔ اور بہرام شاہ
کو یہ جواب لکھ بھیجا کہ ؎

من نہ مرد زن و زر و جاہم ٭ بخدا اگر کنم و گر خواہم
گر تو تاجے دہی ز احسانم ٭ بسر تو کہ تاج نستانم

(یعنی) میں دولت کا بھوکا۔ عورت کا متوالا اور جاہ پسند آدمی نہیں
ہوں۔ اگر میں ان چیزوں کی خواہش کروں تو خدا میری حالت بدل دے۔
اگر تو اپنے کرم سے مجھے تاج شاہی بھی عنایت کرے۔ تو تیرے سر کی
قسم میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھوں۔

ایک رئیس نے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی خواہش ظاہر
کی مگر آپ نے مندرجہ ذیل خط لکھ کر اسے بھیجدیا۔ اور کہدیا کہ فقیر گوشہ نشین
کا سامان عافیت خراب کرنے کے لئے کیوں آتے ہو۔

"ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا۔ گوشۂ دل این گوشہ
گرفتہ را بہ تفسد ستائش خود خراب نہ کند جیم فقیر این
بندہ نہ سزائے خشم خداوندی است"

اسی حالت میں ۵۲۴ھ اور ۵۳۵ھ کے درمیان آپ نے خواجہ
رئیس احمد مسعود بیٹہ کی فرمائش پر دس سال کی مدت میں حدیقۃ الحقیقت
کتاب لکھی جو صوفیانہ شاعری کی جان کہی جاتی ہے۔ مگر علمائے ظاہرین نے
اس کے بعض اشعار کو خلاف شرع قرار دے کر اس کی سخت مخالفت کی اور
آپ پر کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔ یہاں تک کہ آپ نے صحت عقائد اور
ایمان کے ثبوت میں علمائے بغداد سے سند حاصل کر کے ان سے جان
چھڑائی۔

آپ ۵۴۵ھ میں فوت ہو کر غزنی میں دفن ہوئے۔ کہتے ہیں کہ
جب آپ نزع میں تھے تو آہستہ آہستہ کچھ پڑھ رہے تھے۔ حاضرین نے
کان لگا کر سنا تو یہ شعر آپ کی زبان پر جاری تھا ؎

بازگشتم ز انچہ گفتم زاں کہ نیست
در سخن معنے و در معنے سخن

(ترجمہ) جو کچھ میں نے کہا میں اس سے توبہ کرتا ہوں۔ کیونکہ میرے
کلام میں معانی اور معانی میں شاعری نہیں ہے۔

۸۔ شیخ فخر الدین ابراہیم عراقی

شیخ فخر الدین ابراہیم عراقی ہمدان کے رہنے والے تھے۔ چھوٹی
سی عمر ہی میں قرآن کریم حفظ کر لیا تھا اور بڑی خوش الحانی سے پڑھا کرتے تھے
سترہ برس کی عمر میں ہندوستان تشریف لائے اور شیخ بہاؤ الدین زکریا کے
مریدوں میں شامل ہو گئے۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں ؎

پرسی اگر از جہاں کیست امام الانام ٭ نشنوی از آسماں جز زکریا جواب

یہاں آپ نے چلہ کشی شروع کی۔ مگر ابھی دس دن ہی گزرے
تھے کہ درویشوں نے شکایت کی کہ آپ نے چلہ کشی کی شرط اولین یعنی
سکوت کو توڑ کر ایک غزل کہی اور گائی ہے جس کا مطلع اور مقطع یہ ہیں:

نخستین بادہ کاندر جام کردند * ز چشم مست ساقی وام کردند
چو خود کردند راز خویشتن فاش * عراقی را چرا بدنام کردند

شیخ بہاؤالدین زکریا نے جب یہ غزل سُنی تو فرمایا کہ اس نے منزل کو پالیا۔ اس کا کام ختم ہو گیا۔ اور اس نے سلوک کے تمام مراحل طے کر لئے۔ اس کے بعد انہوں نے عراقی کو اپنے حجرے میں بلایا اپنا خرقہ عطا کیا۔ انہیں خاک سے اٹھایا اور اپنی لڑکی ان کے عقد میں دے دی۔ جس کے بطن سے ایک لڑکا کبیر الدین پیدا ہوا۔

پچیس برس گذرنے کے بعد شیخ بہاؤالدین زکریا فوت ہو گئے اور عراقی کو اپنا خلیفہ نامزد کر گئے۔ مگر دوسرے درویشوں نے اس نامزدگی کو منظور نہ کیا اور آپ کی مخالفت شروع کر دی۔ اس پر عراقی ہندوستان کو خیرباد کہہ کر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت کو روانہ ہو گئے۔ وہاں سے ایشیائے کوچک کی طرف گئے۔ قونیہ میں وہ شیخ صدر الدین کے درس میں شامل ہو گئے اور وہیں اپنی مشہور کتاب لمعات مرتب کی۔ وہاں سے مصر تشریف لے گئے جہاں سلطان کی طرف سے آپ کا شاہانہ استقبال ہوا۔ شام میں بھی اُن کا شایانِ شان خیر مقدم کیا گیا۔ دمشق میں پہنچنے کے چھ ماہ بعد آپ کا لڑکا کبیر الدین بھی ہندوستان سے چل کر انہیں آملا۔ آپ ان دنوں بیمار تھے۔ آپ نے لڑکے کو مخاطب کر کے کہا:

سر بسر لطفی و جانی اے پسر * خوشتر از جان چیست آنی اے پسر
میل دلہا جملہ سوئے روئے تست * چہ کہ شیریں دلستانی اے پسر
زاں بچشم من دُر آئی ہر زماں * کہ صفا آبِ روانی اے پسر
از ملاحت ارچہ سرمستی مکن * با حریفاں سرگرانی اے پسر
وعدۂ امید اگرچہ کج بود * از بہانہ در نہانی اے پسر
بر لب خود بادہ و آنگہ ببیں * ذوقِ آبِ زندگانی اے پسر
زاں شدم خاکِ درت کز جامِ مے * جرعہ بر من فشانی اے پسر
گوشِ جانہا پُرگہر شد بسکہ تو * از سخن دُر مے فشانی اے پسر
از لطیفی عیب من نہ کس بتو * زاں یقینم شد کہ جانی اے پسر
مدعی و چشم زحمی لطف تو * آشکارا و نہانی اے پسر
نیست تا در عالم عراقی را دمے * بر لبِ تو کامرانی اے پسر

اس کے بعد ۸ ذیقعد ۶۸۸ھ مطابق ۲۴ نومبر ۱۲۸۹ء کو مندرجہ ذیل رُباعی پڑھ کر جان دے دی۔ اور مشہور صوفی شیخ محی الدین ابن عربی کے پہلو میں دفن ہوئے۔

در سابقہ چوں قرار عالم دادند * مانا کہ نہ بر مراد آدم دادند
زاں قاعدہ و قرار کاں روز فتاد * نے بیش بکس قسمت و نہ کم دادند

(ترجمہ) شروع شروع میں جب دنیا کا طریقہ مقرر کیا گیا۔ تو یہ ٹھیک ہے کہ اسے انسان کی مرضی کے بموجب نہ رکھا گیا۔ مگر وہ اندازہ روزِ اوّل سے بے شک اسی طرح قائم ہے۔ اس سے نہ کسی کو کچھ زیادہ دیا جاتا ہے اور نہ کم۔

یعنی

قسمت کیا ہر ایک کو قسّامِ ازل نے * جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بقدرِ ظرف ملا ظرف سے سوا نہ ملا

۹۔ میرزا حبیب اللہ قاآنی شیرازی

میرزا حبیب اللہ قاآنی شیرازی ادبیاتِ ایران کا آخری تاجدار تھا۔ جو ۱۲۲۳ھ میں پیدا ہو کر ۱۲۷۰ھ میں فوت ہوا۔ وہ عربی۔ فارسی۔ ترکی اور فرانسیسی چاروں زبانوں سے واقف تھا اور علم منطق۔ ریاضی۔ معانی۔ ہندسہ۔ نجوم۔ طبعیات۔ اشتقاقات۔ ادب اور فقہ میں پوری پوری مہارت رکھتا تھا۔ اس نے شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کی گلستان کے جواب میں پریشان کتاب لکھی اور قصائد۔ غزلیات۔ رباعیات۔ قطعات اور چھوٹی چھوٹی مثنویوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا۔ اس کی شاعری کی ابتدا شاہزادہ حسین علی میرزا کی علمی سرپرستی سے ہوئی۔ جہاں سے اس کی قادر الکلامی کی شہرت کجکلاہِ ایران فتح علی شاہ قاچار کے دربار میں پہنچی۔ اس نے قاآنی کو "مجتہد الشعراء" کا خطاب دیا۔ اور اسے دربار میں شامل کر لیا۔ فتح علی شاہ قاچار کی وفات کے بعد وہ اس کے بیٹے محمد شاہ غازی کے دامنِ دولت سے وابستہ ہوا۔ جس نے اسے "حسان العجم" کا خطاب اور ایک معقول وظیفہ عطا کیا۔ ۴ ستمبر ۱۸۴۸ء کو چودہ سال کی حکومت کے بعد جب محمد شاہ غازی کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا ناصر الدین شاہ قاچار تخت پر بیٹھا۔ اس نے ملک الشعراء کے معزز خطاب سے قاآنی کا مرتبہ بڑھایا اور آخری دم تک اس کا وظیفہ لگائے رکھا

عمر خیام کی ایک رُباعی

تا در ہوسِ لعل لبِ جام مے - تا در پے آواز دف و چنگ و نے

اینہا ہمہ خوش است خدا میداند - تا ترک تعلق نہ کنی ہیچ نے

کہتے ہیں کہ ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۴ء میں بمقام طہران اس پر تپ اور اسہال کے مرض نے حملہ کیا۔ جو جان لیوا ثابت ہوا۔ جب وہ بستر مرگ پر لیٹا ہوا تھا اور اس کے تمام دوست اور عزیز اس کی زندگی سے مایوس ہو کر اس کی چارپائی کے گرد مغموم کھڑے تھے تو ان میں سے کسی نے کہا کہ اب توبہ و استغفار کا وقت ہے آپ درگاہ ایزدی میں بخشش کی دعا کریں یہ کلمات سن کر قاآنی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور نہایت حسرت بھرے لہجے میں یہ شعر پڑھ کر دم دے دیا ؎

شرمندہ از آنیم کہ در دار مکافات
اندر خور عفو تو نہ کردیم گناہے

(ترجمہ) ہم شرمندہ ہیں کہ ہم نے اس بدلہ کی دنیا میں کوئی ایسا گناہ نہیں کیا جس کو تیری بخشش توجہ کے قابل سمجھ سکے۔

۱۰۔ روح اللہ خان میر بخشی

روح اللہ خان میر بخشی عالمگیر کے امرائے موروثی میں سے تھا۔ وہ بیمار ہوا تو بادشاہ اس کی عیادت کو گیا۔ بیمار پرسی کے بعد بادشاہ نے اس کے حق میں دعا کی کہ خدا اسے شفا عطا فرمائے۔ روح اللہ خان کا دل بھر آیا۔ وہ بادشاہ کی تکلیف فرمائی اور ہمدردی پر بہت خوش ہوا اس نے اظہار شکر گزاری کے لئے یہ شعر پڑھا اور دم دے دیا ؎

چہ بناز رفتہ باشد زجہاں نیازمندے
کہ بوقت جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی

(ترجمہ) وہ نیازمند کس شان کے دنیا سے رخصت ہوا ہوگا جس کے جان دیتے وقت تو اس کے سر پر پہنچ گیا ہو۔

جمع ہیں احباب بالیں پر مری : موت کتنی خوبصورت بن گئی

"روح در تن ملک نماند" سے اس کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

لمعات

(از جناب نیّر اثر قیسری)

آنکھ بیمارِ محبّت نے لگائی ہوتی !
نیند آتی نہیں گر موت ہی آئی ہوتی

میں نے اچھا کیا اظہارِ محبّت، نہ کیا
بات منہ سے جو نکلتی تو پرائی ہوتی

گر نہ آمیزشِ خونِ دلِ عاشق ہوتی
ہے یقیں مجھکو حنا رنگ نہ لائی ہوتی

ایک تو ہوتا مرا پھر مجھے پروا کیا تھی
دشمنِ جاں مری گو ساری خدائی ہوتی

آپ نے مفت کا الزام لیا ہے صاحب!
دل چرایا جو نہ تھا آنکھ ملائی ہوتی

دوڑتا پھرتا رگِ جاں میں لہو آپ۔ اگر
نبضِ بیمار پہ انگشتِ حنائی ہوتی

آپ کو زلفیں بنانا تو بہت آتا ہے
میری بگڑی ہوئی قسمت بھی بنائی ہوتی

رونقِ بزمِ جہاں بنکے دکھاتے نیّرؔ
ہم نے گر چوٹ محبّت کی نہ کھائی ہوتی

تبرّکاتِ مضطر

حضرت مضطر خیرآبادی مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام

مُرسلہ جناب محمد ضیا حسین صاحب فاروقی ضیا برادر زادہ مرحوم

محبّت کر کے لاکھوں رنج جھیلے بیکلی پائی
وہ ہم کو کیا ملے اک موت گویا جیتے جی پائی

شکایت کیا لبِ جاناں یہ اپنی اپنی قسمت ہے
کہ میری آنکھ کو آنسو ملے تو نے ہنسی پائی

پرکھنے کیلئے آنکھیں خدا نے ہم کو اچھّی دیں
دکھانے کیلئے صورت حسینوں نے بھلی پائی

وہ بُلبُل ہوں کہ جس دن سے لُٹا ہے آشیاں میرا
اُٹھا لایا میں اپنا دل سمجھ کر جو کلی پائی

جہاں میں واقعی مضطر کا بھی اک دم غنیمت تھا
مگر افسوس تھوڑے دن جیا، کم زندگی پائی

فراموش کار

از جناب ماسٹر ممتاز حسین صاحب بسمل

رات ایک پہر کے قریب گزر چکی تھی۔ بمبئی کا خوبصورت شہر بجلی کی روشنی میں اپنے جوبن پر اترا رہا تھا۔ ایک آراستہ کمرے میں پرویز اپنی خوبصورت بیوی فیروزہ سے تند لہجے میں گفتگو کر رہا تھا

"عورتوں کے لئے زندگی ایک مذاق ہے۔ میں نے تمہیں کتنی تاکید کی تھی مگر تم نے کوئی پرواہ نہ کی"۔

"اگر تم دعوت میں نہیں شریک ہو سکے تو کونسی قیامت ٹوٹ پڑی ہے"

اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور فیروزہ کی بات ناتمام رہ گئی

"میں ہوں سہراب"

"فرمائیے" پرویز نے جواب دیا

"مجھے حیرت ہے کہ آج آپ تشریف نہیں لائے۔ آپ کا بڑا انتظار رہا"۔

پرویز نے جواب طلب نگاہوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔

"کہدو میری بیوی کی طبیعت ناساز ہے" فیروزہ نے کہا۔

"میرے عزیز دوست میں مجبور تھا۔ فیروزہ بیمار ہے۔ میں اُسے تنہا چھوڑ کر نہیں آسکتا تھا"۔

"کیا تکلیف ہے"۔

"سر درد۔ بے چینی"۔

"آپ کی عدم موجودگی کی وجہ سے محفل سونی اور بے رونق تھی۔ اچھا خدا فیروزہ کو جلد صحت بخشے۔ میری جانب سے بیمار پرسی کر دیجئے گا"۔

"بہتر شکریہ"۔

"فیروزہ" پرویز نے غصہ سے کہا "تم نے میری زندگی کا بہترین موقع خاک میں ملا دیا ہے۔ مسٹر سہراب نے یہ دعوت میرے لئے ترتیب دی تھی۔ مشرقی سندوں کا مشہور سوداگر جمشید بے آج کل بمبئی آیا ہوا ہے۔ مجھ جیسے ناچیز آدمی اس کی گرد راہ کو بھی نہیں پا سکتے اس دعوت میں اُسے مدعو کیا گیا تھا اور میں وہاں کاروبار کے سلسلے میں اس سے طویل گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ اگر میں اپنی سعی میں کامیاب ہو جاتا تو ہم جھونپڑے سے راج محل میں جا براجتے"۔

"تم اکیلے چلے جاتے" فیروزہ نے ترش ہو کر کہا۔

"وہاں سب تمہارے متعلق دریافت کرتے پھر میں کیا جواب دیتا"۔

"کہہ دیتے کہ وہ بیمار ہے"۔

"فیروزہ آج تم بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔ بیسویں صدی میں بیمار بیوی کو چھوڑ کر دعوت میں شریک ہونا جرم سمجھا جاتا ہے"۔

"اب میں سمجھی کہ بیوی کو گھلا گھلا کر مار دینا فیشن میں داخل ہے"

"تم کہاں چلی گئی تھیں"۔ پرویز نے موضوع بدلنے کے لئے کہا۔

"میں شہر کی بلند عمارتوں میں گھبرا گئی تھی۔ آج موسم خوشگوار تھا۔ میں اس شور و غل کی دنیا سے نکل کر دیہات کی خوشگوار فضا میں سیر کے لئے چلی گئی تھی"۔

فیروزہ نے بمبئی کے قریب لب ساحل ایک گاؤں میں پرورش پائی تھی۔ اس کا باپ علاقہ کا بڑا زمیندار تھا۔ اور پھلوں کی کاشت کرتا تھا۔ ایک دن کاروبار کے سلسلے میں پرویز وہاں گیا۔ وہاں اتفاق سے فیروزہ سے اس کی ملاقات ہوئی۔ شام کا وقت تھا سمندر

کا پانی عکس شفق سے گلزار نظر آتا تھا۔ فضا رومانس سے بھرپور تھی۔
فیروزہ لب ساحل ایک چٹان پر بیٹھی تھی۔ دور سمندر میں آفتاب
غروب ہو رہا تھا اور اس کے پرتو نے خوبصورت دوشیزہ کی گلابی
رنگت کو سنہرا بنا دیا تھا۔ ہوا اس کی زلفوں کو اڑا رہی تھی اور وہ
بے خودی کے عالم میں بحری پرندوں کو اڑتے دیکھ رہی تھی۔ پرویز
اپالو پر بمبئی کے عریاں حسن کو قیامت ڈھاتے دیکھ چکا تھا۔ اور کبھی
متاثر نہیں ہوا تھا۔ مگر اس دیہاتی دوشیزہ کی بے مثال خوبصورتی
نے اسے دیوانہ بنا دیا۔ چند ایک ملاقاتوں کے بعد دونوں میں گاڑھی
چھننے لگی اور انجام کار پرویز اس جنگل کی پری کو بیوی بنا کر شہر میں
لے آیا۔ بمبئی کی فضا میں فیروزہ کا دم گھٹنے لگا مگر وہ مجبور تھی۔ اس کے
شوہر کا کاروبار بمبئی کی گنجان آبادی سے تعلق رکھتا تھا۔

شہر میں اس کی ملاقات فریدوں سے ہوتی وہ دبلا پتلا
شاعر مزاج نوجوان تھا۔ چونکہ دونوں شہر سے متنفر اور دیہاتی فضا
کے خواہاں تھے۔ اس لئے بہت جلد بے تکلفی پیدا ہو گئی۔ جب
دونوں بمبئی کی گنجان آبادی سے اکتا جاتے تو گھنٹہ دو گھنٹہ کے
لئے کھیتوں یا باغات کی طرف نکل جاتے۔

"مجھے یقین ہے وہ چھوکرا فریدوں تمہارے ہمراہ ہوگا"
پرویز نے طیش میں آکر کہا۔

"تمہارا خیال ٹھیک ہے۔"

غصہ سے پرویز کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور وہ دانت پیستا
ہوا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں تمہیں آخری بار حکم دیتا ہوں کہ اس ذلیل چھوکرے
سے تعلقات قطع کر دو" پرویز نے فیروزہ کی کلائی مروڑتے ہوئے کہا۔

"پرویز میں نہیں جانتی تھی کہ تم اتنے کمینہ اور خود غرض ہو۔
مجھے چھوڑ دو کاش میں نے تم سے شادی نہ کی ہوتی۔"

"اب اس کا ذکر کرنے سے کیا فائدہ۔ تمہیں تابعدار بیوی
بن کر رہنا ہوگا۔"

فیروزہ نے اپنے مغلوب الغضب خاوند کی طرف حیرت
سے دیکھا۔

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ اب تمہاری ہوس کو تسکین
حاصل ہو چکی ہے۔ اور تمہیں میری ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم
نہیں تھا کہ تمہاری محبت آمیز گفتگو کے پس پردہ ہوا و ہوس کا
خوفناک عفونت پوشیدہ ہے۔"

"میں بے وفا بیوی کو پسند نہیں کرتا۔"

"اگر تم مجھ سے بیزار ہو تو میں اس وسیع دنیا میں اپنے لئے
کوئی ٹھکانا ڈھونڈ لوں گی" یہ کہہ کر فیروزہ نے زور سے دروازہ
بند کیا اور اپنی خوابگاہ میں چلی گئی۔

(۲)

دوسرے دن چار بجے کے قریب پرویز کاروبار سے
فارغ ہوا۔ بیوی کے لئے پھولوں کے چند گلدستے خریدے اور
گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اس کا غصہ فرو ہو چکا تھا۔ اور وہ اپنی
بیوی سے رات کی تند گفتگو کے متعلق معذرت کا خواہاں تھا۔

جب اس نے صدر دروازے میں قدم رکھا تو خادمہ کا
اترا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔

"فیروزہ کہاں ہے" اس نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"آج صبح سے غائب ہے۔"

"کوئی پیغام"

"کوئی نہیں اپنا سوٹ کیس ہمراہ لے گئی ہے"

پرویز پر بجلی ٹوٹ پڑی۔ ایک گوہر نایاب کی صحیح قدر اس
وقت معلوم ہوتی ہے۔ جب وہ ہاتھ سے چھن جائے اس نے
گلدستے بے پرواہی سے میز پر پھینک دئے اور آرام کرسی پر لیٹ
گیا۔ کمرے کی دیواریں اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہی
تھیں۔ کل تک اس کی زندگی چین اور خوشی کا مرقع تھی۔ مگر
آج فیروزہ کی گمشدگی نے اسے اوج مسرت سے پریشانی کی
گہرائیوں میں پھینک دیا تھا۔ فیروزہ کا حسین چہرہ اس کی
زندگی کے لمحات کو منور بنا رہا تھا۔ اور آج اس کو کھو کر اس
کی زندگی تاریکی کے اتھاہ ساگر میں ڈوب رہی تھی۔ وہ دیر
تک سر کو بازوؤں میں تھامے سوچتا رہا آخر بے قرار ہو کر اٹھا

اور ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔
تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے خسر کے ساتھ باتیں کر رہا تھا
"میں ابھی ابھی تمہارا ذکر کر رہا تھا" فیروزہ کے والد نے کہا۔

....

"فیروزہ کیسی ہے"؟

....

"میں چاہتا ہوں کہ تم دونوں چند روز کے لئے یہاں چلے آؤ۔ آج کل کیلا بڑا مزیدار اور بہت زیادہ ہے"۔

....

"میں ہر گھڑی آپ کا منتظر ہوں"۔

....

وہ ٹیلی فون سے ہٹ کر اپنی جگہ پر آبیٹھا۔
"فیروزہ بسبین نہیں گئی"۔ پرویز نے کہا "شاید اپنی چچی کے ہاں ہو"۔
فیروزہ کی چچی اپالو کے قریب رہتی تھی چونکہ اُس کے گھر میں ٹیلی فون نہیں تھا۔ اس لئے پرویز نے ٹیکسی لی اور اپنی بیوی کی تلاش میں وہاں جا پہنچا۔
"فیروزہ یہاں ہے"؟ اس نے پوچھا۔
"خیر ہے بیٹے" بوڑھی پارسن نے گھبرا کر کہا "وہ ایک ہفتہ سے یہاں نہیں آئی"۔
"خدا جانے وہ کہاں چلی گئی" پرویز نے کہا۔ "آج صبح سے غائب ہے"۔
"اب تم اُسے تلاش کرنے جاؤ گے" بڑھیا نے پوچھا۔
"ہاں شہر کے باغوں میں ڈھونڈونگا"۔
"جب وہ مل جائے تو مجھے اطلاع دینا۔ میری طبیعت پریشان رہے گی"۔
"بہتر" پرویز نے کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بڑھیا کی نظروں سے غائب ہو گیا۔ اس نے ایک ٹیکسی کرایہ پر لی اور لب ساحل کے حسین باغات میں اپنی خوبصورت بیوی کو ڈھونڈتا رہا۔ آخر کار مایوس ہو کر ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔
"اب کہاں جاؤں" اس نے سوچا۔
اچانک اُسے فیروزہ کی ایک سہیلی کا خیال آیا۔ وہ شہر کے ایک کنارے پر رہتی تھی اور اُس کی بیوی گاہ بگاہ اُس کے گھر جایا کرتی تھی وہ ٹیکسی میں بیٹھا اور پندرہ منٹ کے بعد اُس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ فیروزہ کی سہیلی سولہ سنگار کئے عطر میں ڈوبی ہوئی رقص کے لئے جا رہی تھی۔
"آج فیروزہ تمہارے پاس آئی تھی"۔ پرویز نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔
"نہیں"
"اچھا خدا حافظ" پرویز نے کہا اور وہاں سے چل دیا۔
"کیا ہوا"؟ فیروزہ کی سہیلی نے مجسم اشتیاق بن کر پوچھا۔
"کچھ نہیں" اُس نے جواب دیا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

(۳)

تھوڑی دیر کے بعد وہ گھر پہنچا۔
"فیروزہ آئی ہے"۔ اُس نے خادمہ سے اپنا اضطراب چھپاتے ہوئے پوچھا۔
"نہیں" خادمہ نے جواب دیا۔
وہ نشست کے کمرے میں ایک آرام کرسی پر گر پڑا۔ اور دروازہ بند کر لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آنسوؤں کے بڑے بڑے قطرے اُس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ اور شدتِ گریہ سے ہچکیاں بندھ گئیں۔
اچانک اُسے فریدوں یاد آ گیا وہ دُبلا پتلا چھوکرا اُس کی حسین بیوی کو اڑا لے گیا تھا اور اس کی بے چینی کا ذمہ دار تھا۔
"میں اُسے ہلاک کر دوں گا"۔ پرویز نے گھونسا تانتے ہوئے کہا۔ "اس کا خون پی جاؤں گا"۔ کسی نامعلوم جذبہ کے زیر اثر اس نے دروازہ بند کیا اور گھر سے نکل گیا۔

فریدوں ایک ہفتہ وار اخبار کا مالک تھا اور اس کا دفتر چند قدموں کے فاصلے پر تھا۔

پرویز نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے"! ایک بھدی آواز نے دریافت کیا۔

"پرویز" اُس نے جواب دیا۔

ایک نوجوان نے دروازہ کھولا۔

"فریدوں کہاں ہے"۔ پرویز نے پوچھا۔

"باہر گئے ہیں"۔

"کب واپس آئیں گے"۔

"میں نہیں جانتا" نوجوان نے کہا اور دروازہ بند کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"ٹھہرو" پرویز نے کہا "مجھے بتاؤ کہ وہ کہاں ہے"۔

"وہ آج صبح یہاں سے جبیر گئے تھے"۔

"اکیلے"۔

"نہیں ایک خوبصورت لڑکی ان کے ہمراہ تھی"۔

"ایک خوبصورت لڑکی" پرویز نے دہرایا۔ نوجوان نے فرصت کو غنیمت سمجھا اور دروازہ بند کرکے چلا گیا۔

"جبیر" پرویز بڑبڑایا "ایک خوبصورت لڑکی کے ہمراہ"۔

"جبیر کہاں ہے"۔ اس نے ایک ٹیکسی والے سے پوچھا

"پونا ریلوے لائن پر ایک چھوٹا سا سٹیشن ہے"۔ اُس نے جواب دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پرویز گاڑی میں بیٹھا تھا اور ٹرین پوری رفتار سے اُڑی جارہی تھی اس وقت وہ انتقام کے سوا باقی ہر ایک شے فراموش کرچکا تھا۔ اُس کی رگوں میں خون کھول رہا تھا۔ وہ بار بار مٹھیاں بھینچتا اور بے قراری سے ڈبے میں اِدھر اُدھر ٹہلتا۔

تھوڑی دیر کے بعد گاڑی جبیر کے سٹیشن پر رُکی اور وہ اُچھل کر پلیٹ فارم پر گرا۔

"یہاں کھانا مل سکے گا"۔ اُس نے ایک قلی سے پوچھا

"صاحب" اس نے جواب دیا "اِس سڑک پر چلے جائیے۔ کوئی سو گز کے فاصلے پر ایک ہوٹل ہے۔ بمبئی سے اکثر امیرزادے یہاں سیر کے لئے آتے ہیں اور وہاں ٹھہرتے ہیں"۔

پرویز ایک دوڑ میں ایک ہوٹل میں پہنچ گیا اور کھانا طلب کیا خوب سیر ہوکر کھایا۔ سگریٹ پینے لگا اِدھر اُدھر دیکھا مگر فریدوں کا کوئی پتہ نہ تھا۔

"میری جان میری پیاری"۔ اچانک اس نے فریدوں کو کہتے ہوئے سُنا اور غصّہ میں لرزتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

دائیں ہاتھ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا وہاں سے آواز سنائی دے رہی تھی۔

پرویز نے دروازہ کو دھکا دیا اور غضبناک چیتے کی طرح فریدوں کو جا دبوچا۔

فریدوں اکیلا تھا۔ کمرے کا ایک دروازہ سیڑھیوں کی طرف کُھلتا تھا اور وہاں کسی عورت کے جوتے کی اونچی ایڑی کی آواز گونج رہی تھی۔

"تم بدمعاش"۔ پرویز نے غصّہ سے دانت پیستے ہوئے کہا

"بھائی خیر باشد" فریدوں نے گھبرا کر پوچھا۔

"تم کس سے باتیں کررہے تھے"۔ پرویز نے فریدوں کو گلے سے پکڑ کر کہا۔

"اپنی بیوی سے"۔ پرویز کی گرفت ڈھیلی پڑگئی۔

اتنے میں ایک خوبصورت لڑکی عروسی لباس پہنے آئی۔ اور ایک اجنبی کو دیکھ کر گھبرا گئی۔

"مسٹر پرویز بمبئی کے مشہور سوداگر........ میری بیوی شیریں"۔ فریدوں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

پرویز حیرت سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

"مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی اس نے ٹوٹتے ہوئے الفاظ میں کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ گاڑی میں سوار بمبئی جارہا تھا۔ اسٹیشن پر اُتر کر اُس نے ٹیکسی لی اور گھر آگیا۔ چاروں طرف حیرت انگیز خاموشی طاری تھی۔ اُس کی بیوی سو چکی تھی۔ نیند میں اُس کے لبوں پر تبسم

تبسم تھا۔ اور بجلی کی روشنی میں اس کے حسن کو چار چاند لگ گئے۔

"تم کہاں تھیں" پرویز نے بازو کو پیار سے تھامتے ہوئے کہا

"آج صبح مسٹر فریدوں کی شادی تھی" اُس نے مسکرا کر جواب دیا"۔ اُس نے مجھے بلا بھیجا۔ وہاں سے فارغ ہو کر میں ایک درزی کی دکان پر گئی۔ وہاں اپنے چند کپڑے درست کروائے۔ پھر مجھے جشید جی کا خیال آیا میں اُن کے گھر چلی گئی اُس کی بیوی نے بڑے تپاک سے ملاقات کی۔ وہاں جشید جی۔ ملے اور کل صبح وہ دونوں ہمارے ہاں چائے پئیں گے۔

"بہت خوب میری پیاری شکریہ مگر تم نے خادمہ کو کوئی اطلاع نہ دی" "مجھے خیال نہ رہا" فیروزہ شوہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی اور پرویز نے جھک کر اسکے گیسو چوم لئے" اب مجھے نیند آ رہی ہے" اسنے کہا اور منہ پر چادر کھینچ لی ◆

عشق

قدوس صہبائی بی۔ اے آنرز

عشق کو سمجھا ہے تو واہمۂ کائنات ؟
آ میں بتاؤں تجھے عشق کی کچھ کیفیات

عشق جہاں آفریں، عشق مکاں آفریں
عشق جہانِ حیات، عشق دوامِ حیات

عشق سے پیدا ہوئی طاقت و حرکت تمام
عشق سے حاصل ہوا ارض و سما کو ثبات

عشق سے خالی نہیں روحِ زمین و زماں
عشق کے دو رنگ ہیں دہر میں دن اور رات

عشق کی آغوش میں حسن ہوا سربلند
عشق کے آگے جھکے حسن کے لات و منات

عشق کا شعلہ بھی تو، عشق کا پروانہ تو
عشق سے تو بن گیا اشرف و اعلیٰ صفات

عشق کی رنگینیاں باعثِ تسکینِ جاں
عشق تیرا دین و دل، عشق تری کائنات

عشق غلامی نہیں، عشق ہے طاقت کا نام
حرکتِ فکر و عمل، عشق کی ہیں نفسیات

ہے جو بپا انقلاب ہے جو یہ اک زندگی
عشق کے ہیں حادثات عشق کی ہے واردات

عشق اک الہام ہے حُبِّ وطن کے لئے
عشق کی ہے بندگی، سارے جہاں کی نجات

ایک مفلس کسان

بھوکے ہندوستان کے بھوکے انسانوں کی زندگی کا مرقع

از حضرت خیر بھوروی

رات کو پچھلے پہر تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں
گنگناتا، شعر پڑھتا جا رہا تھا گاؤں میں

چھوٹے چھوٹے نرم جھونکے کیف میں ڈوبے ہوئے
چل رہے تھے ہر طرف انگڑائیاں لیتے ہوئے

درد میں ڈوبی ہوئی، کوئل کی "آوازِ حزیں"
آ رہی تھی دور سے بن کر صدائے دلنشیں

ہلکی ہلکی "مست خوشبو" سے فضا مدہوش تھی
ساری بستی نیند کی آغوش میں خاموش تھی

"جنتِ شداد" میں تھا برہمن بھی محوِ خواب
جیسے سو جائے کوئی پی کر جوانی میں شراب

تھا ابھی بوڑھا "مؤذن" بھی چٹائی پر دراز
"پنج وقتہ" جو بلایا کرتا ہے بہرِ نماز

رات بھاگی جا رہی تھی، "چاند کی چاندی" لئے
آ رہی تھیں صبح کی رنگینیاں "چھپا کئے"

اس بہارِ رنگ و بو میں ایک دیہاتی جواں
الجھے الجھے بال تھے، میلی کچیلی انگلیاں

زرد چہرہ "پر شکن" تھا جیسے مرجھایا گلاب
زندگی تھی "قصۂ غم" اور یہ عنوانِ شباب

خنکیِ بادِ سحر کی لذتوں سے بے خبر
کام میں مشغول تھا "نا آشنائے زور و زر"

اک پھٹی میلی سی دھوتی جسم سے باندھے ہوئے
ایک بوسیدہ انگوچھا سر پہ تھا ڈالے ہوئے

سر سے پا تک، ایک افلاسِ مکمل کی مثال
گوڑتا تھا کھیت، ہاتھوں میں لئے بھاری کدال

پو پھٹی اتنے میں اور آئی مؤذن کی صدا
برہمن بھی جاگ اٹھا انگڑائیاں لیتا ہوا

لے کے اک لمبی جمائی "کھیت سے نکلا جواں
آسماں کا رنگ دیکھا ہونٹ پر پھیری زباں

آ کے بیٹھا مینڈھ پر ڈبیہ نکالی "ٹینٹ" سے || گرد جھاڑی دست و پا سے اور مٹی "بینٹ" سے

کھا کے "سُرتی" لیکے دَم جب اُٹھ کے وہ چلنے لگا
اضطراری کیفیت میں اس سے میں نے یہ کہا

"عیش" سے نا آشنا اے غم کی تصویرِ جلی! || اے سراپا یاس و حسرت اے مجسم بیکلی.
صبح کی یہ مستیاں، یہ صبح کی مستی بہار! || نیند کے ماتے! تری آنکھوں میں یہ غم کا خمار
یہ ترے کمزور کندھے اور یہ بارِ گراں! || گھر کہاں ہے؟ نام کیا ہے؟ اور رہتا ہے کہاں؟
صبح کیا ہے، شام کیا ہے اس کا بھی احساس ہے؟ || کچھ جوانی کی بہاروں کا بھی تجھکو پاس ہے؟

سُن کے یہ باتیں مری، مجھسے ہوا یوں ہمکلام
میں ہوں اک مفلس کساں اور نام ہے میرا "غلام"

ہے یہی ہندوستاں میرا وطن میرا مکاں || جس کو دنیا کہتی تھی پہلے کبھی جنت نشاں"
جو کبھی آزاد تھا اور مالکِ گنج و ہنر" || جس میں ارجن نے کبھی توڑے تھے شیروں کے جگر"
آدم اُترے تھے یہیں بھگوان آئے تھے یہیں || کرشن نے توحید کے نغمے سنائے تھے یہیں
بھیشم نے تلوار کے جوہر دکھائے تھے یہیں || عارفانہ گیت گوتم نے بھی گائے تھے

تھا کبھی سنتے ہیں اپنا بھی یہاں پر راج پاٹ
اب تو ہم دھوبی کے کتے ہیں نہ جس کا گھر نہ گھاٹ

صبح کی انگڑائیوں کا کام کیا میرے لئے || شام کی رنگینیوں کا نام کیا میرے لئے
کھیت ہے دُنیا مری، کھیتی مرے گھر کی بہار || کھیت میری زندگی ہے، کھیت ہے میرا وقار
صبح کی یہ مستیاں اور شام کی رنگینیاں || عشرتوں کی خوابگاہیں نخوتوں کی کوٹھیاں
حسن کی رعنائیاں اور شوق کی گستاخیاں || عشق کی مجبوریاں، محرومیاں، ناکامیاں
کھیت ہی کے دم سے قائم ہے یہ رنگِ بہار || ہے اسی کے بل سے زندہ عزتِ سرمایہ دار

یہ نہ ہو تو ڈوب جائے آبرو سرکار کی
رونقیں خاموش ہو جائیں سمندر پار کی

درۂ خیبر
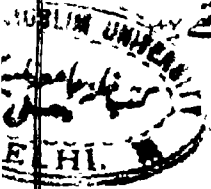
خالدہ ادیب خانم کے تاثرات

پشاور پہنچنے سے گھنٹوں پیشتر لبعان کے دل میں بلندیوں کے خیالات گشت کرنے لگتے ہیں۔ ہندوستان میں سردی کی کیفیت خواہ کانپنے تک نوبت پہنچ جائے بڑی پُرلطف ہوتی ہے۔ طلوع آفتاب سے پہلے کا منظر ٹرین سے دیکھ کر مجھے بے ساختہ اناطولیہ کا میدان مرتفع یاد آگیا خشک بھورے رنگ کی زمین اور ایک حد تک ناہموار ٹرین کے اسٹیشن سے روانہ ہوتے ہی مسافروں کو پریڈ کرتے ہوئے سپاہی نظر آنے لگتے ہیں جو سپاہی مارچ کر رہے تھے۔ ان کے خط و خال میں کوہستانی پس منظر کی بعض صفات مشترک نظر آتی تھیں۔ وہ وجیہ شکیل اور تنومند تھے۔ میں نے پہلی ہی نظر میں ان سرحدیوں کو شناخت کر لیا کہ فرزندانِ کوہ ہیں۔ ان کے چہرہ پر نظر پڑتے ہی یہ رائے قائم کرنی پڑتی ہے کہ یہ لوگ صرف ایک ہی خیال و دماغ رکھنے اور ایک ہی نصب العین کے لئے کوشش کرنے کے عادی ہیں جیسا کہ نوع انسانی کی اکثر نسلوں میں بہادر افراد ہوا کرتے ہیں۔ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ میدانی علاقوں کے لوگ یہ خیال کریں۔ کہ سرحدیوں کا انداز قائدانہ ہوتا ہے ممکن ہے یہ سادگی پسند اور سادہ ذہنیت رکھنے والے ہندوستان اور دنیا کے معاملات کو ایک حل نہ ہونے والے چیستان خیال کریں۔ لیکن یہ سیدھے سادے کوہستانی لوگ تیزی سے معاملات کا فیصلہ کرنے اور قابلیت کے ساتھ جھگڑوں کو نپٹانے کے لئے تیار رہتے ہیں اور اس معاملہ میں میدانی علاقہ کے رہنے والوں سے ان کی ذہنیت بالکل متضاد واقع ہوئی ہے۔

مجھے عبدالرحمٰن مرحوم کے خاندان میں مہمانی کا شرف حاصل ہونے والا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں میزبان کے مکان پر پہنچوں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام مکین مجھ سے واقف ہیں۔ عبدالرحمٰن نے انگورہ میں مجھ سے اس مکان کا ذکر کیا تھا اور ایسے دلنشیں پیرایہ میں کیا تھا۔ کہ اس کے لڑکپن کی تصویر روز میرے نہان خانۂ دل میں موجود تھی۔ اس نے کہا تھا کہ لڑکپن میں اپنے بھائیوں کے ساتھ میری لڑائی ہو جاتی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ کوہستان کے یہ آدمی فطرتاً اطاعت پذیر نہیں ہوتے اُس نے اپنی بہنوں کا ذکر بھی شفقت آمیز لہجہ میں کیا تھا لیکن اپنی دایہ کے ذکر کے وقت اس کی آواز زیادہ نرم اور جذبات سے معمور ہو گئی تھی۔

ایک افغان خاندان

یہ مکان دو جداگانہ حصوں پر مشتمل ہے۔ لیکن ایک مربع قطعہ پر بنا ہوا ہے اور اکثر ہندوستانی مکانوں کی طرح اس کے وسط میں کشادہ صحن ہے بڑے حصے میں عورتیں رہتی ہیں۔ اور یہ چار منزلہ ہے۔

عبدالرحمٰن کا ایک بھتیجا جس کی عمر نو سال کے قریب ہے۔ مجھے بالائی منزلوں پر چڑھنے میں مدد دیا کرتا تھا میزبان نے منزل چہارم پر ایک وسیع کمرہ میرے لئے خالی کر دیا تھا۔ اس کی کھڑکیوں میں سے چاروں منزلوں کی کھڑکیوں کی روشنی رات کے وقت بڑا اچھا منظر پیش کرتی تھی۔ اور صحن اس روشنی میں ایک تاریک خلا معلوم ہوتا تھا خاندان کے تمام افراد یہاں جمع تھے۔ لڑکیاں نوجوان اور اوسط عمر کی عورتیں اور ان کے رشتہ دار سے ہماری پہلی ملاقات بہت پرتپاک تھی۔ سرحد کی عورتیں مردوں کا نقش ثانی ہیں سنجیدہ سادہ باوقار اور ہمیشہ اپنے جذبات پر قابو رکھنے والیں۔ میری حسرت دیکھ کر اُن کے دلوں میں اپنے ایک مرحوم کی یاد جن کی موت عجیب غمناک حالات میں واقع ہوئی تھی تازہ ہو گئی۔ اور رنج و غم کے جذبات اُن کے چہروں

سے صاف نظر آنے لگتے ہیں۔ اُن کی آنکھیں دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ آنسو پی جانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ چونکہ وہاں عبدالرحمٰن کو جاننے والوں میں سے میرے سوا اور کوئی موجود نہ تھا۔ اور انھیں معلوم تھا کہ ہمارے مرحوم عزیز کے مہمان کو ہمارے مرحوم عزیز کی رفاقت کا شرف حاصل رہ چکا ہے۔ اس واسطے وہ مجھے زیادہ عزت اور محبت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ ایک لفظ کہے بغیر انھوں نے مجھے اپنی بڑی بہن کا درجہ دیدیا۔

عبدالرحمٰن کی سب سے چھوٹی بہن جو بڑی روانی اور فصاحت کے ساتھ انگریزی بولتی تھی، میرے آرام اور آسائش کی ذمہ دار بنی۔ وہ میرے کمرہ میں دبے پاؤں پھرتی اور چیزوں کو ترتیب کے ساتھ رکھتی۔ مشرق میں ایک خاندان میں بڑے خواہ کتنے ہی ہوں، لیکن بڑوں کی خدمت چھوٹے ہی خوب کرتے ہیں۔ اس لڑکی کو غالباً نو عمری کی بنا پر پشاور سے عبدالرحمٰن کا جانا یاد نہ ہو تاہم اس نے اپنے دل میں عبدالرحمٰن کی یاد کو عزت اور عظمت کے ساتھ تازہ رکھا اور یہ لڑکی احساس اور تاثر کا عجیب مجموعہ تھی، اور کئی زبانیں بڑی فصاحت کے ساتھ بولتی تھی یعنی انگریزی۔ اردو فارسی اور پشتو جو اُس کی مادری زبان ہے اور فارسی میں نظم کہنے پر بھی قادر ہے۔ حالانکہ عام طور پر ایک بست سالہ لڑکی سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس کا نام ناز پرور ہے۔ اُس کے ہر لفظ اور ہر انداز سے تمکنت اور وقار کی ایک عجیب شان مترشح ہوتی ہے۔ موزوں قامت۔ مناسب اعضا اور شربتی رنگ کی آنکھیں سیاہ اور ملائم زلفیں اُس کی بلند اور سفید پیشانی کو زینت دے رہے ہیں۔

مشرقی رواج

ہر رات کو جبکہ میں سونے کے لئے اپنے بستر پر جاتی اور ہر صبح جبکہ میں سو کر اٹھتی ناز پرور میرے بستر کے قریب ہوتی اور کہتی اگر ارشاد ہو تو میں آپ کے پاؤں داب دوں میں کبھی اپنے پاؤں دبوانا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اس سوال سے وہ اخلاص ظاہر ہوتا جس سے چھوٹے اپنے بڑوں کی خدمت کرتے ہیں۔ میں نے اپنے کمرہ میں کئی بار ایک دراز قامت ادھیڑ عمر کی عورت کو سیاہ لباس میں سنگھار کی میز کے قریب کھڑے اپنی طرف یا آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا۔ عبدالرحمٰن کے ساتھ صورتاً اس کو بڑی مشابہت تھی۔ وہی سفید رنگ، وہی خد و خال جن سے طاقت اور احساس بیک وقت معلوم ہوتا ہے۔ اُس نے مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں کی۔ ایک روز میں نے پوچھا ناز پرور یہ کون ہے۔ اُس نے بتایا کہ یہ عبدالرحمٰن کی دایہ ہے۔ یہی وہ عورت ہے جس کی یاد کو عبدالرحمٰن گمشدہ کی مشکل مہمات میں اپنے دل کیساتھ وابستہ رکھتا تھا۔ درحقیقت وہ مجھے ایک متحرک مزار معلوم ہوتی تھی۔ اور جب میں اُس کے قریب پہنچی تو وہ کمرے سے نکل گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک سیلاب تھا جو اُمڈ کر آیا اور کوئی شخص اس کو نہ دیکھ سکا۔ چلنے کی حالت میں اس کی ٹانگیں اُلجھتی تھیں۔ ٹانگوں کے اُلجھنے سے میں نے یہ سمجھا کہ اس قوی جسم کے اندر ایک نرم اور جذبات سے مغلوب ہونے والی روح موجود ہے۔ جو چٹان جیسے جسم کو لرزاں کر رہی ہے۔

دوسرا مکان

زنانہ مکان کے قریب ایک دومنزلہ مکان بھی تھا۔ اس کا صحن زیادہ کشادہ تھا۔ اور صحن میں پھلواری کے گملے رکھے ہوئے تھے۔ اس کا راستہ زنانہ مکان کے دروازے کے قریب سے جاتا تھا۔ دوسرے بھائی مکان پر موجود نہ تھے اُن کی غیر موجودگی میں ایک بست سالہ نوجوان یونس نے میری میزبانی کے فرائض انجام دیئے یہ خوش خلق اور کشادہ پیشانی مستعد نوجوان تھا۔ اور اُس کی آنکھوں میں ہر وقت ایک مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ درحقیقت میرے اصل میزبان سر عبدالقیوم تھے۔ اس لئے کہ میں انہیں کی دعوت پر پشاور اور اسلامیہ کالج میں تقریر کرنے کے لئے آئی تھی۔ سر عبدالقیوم پشاور کی آئین پسند لبرل اور حامیانِ حکومت کے نمائندے تھے۔ جیسا کہ خان عبدالغفار سرخپوشوں اور انقلاب پسندوں کے نمائندے ہیں۔ سرحد کو دوسرے مقامات سے تمیز کرانے والی اگر کوئی چیز ہے تو وہ یہ کہ باوجود تمام اختلافات کے وہ ایک عجیب یکسانیت اور یگانگت رکھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ دونوں فرزندانِ سرحد ہیں [illegible] سرحد ہی میں ہے کہ ایک جماعت دوسری جماعت کے خلاف ناخوشگوار اور لغو افسانے بیان نہیں کرتی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی معاملہ پر لڑ پڑیں اور لڑائی ایک خوفناک صورت اختیار کر جائے لیکن جب کسی اجنبی کا مقابلہ ہوگا۔ تمام جماعتیں متحد ہو کر سامنے آجائیں گی۔ یہ یگانگت صرف مسلمانوں کی باہمی نہیں ہے۔ جو ۹۲ فیصدی ہیں۔ بلکہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے

درمیان بھی ہے جو ۹ فیصدی ہیں۔ آخر الذکر میں زیادہ تر ساہوکار ہیں ہندوستان
کے دوسرے حصوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے ساہوکاروں کا ذکر
نفرت و حقارت سے کیا۔ البتہ پشاور میں میں نے سنا کہ لوگ مہاجنوں کا نام
بھی قدر سے احترام سے لیتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ جس قوم نے بنکنگ میں
ترقی نہ کی ہو۔ وہاں ساہوکاروں کا وجود مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ پٹھان
بعض اوقات خوش مزاجی سے یہ کہتے ہیں۔ کہ اگر روپیہ دینے والے نہ ہوں تو
وہ لوگ کہاں جائیں جنھیں روپیہ کی ضرورت ہے۔ لوگوں کو ہمیشہ قرض لینے کی
عادت ہو یا نہ ہو۔ یہ بات یقینی ہے۔ کہ ہندو مہاجنوں کے لئے سینہ سپر
ہو جاتے ہیں۔ اہل پشاور سے ملاقات اور گفتگو کرنے کے بعد میں نے
سمجھا کہ کیوں مہاتما گاندھی اپنے دل میں اُن کی محبت رکھتے ہیں۔ اگرچہ اُن
سے ملنے کی اجازت نہیں ہیں نے سمجھا کہ کیوں انگریز پٹھانوں کو پسند
کرتے ہیں۔ اگرچہ سرحدی گورنری مشکل ترین کام ہے۔ میں نے دیکھا کہ اہل
سرحد میں ایک خاص حقیقت پسندی ہے جس سے وہ خاص صورت حال کا
مقابلہ کرتے ہیں۔ اور مقابلہ کا فیصلہ کرنے کے بعد شکوہ سنجی کے بغیر اپنی
روش پر قائم اور اپنے ارادہ پر مستقل رہتے ہیں۔ سرحد ہی وہ مقام ہے
جہاں کوئی شخص خود مختاری اور مستقبل کی آزادی کا ذکر نہیں کرتا۔ اس کے
باوجود ہر شخص کاملاً آزاد معلوم ہوتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی شخص
پٹھانوں کو پابہ زنجیر بھی دیکھے گا تو بھی اس کے تاثرات یہی ہوں گے۔

پٹھان بحالت قید بھی آزاد رہتا ہے،

مردانہ کمرے کا ڈرائنگ روم بہت شاندار اور یوروپین طریق
پر آراستہ ہے۔

عبد القیوم :

سر عبد القیوم اکثر اوقات مکان میں رہتے تھے۔ لوگ اُن کی عمر ستر کے
کے قریب بتاتے۔ لیکن اس پر یقین کرنا مشکل ہے۔ ان کا قد بہت اچھا اور
ڈاڑھی کے بال بالکل سیاہ تھے۔ چہرہ پر جھریوں کا کوئی اثر نہ تھا۔ چہرے
کی اس ہمواری کے باوجود خیال نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ انھوں نے کسی محنت و
مشقت کے بغیر اپنی زندگی راحت و آرام سے گزاری ہے۔ وہ اپنی کرسی پر
باز کی طرح بیٹھتے تھے۔ اور یہ نہیں معلوم ہو سکتا تھا۔ کہ کس وقت یہ قائد
کسی خاص سمت کو روانہ ہو جائیں گے۔ اُن کی آواز میں ایک خاص گونج تھی
لیکن کلام مختصر ہوتا تھا۔ ہم ابھی قبائل سرحد کا ذکر کر رہے تھے جو آزاد
علاقے میں بود و باش رکھتے تھے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ان میں سے بعض قبائل
کی قیادت سر عبد القیوم کرتے ہیں۔ ہم اُن کی زمین کے بند و بست پر بحث
کر رہے تھے اور یہ ذکر تھا۔ کہ زمین ہر پانچ سال کے بعد از سر نو تقسیم
کی جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بعض اشخاص بطور وراثت بہت زیادہ زمین
حاصل کر لیتے ہیں، اور بعض کے قبضہ سے زمین نکل جاتی ہے بہرحال اس
اصول کا مقصود یہ ہے کہ قبضہ اراضی میں ایک طرح کا توازن قائم رہے
چنانچہ پانچسال کے بعد بزرگان قبیلہ جمع ہوتے ہیں اور بشرط ضرورت
مختلف خاندانوں میں مساوی رقبہ کے قطعات از سر نو تقسیم کر دیتے ہیں۔

سر عبد القیوم نے کہا کہ قبائل کا طریق نظم و نسق زیادہ دلچسپ
ہے۔ اس سلسلہ میں آپ نے بیان کیا کہ کس طرح یہ لوگ پولیس کے بغیر
امن و امان قائم رکھتے ہیں۔ اور کس طرح لوگ اخلاق اور ضابطے کا احترام
کرتے ہیں۔ جو اُن کے درمیان فیصل ہو چکا ہے اور تسلیم کر لیا گیا ہے۔
میرے نزدیک اُن کے تمام معاہدے میثاق شرفا ہوتے ہیں۔ یعنی
کاغذ پر تحریر نہیں کئے جاتے۔ اگر کسی شخص کو کسی سردار کے علاقہ سے
گذرنا ہو تو وہ پورے طور پر محفوظ رہے گا۔ جن قبائل کے درمیان صلح
ہو اُن کے علاقوں سے گزرنے والے اشخاص کو کسی قسم کا خطرہ نہیں
بحالت صلح اور بصورت جنگ اُن کی حکمت عملی بیان اور صداقت پر مبنی ہوتی
ہے۔ جیسے جس کے تعلقات ہوں ویسے ہی کوئی شخص اپنی حالت کو محفوظ
کر سکتا ہے۔

ایک دلچسپ سوال !

شام کے وقت اسلامیہ کالج پشاور کے پرنسپل ڈاکٹر ہولڈ نز
ورتھ بھی گفتگو میں شریک تھے۔ انھوں نے پوچھا۔

"خان صاحب۔ اگر میں کسی قبیلے کے علاقہ سے گزروں تو کیا میری
جان محفوظ رہے گی؟"

سر عبد القیوم نے جواب دیا

"یہ اس امر پر موقوف ہے کہ آپ وہاں کس حیثیت سے گزرتے ہیں۔"

نیز اس تعلق پر بھی موقوف ہے جو اس خاص قبیلہ کا انگریزوں کے ساتھ ہو جنگ کریمیا کے ایام میں جبکہ انگریز عالم اسلام کے دوست سمجھے جاتے تھے۔ ہر ایک قبیلہ کے علاقے سے پوری حفاظت کے ساتھ گزر سکتے تھے آپ اسلامیہ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے جس علاقہ سے گزرنا چاہیں گزر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ لوگ آپ کو پہچانتے ہوں"

اس پر دونوں مسکرائے دونوں کی مسرت کی وجہ غالباً مختلف تھی۔ یہ بات ظاہر ہے کہ قبائل کے سیدھے سادے لوگ اسلامیہ کالج کی بہت زیادہ وقعت کرتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ کالج کی زمین پر افراد قبائل کے نقش پا دیکھے گئے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ کثیر تعداد میں آتے ہیں۔ اور رات کے وقت آتے ہیں اس کے باوجود اس سرزمین پر اگر دشمنوں کو ملنے کا اتفاق ہوگا۔ تو ایک دوسرے پر فائر نہیں کریں گے اس لئے کہ وہ متارکہ کی مقدس سرزمین ہے۔

مجھے یہ دونوں اشخاص اور اُن کی باتیں یاد ہیں۔ ایک طرف سر عبدالقیوم سیاہ کوٹ پہنے ہوئے اور سفید پگڑی باندھے ہوئے دوسری طرف ڈاکٹر ہولڈز ورتھ اپنے سادہ یوروپین فیشن میں اول الذکر صرف چند قبائل کے نمائندے تھے اور آخر الذکر عہد حاضر کے طاقتور ترین سلطنت کے نمائندے تھے لیکن اس کے باوجود کسی طرف احساس کمتری یا بہتری موجود نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ دونوں مساوات انسانی سے واقف ہیں اور وہ یہ ایک دوسرے کے ہمسر ہیں۔ اور یہ انگریزوں کی مردم شناسی کی ایک دلیل ہے۔ کہ انھوں نے سرحد میں مسلسل مشکلات کے بغیر اس سے بہتر اور کوئی روش نہیں دیکھی۔

ڈاکٹر ہولڈز ورتھ اگرچہ نسبتاً جوان ہیں لیکن امور تعلیم میں غیر معمولی مہارت رکھتے ہیں ان میں وہ تمام حسنات موجود ہیں جو ایک اچھے انگریز میں ہو سکتی ہیں۔ وہ سیاسی عقائد کے لحاظ سے سوشلسٹ ہیں انھیں گفتگو کرنے میں خاص لطف آتا ہے اور اچھے اخلاق اور فقید المثال ذہنی قابلیتوں کے مالک ہیں۔ ایک ہزار سرحدی نوجوانوں پر ان کا جو اقتدار ہے وہ انھی اخلاقی اوصاف کی بنا پر ہے میں نے کالج کی تقریبات میں انہیں صدارت کرتے دیکھا اور مخالف ضیافتوں اور دعوتوں میں بھی دیکھا ہے۔ جہاں ان کا احترام کیا جاتا ہے اور دوست سمجھا جاتا ہے۔ ہر موقعہ پر یہ دیکھا کہ لوگوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے وہی طریق کار اختیار کرتے جو حالات کے موافق ہو۔

ایک تبدیلی

میں پشاور میں تین راتیں اور دو دن ٹھہری لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ عرصہ تک پشاوریوں میں رہی ہوں اور جیسے کہ وہ لوگ میرے ہی ملک کے رہنے والے ہیں خصوصاً ہر وہ لمحہ جو یونس کے کمرے میں جمع ہو کر باتیں کرنے میں گذرتا نہایت پرلطف ہوتا اور سرحدی لوگوں کے اخلاق کا پورا آئینہ دار ہوتا۔ کمرہ علاوہ خاندان کے افراد کے دیگر ادھیڑ عمر اور نوجوان اصحاب سے پُر ہوتا۔ اکثر نوجوان یورپین لباس پہنتے لیکن خاص موقعوں پر وہ ہیٹ کی بجائے لنگی باندھتے۔ عمر رسیدہ اصحاب نیلے رنگ کی پشاوری لنگی، شلوار اور ڈھیلا کوٹ پہنتے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ وہ ظاہری لباس کو اتنی اہمیت نہیں دیتے۔ کیونکہ ایک نوجوان ہندوستانی جس نے یورپین لباس پہن رکھا ہو۔ اس پر ہندوستان کے دیگر صوبوں میں نکتہ چینی کی جاتی ہے لیکن یہاں اس کی پرواہ نہیں کی جاتی۔

نوجوان عمر رسیدہ اصحاب کی موجودگی میں اس وقت تک نہیں بولتے جب تک کہ انھیں مخاطب نہ کیا جائے۔ لیکن جب سر عبدالقیوم چلے گئے تو میں نے دیکھا کہ ہر شخص ہر مسئلہ پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہے۔ یہاں میں اس امر کی وضاحت کر دینا چاہتی ہوں کہ کسی شخص کو کسی خاص غیر ملکی فرد کو تمام قوم کے عادات و اطوار کا نمائندہ نہ سمجھ لینا چاہئے۔ یہ سب نوجوان عبدالرحمٰن کے دوست تھے۔ اگرچہ بہت سی باتیں ایسی ہیں جو عبدالرحمٰن میں اسی درجہ تک موجود تھیں جس درجہ تک کہ ان سب نوجوانوں میں۔ لیکن وہ ایک طرح سے یو۔ پی کے لوگوں سے قریب تر تھے۔ وہ ہمیشہ مذہب پر تبصرہ کیا کرتے تھے۔ اور ہر چیز کو اس کی روشنی میں دیکھتے تھے اگرچہ ہر وہ پشاوری جس سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوا، خواہ وہ تعلیم یافتہ ہو یا غیر تعلیمیافتہ وہ پکا مسلمان ہوتا اور مذہب پر کبھی تبصرہ نہ کرتا۔ مجھے کھانا مردانے میں کھلایا جاتا۔ ہر کھانے میں قریباً بیس اصحاب ضرور شامل ہوتے خادم تولیہ اور برتن لیکر کھڑا ہوتا اور ہر شخص کے ہاتھوں پر پانی ڈالتا کیونکہ کھانے کے کمرے میں جانے سے پہلے سب لوگ ہاتھ دھو لیتے بعض کانٹوں سے کھاتے اور بعض ہاتھوں سے۔ لباس کی طرح کھانے کا طریقہ بھی

ہر شخص کے انتخاب پر چھوڑ دیا جاتا۔

میرے نزدیک ہمیشہ ایک ہر دلعزیز سفید ریش بڑھا بیٹھا تھا۔ جس کی آنکھوں میں محبت اور مہربانی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ وہ ایک مقامی روزنامہ کا ایڈیٹر تھا۔ اگرچہ وہ سب حاضرین سے بوڑھا تھا۔ لیکن اس کا دل نوجوانوں جیسا تھا۔ اور وہ حالات حاضرہ پر نہایت دلچسپی سے تبصرہ کرتا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ عورتوں کو اُن کے حقوق دلانے کی مہم شروع کرنے والا ہے اور اس کے الفاظ سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ درحقیقت بعض معاشرتی تجربات کی کامیابی کو مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے۔

درۂ خیبر

یونس اور اس کے دو دوست مجھے درۂ خیبر دکھانے کے لئے لے گئے۔ پشاوریوں کے نزدیک یہ جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اسی راستہ سے فاتح افواج داخل ہوئیں اور ہندوستان میں تغیر پیدا کر دیا۔ درۂ خیبر کی یاد کے ساتھ ایک ننھی افریدی لڑکی کی یاد وابستہ ہے۔ یہ کُل چار بچے تھے۔ ایک لڑکی اور تین لڑکے جو گاڑیوں کے پیچھے بھاگتے اور بھیک مانگتے تھے ہماری موٹر کار کو پنکچر کی وجہ سے ٹھہرنا پڑا۔ میرا ایک ہمراہی اس کو پکڑ لایا۔ باقی تین بچے آہستہ آہستہ اُس کے پیچھے آرہے تھے۔ وہ ننگے جسموں پر ڈھیلے چغے سے پہنے ہوئے تھے۔ اور لباس کے سوراخوں میں سے اُن کا بھٹ سا جسم دکھائی دیتا تھا۔ اُن کے جسم پر بے انداز گرد پڑی ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ جب سے وہ پیدا ہوئے ہیں۔ اُن کے منہ نہیں دھوئے گئے۔

"ننھے آفریدی سے ملئے" میرے ہمراہی نے کہا۔ اور اُس لڑکی نے منہ اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ پُرانے یونانی دور کا ایک ننھا شاہکار جو ہزاروں سال تک زمین میں دبا رہا ہو۔ مجھے دستیاب ہو گیا میری زبردست خواہش تھی کہ میں اسے گرم پانی سے اچھی طرح نہلا کر دیکھوں کہ نیچے کیا ہے۔ لیکن جو کچھ بھی مٹی کی تہ میں سے نظر آیا۔ وہ یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی تھا۔ کہ ابھی قدرت کیا کچھ کر سکتی ہے۔ نیلی خوبصورت آنکھیں لمبے اور گھنے سیاہ پپوٹے ایک مکمل ننھی ناک اور بڑی نزاکت سے گھڑی ہوئی ٹھوڑی اور رخسار۔ اُلجھے ہوئے بال مٹی کی تہ میں سے بھی سنہری جھلک دیتے تھے۔ لڑکے جو پیچھے ہاتھ پھیلائے کھڑے تھے۔ اُتنے ہی خوبصورت تھے۔ میرے ہمراہی سوا اُس کے نام کے سوائے اور کچھ نہ معلوم کر سکے۔ اس کا نام کیوسر تھا۔ اگرچہ اُنھوں نے پیسے دیئے اور پیار بھی کیا۔ لیکن اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار نہ ہوئی۔ وہ ہر چہرے کو دیکھتی لیکن اپنے خیالات دل ہی دل میں رکھتی۔ اور اگر کسی کو ہاتھی دانت کے سے سفید ننھے دانت نظر آجاتے تو اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ وہ ہنستی تھی۔ یہ ایک ننھے جانور کی سی ہیئت رکھتی تھی۔ جسے پالنا انتہائی مشکل ہو۔

میں سمجھتی ہوں کہ آفریدی جنگلی آدمی ہیں۔ اور یہ بچے دنیا میں آکر ایسی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جیسے باغ میں پھول۔

ایک دیہاتی گھر

واپسی پر ہم دیہات میں سے گذرے۔ یہ سب مسلمانوں کے گاؤں تھے۔ مکانوں کی وسعت اور مقابلتاً صاف ستھرے بازاروں نے مجھ پر بڑا اثر کیا۔ میں نے ایک مکان کو اندر سے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور ہم سب بڑے مکان کے پاس رُک گئے۔ ہم اندر داخل ہوئے تو اپنے آپ کو ایک وسیع صحن میں پایا۔ اُس کے مالک نے خندہ پیشانی سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ وہ گاؤں کے بزرگوں میں سے تھا۔ اور ہمیں گھر کے سامنے کرسیوں پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ اس حصہ کو زنانہ سے ایک بلند دیوار جدا کرتی تھی۔ میرے ہمراہیوں نے اس سے کہا کہ میرا ارادہ عورتوں سے ملاقات کا ہے۔ چنانچہ ہم اس بلند دیوار میں ایک دروازے کی جانب چلے یہ پہلے ہی نصف کھلا ہوا تھا۔ اور ایک نقاب پوش عورت اس میں سے جھانک رہی تھی۔ بوڑھے اور عورت میں پشتو میں کچھ باتیں ہو رہی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ عورت کو بتایا گیا۔ کہ یہ ایک دور دراز ملک کی رہنے والی مسلمان عورت ہے۔ جو مکان دیکھنے کی خواہش رکھتی ہے۔ اس نے فوراً دروازہ کھول دیا اور اشارے سے مجھے اندر آنے کو کہا۔

اندر کا صحن بڑا تھا۔ اور اس کے ایک طرف ایک منزلہ مکان بنا تھا۔ مکان کے تمام دروازے ایک برآمدے میں کھلتے تھے۔ اس میں نوجوان عورتیں بھی تھیں۔ اور ایک عمر رسیدہ عورت بھی تھی۔ جو غالباً ان کی والدہ تھی۔ یہ ایک دلچسپ نظارہ تھا۔ ہم اشاروں سے باتیں کرتے تھے۔ اور میں حیران تھی۔ کہ الفاظ کے بغیر بھی کتنی باتیں ہو سکتی

ہیں میں نے دیکھا اور فاتحانہ انداز میں مسکرائی۔ وہ سب آپس میں باتیں کرتی تھیں اور میرے کندھوں پر ہاتھ پھیرتی تھیں۔ گویا وہ میری وجہ سے بہت خوش تھیں۔ مکان کا تمام اندرونی حصہ خوشگوار تھا۔ اور ایک دیہات کا آرام دہ خوشحال افراد کا مملوکہ مکان معلوم ہوتا تھا۔ ان کے پاس ایک سنگر سلائی کی مشین بھی تھی۔

میری میزبانوں نے ہاتھ ملنے شروع کئے جس سے یہ ظاہر کیا۔ کہ اب اور کوئی چیز دکھانے کی نہیں رہ گئی۔ پھر ان میں سے ایک عورت کرسی لائی اور میں اس پر بیٹھ گئی۔ ایک ایسے انداز میں آئی۔ گویا ایک پلیٹ اٹھائے ہوئے ہے۔ پھر تینوں نے اپنے ہونٹوں کو اس طرح ہلانا شروع کیا۔ گویا وہ چائے کی طرز کی کوئی چیز پی رہی ہیں۔ پھر سب نے مل کر کہا "چائے" اس کا مطلب یہ تھا کہ میں وہاں بیٹھ جاؤں اور اُن کے ساتھ مل کر چائے پیوں اور ساتھ کچھ کھاؤں۔ میں جانتی ہوں کہ دیہاتی اپنے مہمانوں کو کھلانے پلانے کا کتنا خیال رکھتے ہیں لیکن میں نے اپنی گھڑی پر دیکھا۔ اور محسوس کیا۔ کہ مجھے فوراً روانہ ہو جانا چاہئے۔ کیونکہ مجھے اسلامیہ کالج میں کھانا کھانا تھا۔ دو لیکچر دینے تھے۔ ایک گارڈن پارٹی میں شامل ہونا تھا اور پردہ دار عورتوں کے کئی جلسوں میں شرکت کرنا تھی۔ میں نے "سکول" اور "عورتوں" کے دو الفاظ سے اپنی مصروفیت اُن پر واضح کر کے اُن سے رخصت لی۔ وہ تمام مردانہ کے صحن میں کھلنے والے دروازے کے پاس کھڑی ہوگئیں اور مجھے الوداع کہا +

نکاتِ معرفت

از حضرت کوکب شاہجہانپوری

دوزخ بھی یہیں ہے تری جنت بھی یہیں ہے
اے دوست مسلماں کی دُنیا بھی تو دیں ہے

ہر کام کا آغاز ہے آئینۂ انجام
دُنیا میں اگر حُسن ہے عقبےٰ بھی حسیں ہے

دل چاہیئے ایمان سے معمور و منوّر
جس سجدہ میں یہ روح نہیں داغِ جبیں ہے

ہر ذرّۂ ناچیز ہے خورشید بآغوش
کہتے ہیں زمیں جسکو وہی عرشِ بریں ہے

ہے خدمتِ مخلوق ہی خالق کی عبادت
اللہ کسی چیز کا محتاج نہیں ہے

حقائق وبصائر

حضرت علامہ امجد حیدرآبادی

یہ گل و غنچہ، یہ سبزہ، یہ فضا کچھ بھی نہیں
اپنے دل کے آگے باغ دلکشا کچھ بھی نہیں

اہل دولت کیلئے تیری سوا ہر چیز ہے
ہم غریبوں کے یہاں تیرے سوا کچھ بھی نہیں

دست قدرت میں ترے کیا کچھ نہیں ہے ای کریم
ہاتھ میں ہم بیکسوں کے جز دعا کچھ بھی نہیں

کون ہے پورا ہوا دنیا میں جس کا مدعا
شکر کی جا ہے کہ اپنا مدعا کچھ بھی نہیں

کیا بتائیں کیا ہیں ہم اول عدم آخر عدم
ابتدا کچھ بھی نہیں ہے انتہا کچھ بھی نہیں

مادیت کی فضا میں روح کی سنتا ہے کون
جب چلے صرصر تو پھر باد صبا کچھ بھی نہیں

آج جو آیا ہے امجد کل وہ جائیگا ضرور
جس کو تو اپنا سمجھتا ہے ترا کچھ بھی نہیں

رباعی

دنیا والو! ثبات دنیا میں نہیں
اک لحظہ قرار موج دریا میں نہیں

عالم کا وجود صورتاً سمجھو
لفظاً موجود اور معنی میں نہیں

مادومی

خدمت وطن کیلئے ایک روسی دوشیزہ کی قربانی

از جناب سید شمیم عزمی صاحب الہ آبادی

۱۔ محبت کی ابتداء

ماسکو کے شاہی محل سے تین میل جنوب میں تعمیر شدہ "یادگار منت" مسیحی معبد کے شکستہ احاطہ گورستان کی ہیئت کذائی۔ اس وقت بھی کسی قدر خوفناک اور عبرت خیز ضرور تھی لیکن غروب آفتاب کے بعد تو یہ ایک خوفناک ترین چیز بن گئی۔ سرد ممالک کے آفتاب کی مانند یہاں بھی سورج کی تپش ایک سرور کن چیز تھی جو آدمی کو سردی کے کاہل ساز اثرات سے محفوظ رکھ کر ایک گونہ فرحت اور چستی بخشتی ہے۔ لیکن اب ——
جبکہ آفتاب کی تمازت پر گہر و تاریکی کی مشترکہ حملہ آوری کا خطرہ دم بدم بڑھ رہا تھا۔ خنکی میں بھی دن کی نسبت نمایاں اضافہ ہو چکا تھا چرچ یارڈ کی سبز کائی سے ڈھکی ہوئی کہنہ دیواریں غروب ہونے والے آفتاب کی کرنوں سے چمک رہی تھیں جن کے اندر شکستہ قبروں کی بے ترتیبی اور خود رو سبزے کا تنوع ایک ہیبتناک منظر تھا۔ لیکن مادومی اور ٹرانسکی کے لئے نہیں۔ انھیں اپنے ماحول کی ہیبت کا مطلق احساس نہ تھا۔ بالکل خبر نہ تھی ٹرانسکی صرف اتنا جانتا تھا کہ جنرل مورو گی کی حسین لڑکی مادومی نے اسے یہاں آنے کی دعوت دی ہے جو شاید کسی مزید معاہدہ کے تصفیہ کیلئے ہو جو ہماری آئندہ ازدواجی زندگی سے متعلق ہو! —— یہ بھی اس کا خیال تھا۔

جنرل مورو گی حکومت پرستوں کی انجمن کا سرگرم کارکن تھا لیکن اُس کی بیٹی مادومی پرلے درجہ کی انقلابی۔ اور یہی سبب مادومی اور ٹرانسکی کی دوستی کا تھا۔ ٹرانسکی ماسکو یونیورسٹی کا ایک ذہین لیکن "باغی" طالب علم تھا۔ گذشتہ موسم سرما میں جب یونیورسٹی کے آزاد خیال طلباء کی ایک پارٹی انقلاب پسندوں کی جماعت میں شریک ہوئی تو ٹرانسکی ان سب میں پیش پیش تھا۔ اور اسی جگہ مادومی سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی۔ گو یہ تعجب خیز ضرور ہے کہ ایک کٹر حکومت پرست کی لڑکی انقلابی ہو لیکن روس کا وہ دور اختلاف خیال کا ایک یادگار زمانہ ہے جس میں ایک ہی خاندان کے متعدد افراد کا حامی حکومت و ملوکیت اور متعدد کا اشتراکیت پسند ہونا ذرا بھی عجیب نہ تھا۔

مادومی اور ٹرانسکی دونوں انقلابی تھے۔ لیکن اس پر بھی بعض اصولوں پر ان میں اختلاف تھا۔ مادومی بہت زیادہ انتہا پسند تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ حکومت کی سخت گیری اور تشدد کی پالیسی کا جواب ہمیں بھی سختی اور اشتداد سے دینا چاہیئے۔ چاہے اس میں کتنی ہی جانوں کا خون کیوں نہ ہو؟ لیکن ٹرانسکی بحد اعتدال پسند تھا۔ اور خونریزی و سخت گیری کا بھی سخت مخالف۔ اُس کا دل غریب مزارعین اور مزدوروں کی حالت زار پر بہت کڑھتا تھا جو حکومت پرستوں اور سرمایہ داروں کے مظالم کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ وہ صرف ان کی اصلاح ہی کی خواہش کی تحریک پر انقلابیوں کی جماعت میں شریک ہوا تھا۔

اگرچہ شدید اختلافات ان دونوں میں ضرور تھے لیکن اس سے

ان کی دوستی پر کوئی ناگوار اثر نہیں پڑا۔ بلکہ رفتار زمانہ کے ساتھ ہی ساتھ ان کی دوستی اور پھر محبت باقاعدہ رابطہ ضبط کی کڑیوں سے مل کر تبدیل بہ عشق صادق ہو چکی تھی۔ حتیٰ کہ ٹرانسکی کو اپنی جرات ہو گئی کہ ایک دن اس نے مرتعش لبوں۔ ڈبڈباتی آنکھوں اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اپنی محبوبہ کو پیام مناکحت دیدیا۔

"میری جان مادومی! مجھے امید ہے کہ تم میری اس دلی خواہش اور میری زندگی کی اس واحد تمنا کو پورا کرنے میں مخل نہ کرو گی" یہ اس کے پیام کے آخری الفاظ تھے۔

حسین مادومی کا جواب سوائے ایک دلکش حسین تبسم کے کیا ہو سکتا تھا اور پھر ٹرانسکی کی مسرت کا اندازہ؟ یہ بہت مشکل ہے۔ شاید اسے اپنی تمام عمر میں اس سے زیادہ کبھی خوشی نہیں ہوئی۔ اس نے جوش مسرت سے مغلوب ہو کر مادومی کے مرمریں ہاتھوں کو چوم لیا۔ دونوں کی حسین و مخمور آنکھیں ایک ساتھ اٹھیں اور پھر نگاہوں ہی نگاہوں میں کچھ دیکھ کر ـــــ جھک گئیں ـــــ یہ محبت کی ابتدا تھی!

"پرانے گرجا کے احاطے میں غروب آفتاب سے کچھ پہلے" مادومی نے چلتے ہوئے ٹرانسکی کے کان میں آہستہ سے کہا۔ اس نے بالکل بے معنی نگاہوں سے اس کے چہرہ کو دیکھا اور خاموش ہو گیا۔ لیکن جب شام ہوئی تو وہ جائے موعودہ پر موجود تھا۔

۲۔ محبّت کی ارتقاء

"ٹرانسکی! کیا تم جانتے ہو ہماری آئندہ ازدواجی زندگی کے لئے خیالات کی ہم آہنگی کس قدر ضروری ہے" مادومی نے بغیر کسی تمہید کے سلسلۂ خموشی کو توڑا۔

"کیا مطلب ـــــ؟" ٹرانسکی کے چہرے پر بالکل یسوع کی مانند معصومیت تھی "کیا مجھے تمہارے کسی خیال سے اختلاف ہو سکتا ہے؟" اس نے مادومی کے سوال کو بالکل عجیب سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"میرا اشارہ ہمارے لائحہ عمل کی طرف ہے۔ جس پر ہمیں شادی کے بعد مزید تندہی کے ساتھ بالکل ہمہ تن ہو کر کام کرنا ہے یعنی اشتراکیت کی تبلیغ، اور اس سلسلے میں تمہیں میرا ہم اصول ہونا پڑے گا۔ کیونکہ فی الحال ہمارا مقصد زندگی صرف ملوکیت زار کا قلع قمع کرنا ہے۔ اور تم اس کے خلاف ہو۔ تمہاری خواہش صرف مزدوروں اور کسانوں کی اصلاح ہے اور گو ہمارا مقصد بھی یہی ہے لیکن ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ موجودہ حکومت کے خاتمہ سے قبل ایسا ہونا ناممکن ہے"

"لیکن ہماری شادی اور محبت سے انقلاب پسند جماعت کی اس نئی پالیسی! اور میرے خیال کی ہم آہنگی سے کیا تعلق؟" ٹرانسکی نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے مادومی کو گھورتے ہوئے کہا۔

"ہاں! لیکن میں اسے ضروری سمجھتی ہوں" مادومی نے متبسم ہو کر کہا۔ "پیارے ٹرانسکی تم جانتے ہو میں اس پالیسی کے حق میں کتنی مدت سے ہوں اور اب، جب ہماری شادی ہو جائیگی۔ تو یہ قطعی ناممکن ہے کہ تم کسی اور اصول پر چلو اور میں کسی دوسرے اصول پر۔ پھر طرّہ یہ کہ تم بھی اسی انجمن کے ہو جو میری ہم خیال ہے"

حسن کے تبسم کا جادو چل چکا تھا۔ اب بیچارے ٹرانسکی میں اختلاف خیال کی جرائت کہاں باقی رہ سکتی تھی۔ اس نے عقائد حسن کے آگے سر خم کر دیا ـــــ یہ محبت کی ارتقاء تھی!

~~~~~ (۳) ~~~~~

قصبہ سار ظلمت و خموشی کی آغوش میں خوابیدہ تھا۔ باد خنک کے تند جھونکوں کے ساتھ برف باری ایک مزید تازیانہ تھی۔

مادومی اور ٹرانسکی ٹرین سے اتر کر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے تیزی سے انقلاب پسندوں کے ایک خفیہ جلسہ میں شریک ہونے جا رہے تھے ان کے بیش قیمت سمور کے دراز کوٹ اور آگے جھکی ہوئی لمبی ٹوپیاں برف باری کی اچھی طرح شکار ہو چکی تھیں۔

قصبہ کی آخری عمارت کا خفیہ دروازہ کھلا۔ مادومی اور ٹرانسکی اندر داخل ہو گئے۔ جلسہ شروع ہو چکا تھا۔ طویل و عریض ہال میں ہزاروں انقلاب پسند سیاہ کوٹوں میں ملبوس خاموش بیٹھے بالکل بھوت معلوم ہوتے تھے۔

"بھائیو! ـــــ اب ہمیں اپنی گذشتہ مجوزہ سکیم کے ماتحت زار کے ناپاک وجود کے خاتمہ کیلئے ایک بہادر نوجوان کا انتخاب کرنا ہے" صدر نے
~~~~~

نے اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے کہا۔

سخت دشوار مہم تھی۔ کسی شخص کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ اس کام کے لئے اپنے آپ کو پیش کرتا۔ آخر مادام زدسکو نے عرصہ سکوت توڑی۔

"کیا میں امید کر سکتی ہوں کہ محترم صدر مجھے اس اہم کام کی تکمیل کا شرف عطا فرمائینگے؟"

"کیوں نہیں خاتون!" صدر نے کہا۔

"لیکن کیا یہ مناسب نہیں کہ آپ مجھے اجازت عطا فرمائیں!" ایک جوشیلے نوجوان نے کھڑے ہو کر کہا۔

"نہیں، میرے خیال میں اس کام کیلئے میں زیادہ مناسب ہوں" بوڑھے جانکی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"چہ خوب!" خاتون نے تضحیک آمیز انداز میں جواب دیا۔ "کیا سرکار کو لیڈی سارف کی عشقبازی سے فرصت مل گئی"؟

"بس چپ رہو مادام!" بوڑھے جانکی نے حقارت سے کہا۔ "کیوں میرا منہ کھلواتی ہو۔ کیا تم زار کے قتل کا اس لئے نام نہیں لے رہی ہو کہ اس بہانے سے تم کو اس حسن پرست کے ساتھ شب باشی کا اچھا موقع ہاتھ آ جائیگا جس کی تمہیں مدت سے آرزو ہے"۔

"بس بس زبان کو لگام دو" مادام زدسکو کے ایک دوست نے چلا کر کہا۔ "کیا بکتے ہو تم۔ مجھے نہیں جانتے؟"

"ہا ہا ہا! آپ بھی بولے" جانکی نے حسب عادت خوفناک قہقہے لگاتے ہوئے کہا۔ "واللہ تم بھی کس قدر خوش قسمت ہو کہ مادام زدسکو جیسی حسین خاتون تمہاری معشوقہ ہے"۔

"کیا فضول باتیں کر رہے ہیں آپ لوگ!" صدر نے جھنجھلا کر کہا۔ "بیٹھ جائیے"۔

"مگر میری سخت توہین ہوئی ہے" مادام زدسکو نے احتجاجاً کہا "میں اسے ہرگز برداشت نہیں کر سکتی"۔

"مسٹر جانکی! میں کہونگا آپ مادام زدسکو سے معافی مانگیں۔!" صدر نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔

"ہرگز نہیں! ہرگز نہیں! ایسا کہنا میری سخت توہین ہے" بوڑھے جانکی نے زور سے کہا۔ "میں ایک فاحشہ عورت سے کبھی معافی نہیں مانگ سکتا"۔

"غضب خدا کا مجھے فاحشہ کہتا ہے" مادام زدسکو نے جوش غضب سے چیخکر کہا۔ اور جوتی اتار کر جانکی کے سر پر مار دی۔

"ہا ہا ہا ہا!" سارا ہال خوفناک قہقہوں سے گونج اٹھا۔ بالآخر لوگوں نے دونوں کو سمجھا بجھا کر بٹھا دیا۔ جلسہ کی کارروائی دوبارہ شروع ہوئی۔

"میرے خیال میں قرعہ اندازی کے ذریعہ بہترین انتخاب ممکن ہے" مادومی نے کھڑے ہو کر تجویز پیش کی۔

"قرعہ اندازی ---!" تمام لوگوں نے چیخکر کہا۔ "بہترین طریقہ ہے"۔

"بہت بہتر ---!" صدر نے کہا "ہر شخص ایک چھوٹے پرزہ پر اپنا اپنا نام لکھ کر مجھے دیتا جائے"۔

تھوڑی ہی دیر میں قرعہ اندازی کا فیصلہ سنا دیا گیا ---

"سارن ٹرانسکی"

ایک لمحہ کیلئے اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ مادومی نے آہستہ سے کہا "قوم کی خدمت ہمارا اولین فرض، اس کے لئے عیش و آرام کی قربانی عین سعادت ہے"۔

"مسٹر ٹرانسکی آپ کو آج سے پانچویں دن قمری مہینے کی آخری تاریخ تاریک ترین رات کو اپنے فرض کی ادائیگی کیلئے روانہ ہو جانا ہوگا" صدر نے ٹرانسکی سے رخصتی مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

---(۴)---

"نہیں نہیں! میرے [illegible] آئی" مادومی نے جلدی جلدی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "پرنس [illegible] تے ہو۔ تم ان آنکھوں اور پریشان دلوں والا [illegible] ہوں۔ لیکن ہاں!" اس کے لبوں پر ایک نفرت انگیز اور دردناک [illegible] تھا۔ "لیکن ہاں! اس کی قیمت بھی اسے بہت زیادہ مل چکی ہے"۔ اس کا چہرہ کسی خیال سے غمگین ہو گیا۔

"میری جان!" ٹرانسکی نے پوری بات سننے بغیر کہا۔ "تم نے بڑا کام کیا۔ محلات کے خفیہ راستوں کے نقشہ بغیر میں کچھ نہ کر سکتا"۔

مادومی کے خشک لبوں پر ایک غمناک تبسم تھا۔ ایسا بھیانک تبسم جس میں دل میں چھپی ہوئی کسک اور سوزش کی چنگاریاں رقص کر رہی

تھیں۔ "کون جانتا ہے؟" اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے خیال کیا۔ "آہ! کون جانتا ہے کہ مجھے اس خفیہ نقشہ کی کتنی بڑی قیمت دینی پڑی" اس کا سر خود بخود نیچے جھک گیا۔

"پیاری مادومی! آؤ ہم آخری مرتبہ رخصت ہولیں۔ آہ! معلوم ہم پھر کبھی مل سکیں گے یا نہیں؟"

مادومی جیسے گہرے خواب سے چونک پڑی۔ "اوہو! ہاں آفتاب ہوئے کافی دیر ہو چکی۔ جاؤ پیارے ٹراٹسکی! خداوند یسوع مسیح تمہاری مدد کیلئے کھڑے ہیں۔ جاؤ پاک مسیح کا مقدس باپ تمہارے پاک ارادوں میں کامیابی عطا کرے۔"

ٹراٹسکی نے مادومی کو الوداعی بوسہ دینا چاہا لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی۔ "نہیں پیارے ٹراٹسکی! تم مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ تم مادر وطن کے پاک سپوت ہو اور میں اس کی ایک ناپاک خادمہ۔ میں اپنی عزت و عفت ملک کے لئے قربان کر چکی ہوں۔ اب تمہارے لائق نہیں۔ تم مجھے بھول جاؤ" اس کی نگیں آنکھوں میں دُر شاہوار جھلک رہے تھے۔

"آہ! مادومی! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" ٹراٹسکی نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

"نہیں تم جاؤ" مادومی نے سختی سے کہا۔ "تمھیں سب کچھ خود ہی معلوم ہو جائیگا۔" ٹراٹسکی نے اس کی نگاہوں میں کچھ دیکھا وہ خاموش ہو گیا۔ اب اس میں مزید استفسار کی ہمت نہ تھی۔

تمری مہینے کی آخری تاریک ترین رات تھی۔ تمام دارالخلافہ ظلمت نیم شبی کے کنار جمود میں خوابیدہ تھا۔ ماسکو کی پرسکون شاہراہیں، ٹراٹسکی اور مادومی کے گھوڑوں کی آواز سے گونج رہی تھیں۔ مادومی اپنے گھر جا رہی تھی۔ آنگوں آنکھیں اور خمیدہ سر۔ ٹراٹسکی شاہی محل کی طرف۔ دل میں ایک خلش اور خلش میں ایک سوز لئے ہوئے۔

(۵)

شاہی خوابگاہ کی تاریکی میں خنجر کی برق آسا چمک پیدا ہوئی اور صاعقہ کے مانند کھنڈکر مسہری پر پڑے ہوئے بیش قیمت کمبلوں میں گم ہو گئی۔

ایک دم سے سارا کمرہ بقعہ نور بن گیا۔ خوابگاہ کا مشرقی دروازہ کھلا اور خوفناک بلند آہنگ قہقہوں کے ساتھ زار کا چہرہ نظر آیا۔ آنکھیں انتقام کی چنگاریوں سے شعلہ زن تھیں جنھیں تضحیک ملامت کے جذبہ نے اور زیادہ خوفناک بنا دیا تھا۔

آہ! ٹراٹسکی کے تمام ارادوں پر پانی پھر گیا۔ خوابگاہ کا محافظ دستہ آگے بڑھا۔ اور اسے حلقہ میں لے لیا۔

"ناپاک کتے! کیا تو نے زار کا قتل بچوں کا کھیل سمجھ لیا تھا نہیں جانتا کہ آج میرے جاسوسوں کا جال دنیا میں سب سے وسیع ہے۔ بچے ابھی تیرا اور تیری چہیتی نمک حرام مادومی کا کیا حشر ہوتا ہے۔" زار نے نفرت سے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

۶ — عیش پرست درباری

کونٹ ڈووکس۔ یار اس گدھے ٹراٹسکی کی تو ایسی تیسی۔ لیکن اُس حسین چھوکری کا مجھے رہ رہ کے خیال آ رہا ہے۔

بیرن لیبرڈ۔ وہ ہے ہی کمبخت ایسی۔ واللہ کس غضب کا حسن ہے سارے ماسکو میں اس جیسی ایک نہ ملے گی۔

کرنل ریبسر۔ (کرسی کھسکاتے ہوئے) کہوں بھئی کیا مادومی کا ذکر ہو رہا ہے؟ (دو چار لوگ اور کرسیاں کھسکا لیتے ہیں)

کونٹ ڈووکس۔ ہاں! (مونچھوں پر تاؤ دینے لگتا ہے)۔

جنرل لوکی۔ (زور سے) مادومی! واللہ وہ تو ایک پرکالہ حسن ہے (جنرل سوروگی دور سے بیٹھا ہوا ان کی باتیں سن رہا ہے لیکن خاموش ہے چہرہ پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں اور آنکھوں سے دلی اضطراب ظاہر ہے)

بیرن لیبرڈ۔ لیکن یہ سوجھی کیا اسے؟

جنرل لوکی۔ یہ نہ پوچھئے۔ یہ شیطان لینن کے شاگرد بڑے آفت کے تیلے ہیں۔ یہ سب انھیں کی گمراہ کن تعلیم کا نتیجہ ہے۔

کرنل ریبسر۔ بھئی ان شیطانوں نے تو ناک میں دم کر دیا ہے۔ میرا بس چلے تو اس حرامزادے لینن کو اتنے کتے ماروں کہ دم نکل جائے۔

کونٹ ڈووکس۔ ان کی حماقت میں تو کسی کو شبہ ہی نہیں!

نرے احمق ہیں۔ جب دیکھو۔ کسان کسان اور مزدور مزدور کی پکار ـــــ! پوچھیے آخر یہ شراب اور حسین عورتیں چھوڑ کر کسانوں اور مزدوروں کے پیچھے پیچھے پھرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "بیوقوف کہیں کے۔"

بیرن لیبرڈ۔ گر میں نے تو سنا ہے ان کی انجمن میں بہت سی حسین عورتیں بھی شامل ہیں۔

کونٹ ڈوڈوکس۔ ہاں شامل کیوں نہیں، مادومی ہی کو دیکھ لو، یہ بھی تو آخر انھیں کی ساتھی ہے۔

(موروگی افسردہ نگاہوں سے دیکھتا ہے)

جنرل لوکی۔ "تو پھر کیا ہے یار۔ مزے لوٹتے ہونگے۔ بدمعاش عورتیں بھی ان میں ایسی ہی ہونگی جیسے مادومی!

کرنل ری یر۔ اور ہاں خوب یاد آیا۔ کل ہی تو کل صبح بی مادومی پرنس رولین کے ساتھ تمام دن داد عیش دیتی رہی۔ بھئی شہزادہ کیا خوش نصیب ہے (جنرل موروگی سخت نگاہوں سے گھورتا ہے) مجھے تو اس کی قسمت پر رشک آتا ہے۔

بیرن لیبرڈ۔ بھئی ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔ کاش وہ مجھ پر عاشق ہوتی!

(ماشاء اللہ چشم بددور کہتے ہوئے سب قہقہہ مارتے ہیں لیکن بوڑھا ڈوڈوکس خاموش ہے۔)

کونٹ ڈوڈوکس۔ لیکن مجھے یقین ہے! مجھے یقین ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔

(پھر سب لوگ قہقہہ مارتے ہیں پرنس رولین شراب میں مدہوش لڑکھڑاتے قدموں سے داخل ہوتا ہے)

رولین۔ پاگلو! یہ تم لوگ کیوں چیخ رہے ہو؟ احمق کہیں کے۔

(سب لوگ خاموش ہو جاتے ہیں۔ زار داخل ہوتا ہے۔ اس کے عقب میں سپاہی مادومی اور ٹراٹسکی کو لے کر آتے ہیں۔)

ایک بوڑھا فوجی افسر۔ اُف مار ڈالا ظالم!

جنرل لوکی۔ (جھک کر) واللہ غضب کا حسن ہے۔ میرا تو گویا دل نکل گیا۔

(رولین مادومی کو بہت غور سے دیکھتا ہے)

زار۔ آگے لاؤ اس حسین چھوکری کو۔

رولین۔ نہیں اسے میرے پاس لاؤ۔ (قہقہہ مارتا ہے) اہاہاہا!

زار۔ کیا بکتے ہو احمق کہیں کے۔

رولین۔ چہ خوب! میری معشوقہ کو آپ بلانے والے کون؟

زار۔ ہوش میں آؤ رولین! کیا بک رہے ہو۔ چپ رہو ورنہ باہر نکال دیئے جاؤ گے۔

رولین۔ (زور سے قہقہہ مارتا ہے) واللہ آگئی آپ کی بھی طبیعت۔

زار۔ (غصہ سے چیخکر) کوئی ہے: نکالدو اس پاجی کو۔

رولین۔ اہاہا (ہنستا ہے) آپ ناراض نہ ہوں میں خود چلا جاتا ہوں

(سپاہی اسے باہر نکالدیتے ہیں)

زار۔ (مادومی اور ٹراٹسکی سے) تمھیں رہائی کی شرط معلوم ہے امید ہے کہ تم نے اس پر غور کر لیا ہوگا۔

مادومی۔ ہم کسی قیمت پر بھی اپنی جماعت کا راز آشکار کرنے سے قاصر ہیں۔

زار۔ جانتے ہو۔ اس عدول حکمی کا انجام موت ہے۔ خوفناک موت!

(موروگی کانپ جاتا ہے)

مادومی۔ بیشک! لیکن موت کا تخیل ہمارے عزم کے استحکام کو متزلزل نہیں کر سکتا۔ ہم بخوشی اس کے خیر مقدم کیلئے تیار ہیں۔

زار۔ (ٹراٹسکی سے) اور کیا تمھارا بھی یہی فیصلہ ہے؟

ٹراٹسکی۔ نہ صرف میرا بلکہ ہر شیدائے وطن کا۔

زار۔ خوب سوچ لو۔ یہ آخری فیصلہ ہے۔

مادومی۔ بالکل آخری اور اٹل۔

زار۔ (غصہ سے) بہت اچھا، آج عین غروب آفتاب سے قبل تمھاری ناپاک زندگیوں کا چراغ ہمیشہ کیلئے گل کر دیا جائیگا۔ (محافظ زنداں سے) لیجاؤ ان کتوں کو ـــــ،

جنرل موروگی۔ یور مجسٹی (جھک جاتا ہے) کیا میں مادومی کیلئے رحم کی درخواست کر سکتا ہوں؟

زار۔ (چیخکر) ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، میں اپنے بیٹے کو بھی معاف نہیں کر سکتا ـــــ،

موروگی۔ یورا امپیریل مجسٹی ......

زار۔ ہرگز نہیں، بیٹھ جاؤ۔ میں کچھ نہیں سن سکتا۔ (آزردہ موروگی بیٹھ جاتا ہے)

۷۔ مقتل

موسم سرما کی کیفیت انگیز اور شعر آگیں شام قتل گاہ کے تعف در پر اپنی لطافتیں قربان کر رہی تھیں صحن مقتل میں ایک معنی خیز جمود اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔ مادوی اور ٹرانسکی کے کملائے ہوئے چہرے طبعی ہیجان و اختیار کے عکاس بنے ہوئے تھے اور ان کی پر اضطراب آنکھیں جو فطرتاً غمگیں تھیں افق مغرب میں اپنی زندگی کا آفتاب غروب ہوتے دیکھ رہی تھیں۔

"پیارے ٹرانسکی!" مادوی نے آہستہ سے کہا۔ "بیشک تمھاری نظریں رات کی خوفناک تاریکی میں مجھے میرے گھر جاتے دیکھ رہی تھیں لیکن حقیقت یہ نہ تھی۔ میں ایک نزدیک ترین راہ سے زار کی خوابگاہ میں پہنچ جانا چاہتی تھی تاکہ جب تمھارے خنجر کی نوک زار کے ناپاک سینے میں داخل ہو تو میرا خنجر ہمیشہ کیلئے اُسے سلا چکا ہو۔ لیکن آہ! خوابگاہ کی تاریکی نے مجھے ایک میز سے ٹکرا دیا۔ فوراً روشنی ہو گئی۔ شاہی باڈی گارڈ نے مجھے حراست میں لے لیا روشنی پھر گل کر دی گئی۔ اب میں معہ بادشاہ اور اس کے ظالم سپاہیوں کے دوسرے کمرے میں تھی۔ بیرحم زار نے مجھے بالکل برہنہ کر دیا۔ میرے کپڑوں کی تلاشی لی گئی۔ تمھارا خط موجود تھا جس میں آج کی مہم کے متعلق لکھا تھا۔ زار نے خط دیکھا۔ مجھے کمرے میں بند کر کے معہ اپنے سپاہیوں کے دوبارہ خوابگاہ کی طرف چلا گیا۔"

مادوی نے یہاں تک کہا۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں ہو چکی تھیں۔

"آہ!" اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "آہ! میں نہیں جانتی کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ البتہ تمھاری گرفتاری کے بعد مجھے بھی ایک علیحدہ زندان میں بند کرنے کا حکم دیا گیا۔"

"پیاری مادوی!" ٹرانسکی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "میری جان! آفتاب ڈھلک کر مغرب کی آغوش میں پہنچ چکا ہے اب ہماری زندگی کے لمحات بہت مختصر رہ گئے ہیں آؤ ہم آخری بار بغلگیر ہو لیں۔" (مادوی کی غمگیں نگاہیں اسے دیکھ رہی تھیں) "ہماری ازدواجی زندگی کے شیریں خواب ہمیشہ کیلئے تشنۂ تعبیر رہے۔ لیکن بہت دیر نہیں کہ ہماری روحیں خداوند یسوع کے حضور میں حاضر ہو کر ہمیشہ کیلئے ایک ہو جائینگی کتنی مبارک ہے وہ شادی جس میں فردوس کی حسین حوریں مبارکباد دیں۔" اس کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔

"لیکن" مادوی نے کہا "میرے پیارے ٹرانسکی! کیا تم بھول گئے کہ مادر وطن کے ناموس کیلئے اس کی ایک پرستار اپنے گوہر عصمت کو بندہ ہوس رولین کے قربانگاہ نفس پر بھینٹ چڑھا چکی ہے۔ اب وہ اس قابل نہیں کہ اپنے کو تمھارے لائق کہہ سکے۔" اس کی آنکھیں بوجھل ہو گئیں۔

"بھولتی ہو میری جان!" ٹرانسکی نے اس کے سرد ہاتھوں کو دباتے ہوئے کہا "تم بھولتی ہو میری جان! وطن کی بہبودی کیلئے ہمارا ہر فعل، ہماری ہر لغزش ناقابل گرفت ہے۔ پاک مریم کی قسم تم میری نگاہوں میں اب بھی وہی عصمت کی دیوی مادوی ہو۔"

مادوی اکے خشک لبوں پر ایک غمناک تبسم رقص کرنے لگا۔ اس کے ہاتھ خود بخود ٹرانسکی کے مرتعش لبوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آہ! بوسے کی خاطر ایسے بوسے کی جو فضائے دہر کو متزلزل اور کائنات کو زیر و زبر کر دے۔

"وقت ہو چکا ہے۔" یہ کرنل کی آواز تھی جو سپاہیوں سے کہہ رہا تھا۔

سپاہیوں نے مادوی اور ٹرانسکی کو کھڑا کر دیا۔

"بہت اچھا" کرنل نے کہا۔ "پہلے ٹرانسکی کو اپنی گولیوں سے چھید ڈالو۔"

کائنات میں ایک ارتعاش پیدا ہوا چھ رائفلوں کے آتشبازدہانوں سے سنسناتی ہوئی گولیاں ایک ساتھ نکلیں لیکن قبل اس کے کہ ٹرانسکی کا جسم ان کا نشانہ بنے عورت کی طرف سے قربانگاہ محبت پر آخری بھینٹ چڑھا دی گئی کہ کہیں محبت کا ڈرامہ تشنۂ انجام نہ رہ جائے۔ حسین مادوی کے جسم کے ٹکڑے صحن مقتل میں پھیل گئے۔

لخت لخت ہائے جسم فرش خاک پر متحرک تھے روح آخری کشمکش کے ساتھ اعضا سے نکل رہی تھی۔ یہ تھا محبت کا انجام، غمناک اور عبرت خیز۔

ٹرانسکی پاگلوں کے مانند سب کچھ دیکھتا رہا حتیٰ کہ گولیوں کی دوسری باڑ نے اس کا شیرازۂ ہستی منتشر کر دیا۔

کائنات خاموش تھی، بالکل خاموش۔ تاریکی اچھی طرح غلبہ پا چکی تھی۔ لیکن ایک صدا تھی جو خموشی کی زبان سے برابر آ رہی تھی۔

"اے عورت تیری ہستی فنا فی العشق ہے" (فقط)

جذباتِ عالیہ

اعتبار الملک حضرت دلؔ شاہجہانپوری ظلہٗ

مایۂ ناز بنے جوہرِ قابل ہو جائے
حُسن ہی حُسنِ محبّت میں مرا دل ہو جائے

مقصدِ عشق سے آگاہ اگر دل ہو جائے
پھر جہاں ٹھوکریں کھائے وہی منزل ہو جائے

بہ زبانِ ساقیٔ کوثر بہ لبِ ندرِ حسینؑ
وہی مومن ہے جو اس دور میں شامل ہو جائے

غرق ہو کر کوئی اُبھرا تو کھُلا رازِ حیات
عشق جس موج کو چاہے وہی ساحل ہو جائے

کہہ رہی تھی یہ کسی جانِ تمنّا کی نگاہ
دل وہی دل ہے جو اس تیر سے بسمل ہو جائے

پئے تکمیلِ طلب شرط ہے بربادی کی
خاک ہو جاؤ تو آگاہیٔ منزل ہو جائے

معتبرِ عشق نہ تھا سوزِ دروں تک اے دلؔ
ہے وہ پروانہ جو خاکسترِ محفل ہو جائے
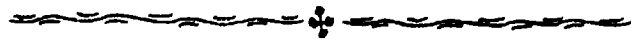
کیا دنیا جنگ کے خطرے سے محفوظ رہ سکتی ہے؟

سیاسیات حاضرہ پر ایک مفصل و دلچسپ تبصرہ

جس کا مطالعہ وقت کی اہم ضروریات سے ہے

از جناب مولانا خواجہ احمد صاحب فاروقی۔ بی۔ اے

لڑنا انسان کی ابتدائی جبلتوں میں سے ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس کی تاریخ کا کوئی دور بھی جنگ کی دردناک داستانوں سے خالی نہیں۔ آج بھی جبکہ دنیا میں فہم و فراست کی ارزانی ہے اور علوم و فنون کی ترقی نے موجودہ زمانہ کو عقل کا دور بنا دیا ہے۔ انسان انسان کے خون کا پیاسا نظر آتا ہے۔ اسکی حرص و طمع اسی طرح قائم ہے اور اس کا جذبۂ تسلط و اقتدار اسی طرح کارفرما ہے۔ وہ آج دشمن کو تیغ و خنجر سے نہ سہی رائفل اور زہریلی گیس سے تباہ کرتا ہے، تلوار اور تفنگ کے بجائے وہ آب دوز کشتیوں اور بمباری کرنے والے طیاروں کے ذریعہ دشمن کی ہلاکت و بربادی کے سامان مہیا کرتا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید بیجا نہیں کہ آج وہ تہذیب و تمدن کے لباس میں عہد قدیم کے عریان انسان سے زیادہ وحشی اور خونخوار نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ سائنس کی گوناگوں ایجادوں نے اسکی تباہی اور بربادی کے وسائل اور ذرائع میں معتدبہ اضافہ کر دیا ہے۔

مسئلہ جنگ، دنیا کی ذمہ دار ہستیوں کے لئے ہمیشہ غور و فکر کا موضوع رہا ہے لیکن شاید اس کی اہمیت میں کبھی اتنا اضافہ نہیں ہوا۔ جتنا جنگ عظیم کے بعد ہوگیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جنگ اپنی ہولناکیوں کے لحاظ سے تاریخ عالم میں نظیر نہیں رکھتی۔ جان و مال کا بے پناہ نقصان اور سیاسی معاشی اور سماجی بدنظمیاں جو اس لڑائی کے بعد وقوع میں آئیں وہ اس سے پہلے کبھی نہیں آئی تھیں۔ دنیا درد و کرب سے چیخ اٹھی اور اہل فکر جنگ کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے مسئلہ پر غور کرنے لگے حقیقت تو یہ ہے کہ یہ جنگ ہی اس پاک جذبہ کے ماتحت لڑی گئی تھی۔ امریکہ و برطانیہ کی شرکت جنگ، لڑائی کو دنیا سے ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کرنے ہی کے لئے عمل میں آئی تھی۔ اور ولسن کے چودہ نکات بھی امن عالم کی ضمانت کرنا چاہتے تھے لیکن یہ عجیب لطیفہ کی بات ہے کہ عہد نامہ ورسیلز جس کے متعلق توقع تھی کہ وہ دنیا میں امن و سکون قائم کر دے گا۔ اپنے اندر سترہ لڑائیوں کے آثار و اسباب پوشیدہ رکھتا تھا۔ یہ لڑائیاں ہوکر رہیں اور انجمن اقوام یونہی تماشا دیکھتی رہی۔ لیگ آف نیشنز بھی حصول امن کی کوشش مجہول کا نتیجہ تھی جس کا نامۂ اعمال کسی ایسے کارنامہ سے یکسر خالی ہے جو اس کی زندگی کو ثابت کر سکے۔

۱۹۱۸ء کے بعد سے امن عالم کی غارتگری کی سب سے بڑی ذمہ داری عہد نامۂ ورسیلز پر ہے حقیقت یہ ہے کہ تاریخ اس سے زیادہ بے انصافی، سیاسی عصبیت اور اخلاقی بے حسی کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس صلح نے امن و آشتی کو قائم نہیں کیا۔ بلکہ ایک عرصہ کے لئے بالکل فنا کر دیا۔ منافرت پھیلا دی اور انتقام کا جوش بڑھا دیا اس کی قائم کی ہوئی حدیں آج ایک بھی محفوظ نہیں ہیں بلکہ بہت سی تو اس طرح مٹ چکی ہیں کہ پچھلیوں کا پتہ بھی نہیں چلتا! مارچ ۱۹۱۸ء میں لائڈ جارج نے خدا کو گواہ کرکے یہ اعلان کیا تھا کہ ہمیں ایک انچ زمین کی بھی

تمنا اور آرزو نہیں ہے۔ لیکن اس کے بعد ہی ایک کروڑ سے زیادہ مربع میل زمین برطانیہ کی مملکت میں شامل ہو گئی۔ آج اگر غور سے دیکھا جائے تو سب سے بڑی کشمکش Haves اور Have-nots نوآبادیات رکھنے والے اور نہ رکھنے والوں ہی کی ہے۔ جرمنی کا مطالبۂ مستعمرات بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔

موجودہ زمانہ کو ہم بجا طور پر "معاشی دور" کہہ سکتے ہیں صنعتی انقلاب کے بعد سے تجارت نے مقابلہ کی ایسی انسانیت سوز صورتیں پیدا کر دی ہیں جن کی وجہ سے تہذیب و تمدن کے الفاظ اپنے اطلاقِ صحیح سے محروم ہو گئے ہیں اور کسی وقت اگر یورپین تہذیب کا زوال ہوگا تو وہ بھی یقیناً انہیں اسباب کی بنا پر ہوگا۔ اس لئے کہ اس "معاشی ملوکیت" نے زندگی کے ان سرچشموں کو بالکل خشک کر دیا ہے جن سے محبت و اخوت کی دھارائیں بہتی ہیں۔ اور یہ بالکل طے بات ہے کہ کوئی قوم اور ملک اپنی عظمت کی بلندیاں لامذہبیت کے ریگزار پر یا اخلاق کے اصولوں سے یکسر بے نیاز ہو کر قائم نہیں کر سکتا۔

اسی نفسا نفسی اور شدید بداعتمادی نے یورپ کی عسکری تنظیم میں آج اتنا اضافہ کر دیا ہے کہ اس کا سنہ ۱۹۱۴ء سے بھی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ فرانس فوجی سامان و اسلحہ جات پر جنگ عظیم سے چوگنا زیادہ خرچ کرتا ہے۔ اسی طرح آج جرمنی کی ہوائی قوت برطانیہ اور فرانس دونوں سے کہیں زیادہ ہے۔ برطانیہ نے پچھلی مرتبہ سامان حرب کے لئے ایک ارب پونڈ منظور کئے تھے میثاق میونک کے بعد سے وہ مسلح امن کے لئے اس سے زیادہ تیاریاں کر رہا ہے۔ امریکہ جو امن و سکون کا سب سے بڑا علمبردار ہے اس کا بھی حرب و دفاع کے مقابلہ میں بڑا اہتمام بالشان پروگرام ہے اور یہ ارادہ ہے کہ اس کی عسکری تنظیم تمام دنیا سے زیادہ ہو روس نے بھی انقلاب کی بارہویں سالگرہ مناتے ہوئے اس کا اعلان کر دیا ہے کہ "اس کی بمباری کی قوت اتنی زیادہ ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کی حریف نہیں ہو سکتی۔ اور جس کو اس کا یقین نہ ہو وہ مقابلہ کر دیکھے"

جنگ عظیم کی حمایت میں جہاں اور دعاوی کئے گئے تھے۔ وہاں ایک دعوی یہ تھا کہ وہ جمہوریت کو استوار کرنے کے لئے لڑی جا رہی ہے لیکن واقعات نے بالکل اس کے برخلاف ثابت کیا۔ گذشتہ سولہ سالوں میں کم و بیش آٹھ یورپین حکومتوں نے جمہوریت کو بالائے طاق رکھ کر شہنشاہیت اور ملوکیت کو قبول کر لیا۔ وہاں مطلق العنان حکومتیں قائم ہو گئیں اور بعض جگہ آمرین برسر اقتدار ہو گئے برطانیہ اور فرانس میں بھی آج وہ جمہوری شان نہیں ہے۔ جو پہلے تھی، اشتراکی اور فسطائی عناصر اس کی اندر ہی اندر جڑ کاٹ رہے ہیں امریکہ البتہ واحد ملک ہے جو جمہوریت کا سب سے بڑا علمبردار کہا جا سکتا ہے لیکن اصل معنوں میں اس کی حالت بھی "سنگ زرد برادر شغال" کی سی ہے۔ جمہوری سلطنتیں اپنے اندرونی معاملات سے اتنی غیر مطمئن ہیں کہ انہیں لڑائی کرنے کی ہمت نہیں ہوتی "انہیں صرف ایک ہی لڑائی لڑنا ہے اور اس کے بعد بہت ممکن ہے وہ بھی فسطائی نظم اختیار کرلیں اور ڈیمقراطیت کو مجبوراً ختم کر دیں" موجودہ کشمکش بڑی حد تک اشتراکیت، جمہوریت اور فسطائیت کی آویزش کا نتیجہ ہے۔ یہ زور آزمائی کے مختلف محاذ ہیں اور ان کے متنوع مظاہر وقتاً فوقتاً امن عالم کو درہم برہم کرتے رہتے ہیں۔

ان تمام باتوں نے موجودہ حالات کو بہت نازک بنا دیا ہے لیکن ان اسباب کی فہرست بہت طویل ہے جنہوں نے یہ صورت پیدا کی ہے۔ عہدنامۂ ورسیلز کی بے انصافی اور انجمن اقوام کی بیچارگی موجودہ اضطراب کی بڑی حد تک ذمہ دار ہے انہیں چیزوں نے "روم برلن ٹوکیو محور" کو بہت مضبوط کر دیا ہے۔ وہ جارحانہ اقدام جن کی ابتدا منچوریا کے قبضہ سے ہوئی تھی اس کا انجام چین کی تسخیر کامل کی صورت میں جلوہ گر ہونے والا ہے اطالیہ نے اپنے معاشی وسائل بڑھانے کے لئے حبش پر قبضہ کر لیا۔ لیکن کسی نے چوں بھی نہ کی۔ لیگ نے آواز اٹھائی تھی لیکن دنیا اس کی نزاکتِ آواز پر ہنس کر چپ ہو رہی اس وقت برطانیہ کی غیر واضح بیرونی پالیسی نے بھی دشمنانِ امن کی ہمتیں بڑھا دی ہیں، فرانس کے معاشی اور سیاسی حالات نہایت غیر اطمینان بخش ہیں اس لئے لندن پیرس محور "فسطائی طاقتوں کے مقابلہ پر زیادہ نقصان رساں نہیں ہو سکتا۔ ہسپانیہ میں وہ حکمت عملی جو عدم مداخلت کے نام پر برتی جا رہی ہے وہ جمہوری سلطنتوں کے لئے اور بھی خطرہ کا باعث بن رہی ہے۔ اس لئے کہ اس طرح فسطائیت کو بہت تقویت پہنچتی ہے۔ سب سے آخری لیکن سب سے اہم بات جس نے بعض مفکرین کے نزدیک جنگ کے امکانات اور قوی کر دیئے ہیں وہ زیکوسلوویکیا کی جارحانہ تقسیم ہے۔ اہل زیک نے برطانوی فیصلہ کو کس طرح سنا یہ تاریخ جدید کا

بڑا المناک واقعہ ہے جس وقت پراگ میں آلہائے مکبر الصوت کے ذریعہ
حسب ذیل اعلان سنایا گیا تو شہر پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔

"زیکوسلوویکیا کی حکومت نے برطانوی فیصلہ کو ایسے سخت دباؤ
کے زیر اثر قبول کیا ہے جس کی مثال تاریخ میں نہیں
مل سکتی۔ یہ فیصلہ گویا ایک حکم تھا جو کسی مغلوب اور بیکس
قوم کو دیا جاتا ہے۔ ہم امن و سکون کے لئے وہی قربانی
پیش کر رہے ہیں جو کسی وقت مسیح نے پیش کی تھی۔ ہم
خود کسی پر الزام نہیں لگاتے۔ تاریخ خود اس کا بہتر
فیصلہ کرنے والی ہے۔ کہ قابل الزام کون ہے"

یہ گویا نازیت کے دیوتا پر زیکوسلوویکیا کی بھینٹ تھی جو چڑھا دی
گئی لیکن کیا اس طرح امن و سکون کا قیام مستحکم ہو گیا؟ ہرگز نہیں ہٹلر نے
وعدہ کیا تھا کہ اب وہ یورپ میں اپنا کوئی حق نہیں ظاہر کرے گا لیکن یہ
وعدہ دوسرے ہی روز توڑ دیا گیا جیسا کہ آسٹریا کے معاملہ میں ہوا تھا۔
نازیت کی کتاب سیاست میں ایفائے وعدہ سے زیادہ عہد شکنی مستحسن
سمجھی جاتی ہے اور بقول ہربرٹ مارکسن وطنیت کے معاملات میں اخلاقی
اصولوں سے بیگانگی ہی کو سیاست کا خیال کیا جاتا ہے۔ جرمنی کے اخبارات
نے افریقہ کے مستعمرات کی واپسی کا مطالبہ اگلے ہی روز سے شروع کر دیا۔
ہٹلر بھی میثاق میونک کے بعد سے کئی مرتبہ جمہوری سلطنتوں کو "تنبیہ"
کر چکا ہے۔ ابھی دسمبر کے مقام پر اس نے اپنی تقریر میں صاف صاف
کہا ہے کہ "جمہوری سلطنتوں کو ہمارا نقطۂ نظر اور ہمارا فلسفۂ زندگی سمجھنا
ہو گا" اسی طرح مسولینی نے بھی کہا ہے کہ اطالیہ کے پاس اتنے مادی اور
روحانی وسائل موجود ہیں جو ہر طاقت کو پاش پاش کر سکتے ہیں۔ کیا عجب
ہے کہ وہ بھی اسپین میں وہی کرے جو ہٹلر نے زیکوسلوویکیا میں
کیا ہے۔

ان تمام باتوں سے ظاہر ہے کہ یہ التوائے جنگ کوئی پائدار
چیز نہیں ہے اور نہ کوئی صاحب نظر اس امن و سکون پر مطمئن ہو سکتا ہے
اس لئے کہ اب یورپ کا توازن ملکی معرض خطر میں پڑ چکا ہے۔ فسطائی
حکومتوں نے دُطمعار کے بعد اپنی اپنی طاقت کو اور مستحکم کر لیا ہے اور
اس طرح جمہوری طاقتوں کے لئے خطرہ کے امکانات اور بڑھا دیئے
ہیں۔ فرانس و برطانیہ دونوں غیر شعوری طور پر یہ محسوس کر رہے ہیں۔ کہ
زیکوسلوویکیا کی موت نہیں ہوئی بلکہ جمہوریت کی موت ہوئی ہے۔

اس طرح جنگ کا خطرہ بالکل ابھی دور نہیں ہوا۔ وہ ہر وقت
رونما ہو سکتی ہے۔ ان صورتوں میں جب ہم موجودہ تہذیب و تمدن کے
دعاوی پر غور کرتے ہیں تو ہمیں دنیائے اخلاق سوگوار نظر آتی ہے اور
تعصب و جہل سربلند۔ انسان آگے بڑھ رہا ہے۔ لیکن انسانیت پیچھے
ہٹ رہی ہے۔ دماغ ترقی کر رہا ہے لیکن روح تنزل کر رہی ہے۔
دنیا کو امن کی جستجو ہے۔ لیکن اس کو ہر چیز سے جنگ کے شعلے نکلتے نظر
آرہے ہیں۔

ایچ۔ جی۔ ویلز نے لکھا ہے کہ دنیا امن و امان قائم کرنے کے لئے
سوائے عقل و ذکاوت کے ہر چیز کو کام میں لاتی ہے۔ اب ضرورت ہے
کہ اس روشنی میں آئندہ امن کی کوشش صرف کی جائیں۔ ورنہ اس تہذیب
کے بقا کی صورت نظر نہیں آتی۔ برنارڈ شا نے وطنیت کو تمام برائیوں کا
گہوارہ بتلایا ہے۔ اور لکھا ہے کہ "بیوقوفی کی اس سے زیادہ
کریہہ صورت کوئی نہیں ہو سکتی" اقبال نے بھی اس محدود نقطۂ نظر
کی سخت مذمت کی ہے اور اس کی برائیوں سے آگاہ کیا ہے:۔

مردمی اندر جہاں افسانہ شد ٭ آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند ٭ آدمیت گم شد و اقوام ماند

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ "سیاست لادینی" جس کو علامہ اقبال
نے "کنیز اہرمن" سے تعبیر کیا ہے اسی وطنیت کی پیداوار ہے بین الاقوامی
رقابت۔ مناقشت۔ بدگمانی اور بدامنی اسی طلسم خود سوز کے کرشمے ہیں۔
جب تک اقوام خدا کی تقسیم اور رنگ و بو کا امتیاز دور نہیں ہو گا اس وقت
تک دنیا میں امن کی جستجو محال ہے۔ ضرورت ہے کہ وطن کا مفہوم جغرافیائی
حدود سے بے نیاز اور "کلوخ و سنگ و خشت" سے بالاتر ہو۔ ویلز انہیں
وجوہات کی بنا پر عالمگیر فیڈریشن کی حمایت کرتا ہے اور اسی سبب سے
رومان رولاں نے صالحیت اخلاق پر زور دیا ہے۔ اس لئے کہ یہ
باتیں بغیر پاکیزگی روح کے ممکن نہیں۔ اُن کے نزدیک دنیا میں خدا
کی مملکت "کا قیام بھی انہیں صورتوں میں ممکن ہے۔ ابھی حال میں
ڈاکٹر کوتاچی نے "روحانیت و سیاست" کی موافقت میں آواز بلند کی ہے

اور دنیا کی طاقتور حکومتوں کو متنبہ کیا ہے کہ وہ اپنی سیاست کو دیو بے زنجیر نہ بنائیں ورنہ اس کا قدرتی انتقام نہایت ہی عبرتناک ہوگا۔ مہاتما گاندھی کا دعویٰ ہے کہ اُن کی وطنیت بین الاقوامیت کا درجہ رکھتی ہے وہ سمجھتے ہیں۔ کہ آزادی وامن کے لئے خیال اور عمل میں عدم تشدد پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ استوارئ عزم کے بغیر ممکن نہیں مہاتما جی نے جنگ عظیم کے بعد جب عدم تشدد کا نعرہ بلند کیا۔ تو تمام دنیا کی نگاہیں اُن کی طرف اُٹھ گئیں اور لوگ یہ سمجھنے لگے۔ کہ شاید ہمارے درد کی دوا مل گئی لیکن بعد کے واقعات نے اُن کی اُمیدوں کو مایوسی سے مبدل کر دیا۔ یوں بھی اس مادی دُنیا میں اس قدر شدید روحانی حربہ کے لئے جگہ نہ تھی۔

مفکرین کی یہ رائیں اپنی اپنی جگہ پر بالکل درست ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو سب ایک ہی بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ضرورت ایک صحیح نقطۂ خیال کی ہے۔ ذہن و ضمیر کی پاکیزگی ہماری مشکلوں کا حل بن سکتی ہے۔ لیکن ذہنیت کی اصلاح اسی وقت ہو سکتی ہے۔ جب حق کو حق اور باطل کو باطل سمجھا جائے۔ اور ضرورتوں کے لحاظ سے حق و باطل کے مختلف معیار نہ وضع کر لئے جائیں۔ اس کام کی تکمیل میں ہماری درسگاہیں بڑا حصہ لے سکتی ہیں۔ جہاں کہ آئندہ قومیں تیار کی جا رہی ہیں۔ ہمارے مدرسوں میں اگر ماضی کی صحیح تعبیر، حال کی صحیح تفسیر اور مستقبل کی صحیح تیاری کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہماری تعمیر فردا ایسی نہ ہو جو امن عالم کی ضمانت نہ کر سکے۔

مگر آہ تجھ کو خبر نہیں

(از جناب فضلی آندھروی)

یہ جبیں پہ قشقۂ احمریں ‖ مرے خونِ دل کی ہے داستاں
یہ گلابیاں لبِ لعل کی ‖ مرے زخمِ دل کی ہیں سرخیاں
یہ بہشتِ حسن پہ کاکلیں ‖ مری شامِ غم کی اداسیاں
ترے ابرؤوں کی یہ جنبشیں ‖ مرے اضطراب کی ترجماں
مرے سازِ دل کی نوا ہے تو ‖ تری ہر ادا سے عیاں ہے یہ
مرے دردِ دل کی دوا ہے تو ‖ ترا حسن جانِ حیات ہے
مگر آہ تجھ کو خبر نہیں!!

بکمالِ شوق یہ دل مرا ‖ ترے بانکپن کا شکار ہے
تو شرابِ حسن سے مست ہے ‖ مجھے ولولوں کا خمار ہے
تو ہے اور عشوہ طرازیاں ‖ میں ہوں اور نالۂ زار ہے
تو نظر میں جب سے سما گیا ‖ نہ سکون ہے نہ قرار ہے
وہی دردِ اہلِ نیاز کا ‖ وہی ناز کی ہے ستم گری
وہی حالِ فضلیؔ بے نوا ‖ وہی دلبری ہے جمال کی
مگر آہ تجھ کو خبر نہیں!!

حضرت سحبان الہند علامہ کیفی چریاکوٹی مدظلہ

اعتبارِ زیست نے اچھا کیا — زندگی جب تک رہی تڑپا کیا

تیرے قرباں اضطرابِ زندگی! — لحظہ لحظہ وہ مجھے دیکھا کیا

شوقِ دشمن کی بھی آنکھیں کھل گئیں — اے جمالِ دوست تو نے کیا کیا

سوزِ محفل نے جلایا رات بھر — آ کے بادِ صبح نے ٹھنڈا کیا

کیا اُسے جز ربطِ خود بینی کہوں! — عمر بھر میں آئینہ دیکھا کیا

دم بخود ہیں اس کی بزمِ ناز میں — فیصلہ تقدیر کا لکھا کیا

عشق کا غم آزمانے کے لئے — فتنۂ حسنِ بتاں برپا کیا

ہے رضائے دوست غالب عقل پر — وہ جو کچھ کہتا رہا مانا کیا

ناسمجھ کو کس طرح سمجھائیے — زندگی بھر میں جسے سمجھا کیا

اب میں اچھا ہو نہیں سکتا کبھی — اے غمِ درماں طلب اچھا کیا

کہہ رہی ہے سر جھکا کر بندگی
میں نے کیفی جو کیا بیجا کیا

بڑھاپے کی شادی

ایک عبرت انگیز نفسیاتی و معاشرتی افسانہ

از جناب مولانا ابرار اللہ صاحب آسی رامنگری

"سوامی!" بستر مرگ پر پڑی ہوئی لیلا بولی۔

پنڈت جی پاس ہی بیٹھے ہوئے آنسو بہا رہے تھے۔ لیلا بہت دیر سے بیہوش تھی۔ پنڈت جی کو یہ امید نہ تھی کہ وہ لیلا کے منہ سے پھر کوئی لفظ سن سکیں گے۔ اس لئے جب لیلا نے انھیں پکارا تو وہ چونک کر اس کے اوپر جھک گئے اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

"سوامی!" لیلا نے پھر پکارا۔ ابھی اسکی آنکھیں بند تھیں۔

"میں تمھارے پاس ہی ہوں لیلا۔" پنڈت جی نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"اور پاس آجاؤ۔"

"آنکھیں کھولو لیلا!"

"اب آنکھیں نہیں کھل سکتیں پران ناتھ! اب سفر کیلئے روانگی کے وقت تمھارے آخری درشنوں کے لئے کھلیں تو کھلیں . . ."

"کس سفر کی تیاری ہے لیلا؟"

"اب میں پرلوک کی یاترا کرونگی نا؟ تمھارے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ کیا تم اس یاترا کے نام سے ڈرتے ہو ——؟"

"کیا اکیلے ہی سفر کرو گی ——؟"

"ہاں! اس یاترا کے ساتھی نہیں ملتے . . . بڑی بکٹ باٹ ہوتی ہے نا؟"

"آہ! —— اتنے دنوں تک ہمسفر رہنے کے بعد یہ جدائی؟ —— تم اکیلی پرلوک سدھارو گی اور میں تنہا یہاں مارا مارا پھرونگا۔"

"اکیلے رہنے سے گھبراتے کیوں ہو . . . ؟"

"لیلا! اس دنیا کا سفر اتنا پر خطر ہے اور اس کی راہیں اتنی سنسان ہیں کہ تنہا مسافر کی ہمت چھوٹ جاتی ہے۔ اور یہ سفر ایک دلچسپ شغل کے بجائے ایک ناقابل برداشت بار بن جاتا ہے۔"

لیلا کچھ نہ بولی۔ ایک ٹھنڈی سانس کھینچکر چپ ہوگئی۔ پنڈت جی بھی کچھ دیر تک چپ رہے۔ پھر بولے۔ "لیلا! تمھیں یاد ہے۔ ہم کتنے دنوں سے ساتھ ساتھ سفر کر رہے ہیں؟ پورے تیس برس ہوگئے تیس برس کی طویل مدت کب آئی اور کب ختم ہوگئی۔ ہمیں پتہ بھی نہ چلا۔ اب تم سفر ختم ہونے سے پہلے درمیان ہی سے ساتھ چھوڑ رہی ہو۔ میں بڑی سوچ میں ہوں کہ سفر کا یہ باقی حصہ کیسے ختم ہوگا۔؟"

"سب کٹ جائیگا پران ناتھ! سفر کا تو یہ قاعدہ ہی ہے مسافروں کا ساتھ ہمیشہ کب رہا ہے کبھی نہ کبھی۔ کسی نہ کسی منزل پر ساتھ چھوٹنا لازمی ہے۔ تم اس کا غم نہ کرو۔ میں تمھارا وہاں انتظار کرونگی۔ جب تم اپنی منزل پر پہنچ جاؤگے تو ہم پھر مل جائینگے۔ ہاں مجھے اس کی فکر ضرور ہے کہ باقی سفر کس طرح طے کر سکو گے؟"

"میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"میں سوچ رہی ہوں کہ کہیں تنہا سفر کرتے کرتے اکتا کر . . ."

"ہاں اکتا کر ——"

"یہی کہ ایک ساتھی کو تلاش کرنے میں نہ لگ جاؤ۔۔۔۔"

"تمہارا مطلب شادی سے ہے ـــــ؟"

"ہاں ـــــ!"

"شادی اب بڑھاپے میں ـــــ؟"

"یہ تو سبھی بوڑھے مرد کہا کرتے ہیں۔ جب بیوی مرجاتی ہے تو دُنیا سے الگ ہوجاتے ہیں لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد انھیں ایک نوجوان رفیق کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔"

"لیکن تم تو مجھے ان لوگوں میں سے نہیں سمجھتی ہونا ـــ؟"

"ہاں۔ میں تمھیں تو ایسا نہیں سمجھتی۔ لیکن پھر بھی مجھے اطمینان نہیں ہوتا"

"لیلا! تم اتنی فضول اُلجھنوں میں کیوں پڑ رہی ہو"

"دنیا کا رنگ دیکھ کر مجھے طرح طرح کے وسوسے ستا رہے ہیں۔"

"کیا تمھیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے۔"

"بھروسہ تو ہے۔ لیکن پھر بھی میں تمھیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ دوسری شادی ہرگز نہ کرنا۔ لوگ تمھیں سمجھائیں گے اور کہیں گے کہ بے شادی کے خاندان کا نام کس طرح چلے گا۔ کوئی تمھیں جوانوں کی طرح تندرست و توانا بنائیگا کوئی تمھیں گرہستی کھڑی کرنے کے سراسر لائق کہے گا غرض جتنے مُنہ اتنی باتیں ہونگی لیکن تم ایسے لوگوں کی باتوں میں ہرگز نہ آنا۔ نہیں تو بعد میں بڑی پریشانیوں اور پشیمانیوں کا سامنا ہوگا۔ تم بیوہ سے شادی کر نہ سکوگے۔ اور کسی کنواری کو لاؤگے تو اس کی عمر سولہ سترہ سے زیادہ نہ ہوگی۔ اس سن میں وہ جن باتوں کی خواہش کریگی۔ تم ان میں سے ایک کو بھی پوری نہ کر سکوگے وہ جوانی کے نشے میں چور ہوگی اور تمھارے اوپر بڑھاپے کی سُستی و بے دلی چھائی ہوگی۔ وہ اپنے دل میں ایک حسین و جمیل ترچھے بانکے نوجوان چاہنے والے کا تصور کرچکی ہوگی۔ اور اس کی جگہ پر جب ہمیشہ تمھیں اپنے سوامی کے روپ میں دیکھے گی تو اس کا تن بدن بے اطمینانی اور بیدلی کی آگ میں جلنے لگے گا۔ اُس کے دل کی اُمنگیں اس کی زندگی کی دشمن ہوجائیں گی اور تم سے بھی بغاوت کرکے تمھاری جان اجیرن کردیگی۔ اس کے دل میں ہر وقت بے اطمینانی کا خوفناک طوفان اُمڈتا رہے گا۔ تم جانتے ہو اس بغاوت اور اس بے اطمینانی کا نتیجہ کیا ہوگا۔؟ تمھاری اور اس بے قصور و بیکس لڑکی کی تباہی و بربادی!! ـــــ اور اس کی تمام تر ذمہ داری تمھارے اور صرف تمھارے اُوپر ہوگی۔ تمھارا بڑھاپا تباہ و برباد ہوگا اور اس غریب کی ساری زندگی تباہ ہوجائیگی ۔۔۔۔۔۔۔۔" اتنا کہتے کہتے لیلا پر غشی طاری ہونے لگی۔ پنڈت جی نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

"تم اتنا [illegible] لو لیلا! نہیں تو پھر بیہوش ہوجاؤگی" پنڈت جی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"شاید اتنا ہی کہنے کے لئے میں بیہوشی سے ہوش میں آئی تھی تم نے میری باتیں سنیں؟"

"ہاں لیلا!"

"تو پھر وعدہ کرو۔"

"کس بات کا ـــ؟"

"جو کچھ میں نے کہا ہے اُسے ماننے کا۔"

"کیا تمھاری یاد ہمیشہ دل میں رہتے ہوئے بھی ایسا کرسکونگا۔"

"میں جانتی ہوں کہ تم ایسا نہ کروگے لیکن وعدہ کردو تاکہ میں اطمینان سے مرسکوں۔"

"اچھا لیلا۔ میں عہد کرتا ہوں کہ دوسری شادی ہرگز نہ کرونگا۔"

پنڈت نند کشور جی اپنے شہر میں خاص عزت اور حیثیت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ لیلا سے شادی کرنے کے بعد ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی کئی بار پڑوسیوں۔ دوستوں اور رشتہ داروں نے انھیں دوسری شادی کرنے کی صلاح دی۔ لیکن لیلا کی ظاہری اور باطنی خوبیوں نے انھیں اپنا ایسا گرویدہ بنالیا تھا کہ وہ دوسری شادی کیلئے رضامند نہ ہوئے۔ کبھی کبھی یہ سوچ کر کہ ان کے ساتھ ہی خاندان کا نام مٹ جائیگا ان کا دل شادی کرنے کے لئے چاہتا تھا لیکن پھر لیلا کا خیال ان کا ارادہ بدل دیتا تھا۔

یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ دنوں کے بعد لیلا اور پنڈت جی کے دلوں میں اولاد کی پرزور آرزو چٹکیاں لینے لگی۔ انھیں ایک ایسے کھلونے کی تمنا بےچین رکھنے لگی جسے وہ اپنے دل کے مندر میں دیوتا بناکر رکھیں اور اس پر اپنی بے پایاں محبت کے اچھوتے پھول نچھاور کریں۔ اور یہ ایک ایسی فطری خواہش تھی جسے وہ جتنا ہی دبلتے اتنی ہی اور بھی زور پکڑتی جاتی تھی۔

ارمانوں کے اس بڑھتے ہوئے طوفان کو روکنے کیلئے پنڈت جی نے بالآخر وہی صورت اختیار کی جو اس موقع پر اکثر عمل میں لائی جاتی ہے۔ پنڈت جی ایک سکول میں سنسکرت کے معلم تھے۔ ان کی جماعت میں ایک غریب لڑکا پڑھتا تھا۔ یہ بھی ذات کا برہمن تھا۔ پنڈت جی اس کے ساتھ خاص مہربانی اور محبت سے پیش آنے لگے اور آہستہ آہستہ وہ لڑکا پنڈت جی کے گھر کا ایک فرد بن گیا۔

کدار کو پنڈت جی نے گود نہیں لیا تھا۔ لیکن نیلا اور پنڈت جی اسے جس طرح رکھتے تھے اس سے لوگوں کو یہی معلوم ہوتا تھا کہ کدار کسی دن پنڈت جی کا حقیقی بیٹا بن جائیگا۔

نیلا کے مرنے کے بعد پنڈت جی کا دل دنیا سے اُچاٹ سا ہو گیا یوں تو پہلے ہی سے ان کی طبیعت کا رجحان مذہب کی طرف زیادہ تھا اب پوجا پاٹ میں اور بھی خاص طور سے مشغول رہنے لگے۔ صبح اور شام کا بیشتر حصہ گنگا اشنان اور بھجن بھاؤ میں گذارتے اور دن سارا اسکول میں کٹتا تھا۔

انھوں نے نیلا کے سامنے جو عہد کیا تھا اسے نباہنے کا انہیں پورا پورا خیال تھا اور اس پر وہ بڑی سختی سے کاربند تھے۔ نیلا کی ایک تصویر گھر میں تھی اسے اور بھی بڑی بنوا کر اپنے کمرہ میں لٹکا دیا تھا اور ہر روز اس کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے عہد کو تازہ کر لیا کرتے تھے۔

کچھ دنوں تک پنڈت جی کا یہی معمول رہا۔ لیکن اس مرقع انقلاب دنیا کی ہر شے اور ہر بات تغیر آشنا ہے آہستہ آہستہ پنڈت جی کے لوح دل سے نیلا کی تصویر کے نقوش دھندلے ہونے لگے۔ اور دنیا کی نیرنگیاں اس تاریک دنیا کا دامن اپنی طرف کھینچنے لگیں۔

گرمیوں کی لمبی چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ پنڈت جی کے ایک پرانے دوست ان سے عرصہ سے کہہ رہے تھے کہ آپ کچھ دن ان کے یہاں چل کر گذاریں لیکن یہ کبھی اس کے لئے تیار نہ ہوتے تھے اس مرتبہ چھٹی کے موقع پر یہ دوست خود ان کے یہاں آدھمکے۔

"میں وہاں جا کر کیا کرونگا"۔ پنڈت جی نے ان کے اصرار کے جواب میں کہا ــــ

"آپ اطمینان رکھیں۔ ہم آپ سے وہاں کوئی سخت کام نہ لینگے..."

"تو بھائی پھر میرے جانے کا حاصل کیا ہوگا؟"

"اور یہیں بیٹھے بیٹھے آپ کون سا جگ جیت رہے ہیں؟"

"بہت سے کام ہیں۔ گیان، دھیان، پستکوں کا پاٹھ"۔

"یہ سب تو آپ وہاں بھی کر سکتے ہیں اس کے علاوہ آب و ہوا بھی تبدیل ہو جائیگی۔ اور اس سے تو آپ کو بھی انکار نہ ہوگا کہ آپ کو اس کی ضرورت بھی ہے"۔

"ہاں کچھ فائدہ تو ہو ہی جائیگا"۔

"کچھ فائدہ نہیں بہت بڑا فائدہ ہوگا۔ یہاں رہ کر نیلا کی یاد آپ کو ہر وقت دکھ دیتی ہوگی۔ وہاں جانے سے آپ کی یہ اُداسی اور افسردگی بھی جاتی رہیگی"۔

"پھر بھی ......"

"پھر کیا رکاوٹ ہے ــــ؟"

"اب میں کسی گرہست کے یہاں نہیں جانا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ دنیا کے جھگڑوں جھمیلوں سے ایک دم الگ رہوں"۔

"آپ شوق سے الگ رہ سکتے ہیں۔ ہاں صرف کھانا کھانے کے لئے کچھ دیر کے واسطے آپ کو بال بچوں میں جانا ہوگا"۔

"اچھا بھائی! جیسی تمہاری مرضی"۔

دوسرے دن سویرے پنڈت جی کدار کو لیکر اپنے دوست کے ساتھ چل دیئے

پنڈت جی جہاں گئے تھے ندی کے کنارے گھنیرے پیڑوں سے ڈھکا ہوا نظر فریب گاؤں تھا ایک چھوٹی سی چوپال میں ان کا ڈیرا پڑا۔ وہیں کدار کے بھی رہنے کا بندوبست کیا گیا۔ پنڈت جی کے دوست اپنے گھر کے اکیلے تھے اس لئے پنڈت جی کے کھانے کا انتظام پڑوس کے ایک برہمن کے ہاں کر دیا۔ یہ برہمن ایک متوسط حیثیت کا آدمی تھا۔ اس کے گھر میں اس کے علاوہ اس کی بیوی اور تیرہ چودہ برس کی ایک لڑکی۔ لڑکی کا نام نیتا تھا۔ اس کی ماں نے تھوڑی بہت ہندی پڑھی تھی۔ اس لئے نیتا نے بھی گھر ہی میں تھوڑی ہندی پڑھ لی تھی کیونکہ گاؤں میں پڑھنے کا کوئی اور ذریعہ نہ تھا اور ہوتا بھی تو نیتا کا غریب باپ اس کی تعلیم پر خرچ کرنے سے معذور تھا۔ اور لڑکی کو زیادہ پڑھانا لکھانا ضروری بھی نہیں سمجھتا تھا

پنڈت جی کے دوست نے نینا کو ذرا سمجھدار دیکھکر سنسکرت کے کچھ شلوک یاد کرا دیئے تھے۔ اس سے زیادہ وہ بھی نہ کر سکتے تھے۔

نینا کے باپ کو کئی سال سے کھیتی میں نقصان ہو رہا تھا۔ زمیندار کا لگان تو کسی کبھی طرح چکا دیتا۔ لیکن ساہوکار کا قرض ادا کرنے کی اس میں سکت نہ تھی۔ ساہوکار کا قرض چھلانگیں مارتا ہوا بڑھ رہا تھا اس پر سود اتنا دینا پڑتا تھا کہ قرض کی رقم اصل سے کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ابھی تک نینا کی شادی نہ ہو سکی تھی۔ اس کے باپ نے کئی جگہ بات چلائی لیکن کہیں طے نہ ہو سکی وہ جہاں جاتا بڑے بڑے جہیز مانگے جاتے۔ غریب کیلئے گرہستی کا سنبھالنا ہی مشکل ہو رہا تھا جہیز کی بڑی رقم کہاں سے لاتا۔

نینا کا روپ دیوتاؤں کو بھی موہتا تھا۔ وہ دیہاتی لڑکی تھی پھٹے پُرانے کپڑے پہنتی ننگے پیروں گھر سے کھیت کو آتی جاتی۔ لیکن اس سادگی میں بھی اس کے انگ انگ سے روپ اور رس ٹپکا پڑتا تھا۔ اگر شہر میں پیدا ہوئی ہوتی اور اسے پڑھے لکھے دھنی ماں باپ ملے ہوتے اور اس کی تعلیم و تربیت باقاعدہ طور پر ہوئی ہوتی تو اس کی خوبیوں کو اور چار چاند لگے ہوتے ــــــ،

نینا صبح و شام دونوں وقت آکر چوپال کی صفائی کر جاتی تھی۔ پینے کے لئے ایک گھڑا پانی بھر کر رکھ جاتی۔ اس کام میں کدار بھی کبھی کبھی نینا کا ہاتھ بٹاتا۔ پنڈت جی سامنے ہی بیٹھے ہوتے اس لئے دونوں آپس میں کچھ بات چیت نہ کر سکتے لیکن پھر بھی روز روز کے دیکھنے اور ساتھ ساتھ چوپال کی صفائی کرنے سے نینا اور کدار کے درمیان دلی تعلقات برابر بڑھ رہے تھے اور تعلقات کی یہ نشو و نما فطری بات تھی کیونکہ دونوں ہمسن تھے نینا کو کبھی کدار کی طرح پڑھے لکھے لڑکے سے ملنے جلنے کا موقع نہیں ملا تھا اور کدار کو بھی نینا جیسی لڑکی سے آزادانہ دیکھا دیکھی کا یہ پہلا ہی موقع تھا۔ سولہ برس کے لگ بھگ کا سن بھی عجیب سن ہوتا ہے۔ یہ وہ سن ہے جب اس سن کو پہنچنے والوں کے دلوں میں جوانی کے جذبات انگڑائیاں لینے لگتے ہیں۔ ان میں اور ان کے سارے کاموں میں نہایت سرعت سے تغیر ہونے لگتا ہے۔ وہ اس بات کا نہایت شدت سے احساس کرنے لگتے ہیں۔ کہ ان کی زندگی میں عنقریب کوئی انقلاب رونما ہونے والا ہے اور وہ اس کے استقبال کے لئے تیاری بھی شروع کر دیتے ہیں۔ یہی وہ وقت ہے جب ہر نوجوان لڑکے اور لڑکی کے دل میں غیر جنس کا ساتھ اور معیت حاصل کرنے کی پُرزور خواہش پیدا ہو جاتی ہے یہ شادی سے پہلے کا ایک زینہ ہوتا ہے۔

نینا اور کدار بھی اس خواہش کا احساس کر رہے تھے۔ نینا کدار کے دل میں بس رہی تھی اور کدار نینا کے دل میں رم رہا تھا۔ دونوں آپس میں بات چیت کرنا چاہتے تھے۔ اُٹھنا، بیٹھنا اور رہنا سہنا چاہتے تھے۔ یہ ادھیڑ عمر والوں کی طرح پختہ کار نہیں تھے۔ نہ ان کے جذبات اتنے عمیق تھے۔ پھر بھی کبھی کبھی ایک دوسرے کے سامنے اپنا دل کھول دینے کے لئے بے چین ہو جاتے۔

فریقین میں جہاں اس طرح ساتھ رہنے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے وہیں ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی جتانے اور ایک کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھنے اور ایک دوسرے کی مشکلات میں حصہ لینے کا جذبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر کبھی نینا کام کرتے کرتے تھک جاتی تو کدار ایک ٹھنڈی سانس لیکر اسے بتا دیتا کہ اس کا دل نینا کی ہمدردی سے خالی نہیں ہے اور کبھی کدار کے سر میں درد ہوتا تو نینا اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر دکھا دیتی کہ اسے کدار کا بھی خیال ہے۔ اگر کبھی نینا دیکھتی کہ دال یا ترکاری اچھی نہیں بنی ہے تو وہ چپکے سے اچار کا ایک ٹکڑا لاکر اس کی تھالی میں ڈال جاتی۔

ہم پر جب شباب کا عالم ہوتا ہے تو ہم شباب کی ترنگوں سے لبریز جذبات کے حسن و قبح پر نظر رکھنے کی قدرت نہیں رکھتے اور جب ادھیڑ ہوتے ہیں تو یہ جذبات مُردہ ہو جاتے ہیں اس لئے اُس وقت جب ہم عالم شباب کی ترنگوں پر تنقید کرنے بیٹھتے ہیں تو ہماری تنقید حقیقی تنقید نہیں ہوتی۔ اس وقت ہم کدار اور نینا جیسے حالاتِ شباب کے ان جذبات کو ہوس کے نام سے موسوم کرتے ہیں لیکن در اصل ہوس ایک غیر فطری جذبہ ہے ہم ہوس اور اس کے انجام سے باخبر ہوتے ہوئے بھی اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن عالم شباب کے یہ جذبات فطری ہوتے ہیں اور اس دور سے گذرنے والوں کو مطلق احساس و شعور نہیں ہوتا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں؟ اور ان جذبات کے ماتحت ان سے جو حرکات و سکنات ظہور پذیر ہوتی ہیں ان کے پرکھنے میں کوئی مقصد و مدعا

ایک نادر و نایاب تاریخی تصویر

شاہ شجاع بہادر - اورنگ زیب بہادر اور مراد بخش

سمجھ نہیں ہوتا۔ وہ تو لامعلوم طور پر ان جذبات کا احساس کرتے ہیں۔ اور اس احساس کے جو نتائج رونما ہوتے ہیں وہ بہت حد تک غیر ارادی ہوتے ہیں ——'

ہم میں سے کچھ ایسے ہیں جو ان جذبات کو "محبت" کے نام سے موسوم کرتے ہیں لیکن دراصل یہ حقیقی محبت بھی نہیں ہوتی۔ کیونکہ نیتا کدا کی طرف اس لئے نہیں کھنچی جا رہی تھی کہ وہ کدار تھا بلکہ اس لئے کہ وہ "نوجوان" تھا۔ اگر کدار کی جگہ پر کوئی اور نوجوان ہوتا تو بھی وہ اسکی طرح مائل ہوتی۔

نیتا کے باپ جب پنڈت جی سے ملتے تو بڑے فکرمند نظر آتے۔ پنڈت جی نے کئی بار ان سے اس فکر و تردد کی وجہ پوچھی لیکن نجانے کیوں انھوں نے ہمیشہ اظہارِ حقیقت سے اعراض کیا۔ اور بات ٹال دی۔ ایک روز باتوں باتوں میں پنڈت جی نے اپنے دوست سے پوچھا۔

"نیتا کے پتا آج کل بہت ہی فکرمند نظر آتے ہیں۔"

"فکر کی بات ہی ہے۔"

"اچھا وہ کیا ——؟"

"ساہوکار کے قرض اور نیتا کی شادی کی چنتا انھیں کھائے جا رہی ہے۔"

"کیا ان کے اوپر قرض زیادہ ہے؟"

"ہاں گھر بار بیچکر بھی نہیں چکایا جا سکتا۔ ساہوکار نالش کرنے کی دھمکی دے رہا ہے۔ اگر وہ نہ مانا تو سارا سامان قرق ہو جائیگا۔ سر چھپانے کو بھی جگہ نہ رہ جائیگی۔"

"تو اس سے بچنے کی کوئی تدبیر سوچی ہے؟"

"تدبیر کیا سوچی ہے۔ بیچارے کی کوئی مدد کرنے والا بھی تو نہیں یہاں تک کہ نیتا کی شادی میں بھی رکاوٹ پڑی ہوئی ہے۔"

"کیا نیتا کی شادی کہیں طے ہوئی ہے۔"

"طے کیسے ہوتی؟ جہاں جاتے ہیں وہیں جہیز کے لئے بڑی رقم طلب کی جاتی ہے۔ اگر جہیز ہی دینے کے لئے روپے ہوتے تو ساہوکار کا قرض نہ چکا دیا جاتا۔"

"یہ تو بہت برا ہے۔" کہکر پنڈت جی چپ ہو رہے ان کے دوست بھی کچھ دیر چپ رہے پھر بولے۔ "پنڈت جی ——!"

"کہئے! ——"

"آپ سے ایک بات کہوں؟"

"ہاں ہاں، شوق سے۔"

"نیتا کے پتا کو فکر سے چھڑانے کی ایک تدبیر ہو سکتی ہے۔"

"وہ کیا ——؟"

"آپ کی امداد ——"

"میری امداد ——؟"

"جی ہاں! آپ چاہیں تو ان کا یہ سنکٹ کاٹ سکتے ہیں۔"

"بھائی میں کیا مدد دے سکتا ہوں۔ میں کس لائق ہوں؟"

"آپ روپے سے مدد کر سکتے ہیں۔"

"لیکن ...."

"میں سمجھ رہا ہوں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ میں آپسے روپے مفت دینے کیلئے نہیں کہہ رہا ہوں۔"

"پھر نیتا کے باپ کے پاس کون سی جائداد رکھی ہے جسے میں روپیوں کے بدلے میں لے سکونگا۔"

"ہاں ہے۔ پوچھئے تو بتاؤں۔"

"وہ کیا ——؟"

"نیتا ..... !"

"نیتا ——؟" پنڈت جی نے اپنے دوست کی طرف تعجب سے دیکھا۔

"کیوں ——؟ کیوں میرا منہ کیا دیکھتے ہیں آپ نیتا سے شادی کر لیں اور اپنے سسر کی امداد کے طور پر روپے دیدیں۔"

"لیکن مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا۔"

"شادی! ——"

"ہاں —— ! ۔"

"کیوں؟ اس میں حرج ہی کیا ہے؟"

"میں شادی نہیں کر سکتا۔"

"کیوں نہیں کر سکتے؟ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھئے بھی۔ کتنے ہیں جنھوں نے بوڑھے ہو کر اپنی شادی کی ہے۔ مرد کی زندگی بیوی کے بغیر جتنی بے مزہ گذرتی ہے اس کا آنند تو آپ اٹھا ہی رہے ہیں۔

بہت ممکن ہے آپ کچھ دنوں تک اسی طرح رہ سکیں لیکن بہت جلد آپ کو بیوی کی عدم موجودگی سے انتہائی بے کیفی محسوس ہونے لگے گی۔ اور بھرا پرا گھر بے استری کے سُونا سُونا سا معلوم ہونے لگے گا۔ اس کمی سے میری زندگی خود تلخ ہو رہی ہے۔ مگر کیا کروں دنیا کی لاج شادی کرنے سے روک رہی ہے۔ دو بن بیاہی لڑکیاں پڑی ہیں۔ ایسی حالت میں اگر میں اپنی شادی کروں تو دنیا کیا کہیگی؟ لیکن آپ کے آگے پیچھے تو کوئی بھی نہیں ہے۔ آپ تو بے تامل اپنی گرہستی بنا سکتے ہیں۔"

"لیکن بھائی میں لیلا سے مرتے وقت اس سے عہد کر چکا ہوں کہ اب شادی نہ کرونگا۔"

"آپ بھی گڑے مردے اکھاڑتے ہیں۔ ایسے عہد نہ جانے کتنے روز ہوتے رہتے ہیں اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔ اب لیلا یہ دیکھنے تھوڑا ہی آتی ہے کہ آپ اپنی بات پر قائم ہیں یا نہیں۔ آپ اس دنیا میں ہیں نہ کہ لیلا کی دنیا میں۔ آدمی جس سنسار میں ہو اسی کا خیال کرنا چاہئے۔"

"اگر عہد کا خیال نہ کروں تو بھی بڑھاپے کا خیال تو کرنا ہی ہوگا۔"

"بڑھاپے کا خیال؟ ـــــ کون کہتا ہے کہ آپ بوڑھے ہیں محض عمر کی زیادتی سے تو کوئی بوڑھا ہوتا نہیں۔ آپ کی صحت اچھی ہے۔ ابھی آپ کے دانت آدھے سے زیادہ موجود ہیں۔ بدن بھی ابھی تک کچھ ایسا لاغر نہیں ہوا ہے۔ ہاں صرف بال سفید ہو چلے ہیں اور یہ کوئی چیز نہیں۔ محض اسی وجہ سے اپنے کو بوڑھا سمجھنا۔ آپ کو صریح غلط فہمی ہے۔ شادی تو ایسے ایسے لوگ کی ہے جن کی عمریں آپ سے کہیں زیادہ تھیں اور ایشور کی کرپا سے ان کے گھروں میں بچے کھیل رہے ہیں شادی کرکے کوئی نام لینے والا پیدا ہو گیا تو پرلوک سدھار جائیگا۔"

پنڈت جی کچھ بولے نہیں اور خاموشی کا مطلب نیم رضامندی ہوتا ہے اس لئے پنڈت جی کے دوست نے اس وقت کچھ زیادہ کہنا مناسب نہ سمجھا اور انھیں اس بارے میں سوچنے کیلئے چھوڑ کر چلے گئے۔

اس گفتگو کے بعد ہی پنڈت جی کے دوست نے نیتا کے باپ سے اس بارے میں بات چیت کی۔

"ایں! نیتا کو پنڈت جی کے ساتھ ـــــ؟" نیتا کے باپ نے تعجب سے پوچھا۔

"اس میں حرج ہی کیا ہے؟ پنڈت جی کوئی ذات کے نیچ ہیں یا ان کے گھر میں لڑکی کو کسی طرح کی تکلیف ہوگی؟"

"ہاں یہ بات تو نہیں ہے۔ لیکن پنڈت جی کی عمر ..."

"تم پاگل ہوئے ہو۔ صرف سن زیادہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ ان کی تندرستی تو اتنی بری نہیں۔ اور پھر ایشور کی مرضی کو کوئی کیا کر سکتا ہے مان لو کہ تم نے اس کی شادی کسی نوجوان سے کی اور کچھ دنوں میں ایشور نہ کرے وہ پرلوک سدھار جائے تو کیا نیتا بیوہ نہ ہوگی؟ بھائی ایشور کی لیلا کون جانے۔ کیا پتہ انھوں نے پنڈت جی کو اسی لئے یہاں بھیجا ہو، اور پھر تمھارے اس کام سے دو کام بنتے ہیں۔ لڑکی سکھی گھر میں جاتی ہے اور تمھارا، تمھارا ..... قرض بھی ادا ہوا جاتا ہے۔"

"قرض بھی ادا ہوا جاتا ہے ـــــ؟"

"کیوں نہیں؟ پنڈت جی قرض بھی ادا کر دینگے۔"

"تو کیا نیتا کو ان کے ہاتھ بیچونگا؟"

"یہ بیچنا کہاں ہوا؟ وہ تمھارے داماد ہو کر تمھاری امداد کرنی چاہتے ہیں۔ اور پھر اگر آگے چل کر کھیتوں سے اتنی بچت ہونے لگے کہ لگان دیکر کچھ بچا سکو تو دھیرے دھیرے پنڈت جی کے روپے واپس کر دینا۔"

نیتا کا باپ سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔

"سوچ کیا رہے ہو؟"

"اگر میں منظور بھی کر لوں تو کیا نیتا کی ماں اور نیتا بھی اس بات کو مان لینگی ـــ؟"

"نیتا کی ماں اور نیتا .... ؟ استریوں کو ان باتوں سے بھلا کیا لینا ہے؟ ـــــ اور پھر تم نیتا کی باتوں کا خیال کرتے ہو؟ اسے اپنے بھلے برے کا کیا گیان ـــ؟"

"اگر میری حالت ایسی گئی گذری نہ ہوتی تو اس طرح ....."

"بھئی ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ ؟ کسی چار آدمیوں میں اپنی لاج رکھنی ہے۔"

اُس دن سے پنڈت جی کی چوپال میں نیتا کا آنا جانا بند ہو گیا۔ پنڈت جی اپنے دوست کی ساری باتوں پر غور کر رہے تھے۔ وہ پہلے

نیتا کو ان نگاہوں سے دیکھتے تھے اور اب اُنھوں نے اسے اور نگاہوں سے دیکھا تو پہلے کی نیتا اور اب کی نیتا میں بہت فرق پایا۔ وہ سوچنے لگے اگر اسی نیتا سے ان کی شادی ہو جائے اور یہی نیتا ان کے گھر کی سوامنی بن جائے تو بہت ممکن ہے گھر کی وہ گئی گذری رونق پھر لوٹ آئے اور انھیں دنیا سے پھر دلچسپی ہو جائے اور اگر نیتا سے اولاد بھی پیدا ہو تو پھر کیا پوچھنا ہے۔ خاندان کا نام بھی چلے۔

کسی خواہش کا پیدا ہونا تو ذرا مشکل ہے لیکن اس کا بڑھنا آسان ہے ادھر خواہش پیدا ہوئی اور دل اس کے متعلق خیالات سے لبریز ہو جاتا ہے۔ پنڈت جی کے دل میں جب تک شادی کی خواہش نہیں پیدا ہوئی تھی کوئی بات نہ تھی لیکن جوں ہی ان کے دل میں چنچل نیتا کی موہنی صورت کا تصور بیوی کے روپ میں آیا وہ نیتا کی طرف بے اختیار کھنچنے لگے اور اب اپنی رہن سہن پر خاص نگاہ رکھنے لگے۔ کپڑے صاف ستھرے پہننے لگے۔ آئینہ میں منہ دیکھتے اور اپنے کو زیادہ سے زیادہ بنانے سنوارنے کی کوشش کرتے۔ نیتا کے کنبے پر بھی اب پنڈت جی کی خاص مہربانی رہنے لگی کبھی کبھی قصبہ سے پھل یا مٹھائی منگا کر بھیجدیتے تھے۔

ان رنگین و خوش آیند تصورات و تخیلات کے ہجوم میں پنڈت جی کے سامنے کبھی کبھی لیلا کی مورتی بھی آجاتی۔ اس کے آخری الفاظ کانوں میں گونج جاتے اس وقت پنڈت جی کانپ جاتے۔ انھیں ایسا معلوم ہوتا جیسے لیلا غصہ میں بھری ہوئی ان کی طرف آرہی ہے۔ اور آکر انھیں کھا جانا چاہتی ہے۔ اس وقت پنڈت جی کانپ اُٹھتے۔ ان کا جی چاہتا سب پر ٹھوکر مار کر وہاں سے بھاگ جائیں۔ لیکن پھر اسی تصور کے پردے پر چنچل نیتا تھرکتی ہوئی آجاتی اور پنڈت جی کی ساری بیچینی دُور ہو جاتی ان کا کانپنا موقوف ہو جاتا اور پنڈت جی اپنی اس خیالی دنیا کی رنگینیوں میں ایسے کھو جاتے کہ لیلا کا کالے کوسوں پتہ نہ ہوتا۔

پنڈت جی نے ایسا بندوبست کر رکھا تھا کہ نیتا اور کدار نہ ملنے پائیں۔ ان کے دل میں کدار کے متعلق بدگمانی پیدا ہو گئی تھی۔ نہ جانے کیوں کدار انھیں اپنا حریف محسوس ہوتا تھا۔ جب کھانے کا وقت ہوتا تو پنڈت جی اسے اپنے ساتھ نیتا کے گھر لے جاتے۔

نیتا اب گھر سے باہر نہ نکلتی تھی۔ کیونکہ نہ اس سے چوپال کی صفائی کرائی جاتی تھی۔ نہ اسے کھیت پر جانے دیا جاتا تھا۔ بہت دنوں تک نیتا اور کدار کو اس کی وجہ معلوم نہ ہو سکی۔ انھیں ملنے کا موقع نہ پانا بہت کھٹکتا تھا۔

کچھ دنوں بعد نیتا کو پتہ لگا کہ اس کی شادی ہونے والی ہے اس سے یہ بھید چھپایا گیا تھا کہ وہ پنڈت جی سے بیاہی جائیگی۔ چونکہ اس کا اور کدار کا ملنا یکایک بند ہو گیا تھا اُسے ایک حد تک یقین ہو گیا تھا کہ اس کی شادی کدار کے ساتھ ہو گی۔

نیتا اب کھیت پر نہیں جاتی تھی۔ لیکن ایک روز سویرے ہی ایک ایسا ضروری کام آ پڑا کہ نیتا کو اُدھر جانا پڑا۔ پنڈت جی روزانہ صبح کے وقت کدار کے ساتھ ٹہلنے جایا کرتے تھے جدھر کچھ باغ تھے۔ آج اتفاق کی بات کہ نیتا کے کھیت کی طرف گئے۔ روز کا معمول تھا کہ کچھ دور جاکر پنڈت جی کدار کو داتن لانے کے لئے بھیجدیا کرتے تھے۔ اور داتن آنے پر داتن کرتے ہوئے ٹہلتے جاتے تھے۔ حسب معمول آج بھی انھوں نے کدار کو داتن لانے کیلئے بھیجا۔ ببول کے پیڑ اس وقت زیادہ نہیں تھے۔ ان کی تلاش میں کدار پنڈت جی سے بہت دور نکل گیا۔ جب اسے ببول کا ایک پیڑ نظر آیا تو ساتھ ہی بیٹھی ہوئی ایک نوجوان عورت پر بھی اُس کی نگاہ پڑی ——— کدار کے پیروں کی آہٹ پاکر جب اُس نے سر اوپر کو اُٹھایا تو کدار چلا اُٹھا۔

"اری نیتا ———!"

"کدار ———!" نیتا بھی زور سے بولی۔

"یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" نیتا نے ہنس کر پوچھا۔

"داتن توڑنے آیا ہوں۔"

"کانٹے دار داتن؟"

"ہاں کام کی ساری چیزوں میں کانٹے ہوتے ہیں۔"

"میں نے بھی کانٹا چبھو لیا ہے کسی طرح نکلتا ہی نہیں۔"

"اوہ نیتا! کہاں؟ کانٹا چبھو لیا ہے"، یہ کہہ کر کدار اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"ادھر" کہہ کر نیتا نے اپنا پیر اس کی طرف کر دیا۔

"پیر کے بیچوں بیچ؟ کیسا بے درد کانٹا ہے۔"

"کبھی کبھی کانٹے کچھ کام بھی کر جاتے ہیں۔"

کدار نے نیتا کی طرف دیکھا۔ نیتا نے نگاہ نیچی کر لی۔

"تمھارے کول پاؤں کانٹوں میں چلنے کے لائق تو نہیں نیتا!"

"یہ پیر پھولوں پر چلنے کیلئے نہیں بنے کدار!"

"پیروں کے اوپر لکھا تھوڑا ہی رہتا ہے کہ کون سے پیر کانٹوں کیلئے بنے ہیں کون سے پھولوں کے لئے۔"

"اگر پھولوں ہی کے لئے بنے ہونگے تو وہ پھول بھی شاید کانٹے دار ہونگے۔" نیتا نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

کدار ایک کانٹا توڑ کر نیتا کے پیر سے کانٹا نکالنے لگا۔

"اب تو میں تمھیں دکھتی نہیں کدار۔"

"اچھا یہ اُلٹا الزام ۔۔؟" آپ آنا در اُلٹے ہیں سے پوچھنا۔

"میں تو پرائے بس میں ہوں نا۔۔۔۔"

"پرایا بس ۔۔؟ پہلے تو یہ بات نہ تھی۔"

"ماں نے اب میرا چوپال پر آنا بند کر دیا ہے۔"

"یہ کیوں ۔۔۔۔؟"

"تم نہیں جانتے۔۔۔۔؟"

"مجھے کیا پتہ ۔۔!"

"مجھے بھی ٹھیک نہیں معلوم۔"

"شاید تمھاری شادی ہونے والی ہو۔"

"شاید۔۔۔۔" نیتا نے شرماتے ہوئے نگاہ نیچی کر کے کہا۔

"تم شادی کرنا چاہو گی نیتا؟"

"شادی تو سبھی کی ہوتی ہے۔" نیتا نے شرما کر رکتے ہوئے کہا۔

"برات کہاں سے آئیگی؟"

"میں کیا جانوں ۔۔"

"مجھے بلاؤ گی ۔۔؟"

"تمھیں تو آنا ہی پڑیگا۔"

"آنا ہی پڑے گا ۔۔؟"

"ہاں۔۔۔۔!"

"وہ کیوں ۔۔۔؟"

"تم نہیں جانتے۔۔۔۔۔؟"

"مجھے کیا پتہ ۔۔؟"

"اتنے بھولے نہ بنو۔"

"سچ مچ! میں کیا جانوں۔"

"کیونکہ۔۔۔۔"

نیتا ابھی جملہ پورا نہ کر سکی تھی کہ پیچھے سے ایک کرخت آواز آئی۔ "کدار ۔۔!" اس نے مڑ کر دیکھا تو پنڈت جی کھڑے تھے۔

"یہاں کیا کر رہے ہو؟" پنڈت جی نے کدار سے ڈانٹ کر پوچھا ۔۔، کدار اور نیتا دونوں اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"میں نے تمھیں داتن لانے کے لئے بھیجا تھا۔ یا یہاں اس طرح بیٹھنے کے لئے؟"

"نیتا کے پیر میں کانٹا چبھ گیا تھا ذرا اسی کو نکال رہا تھا۔"

"کس نے کہا تھا تمھیں ایسا کرنے کو ۔۔؟"

کدار چپ ہو رہا۔

"جاؤ گھر جاؤ۔" پنڈت جی نے غصہ سے کہا۔

کدار چپ چاپ چوپال کی طرف چل دیا۔

"تم یہاں کیسے آ پہنچیں نیتا ۔۔؟" پنڈت جی نے بڑی نرم آواز میں نیتا سے پوچھا۔

"ذرا کھیت کو جا رہی تھی۔" نیتا نے سر جھکا کر دھیرے سے کہا۔

"اچھا سویرے ہی سویرے؟"

"ہاں ایک ضروری کام آ پڑا تھا۔"

"چلو، میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔"

شادی کی تاریخ مقرر ہو جانے کے بعد پنڈت جی گھر لوٹ آئے یہاں آ کر انھوں نے جو پہلا کام کیا وہ کدار کو بورڈنگ میں بھیجنا تھا۔ انھیں اب کدار آستین کا سانپ معلوم ہو رہا تھا۔ کدار کو اب تک پتہ نہ تھا کہ نیتا کی شادی پنڈت جی سے ہونے والی ہے۔ ہاں اسے

پنڈت جی کے برتاؤ پر تعجب ضرور ہوتا تھا۔ اس دن نیتا کے ساتھ اسے دیکھ کر پنڈت جی کیوں بگڑے تھے؟ اسے گھر سے نکال کر بورڈنگ میں کیوں بھیج دیا؟ ان سب باتوں کا بھید وہ بہت سوچنے پر بھی نہ سمجھ سکا۔

ایک کانٹا دور کر کے اب پنڈت جی دوسرے کانٹے سے بھی دامن چھڑانے کی کوشش کرنے لگے۔ اور وہ دوسرا کانٹا تھا لیلا کی یاد۔ جب تک لیلا کی یاد دلانے والی چیزیں گھر میں رہینگی اس وقت تک وہ اپنی نئی شادی کا پورا لطف نہ اٹھا سکیں گے۔ یہ سوچ کر انھوں نے ایسی چیزوں کو گھر سے نکالنا شروع کر دیا۔ کچھ چیزیں بیچدیں۔ کچھ دوسروں کو دیدیں کچھ پھینک دیں۔ لیلا کے کمرے میں ایک طرف وہ تصویر لگی ہوئی تھی جسے پنڈت جی نے اسکے مرنے کے بعد خود ہی کمرے میں سجایا تھا۔ انھوں نے کئی بار تصویر ہٹانے کی کوشش کی۔ انھیں خوف تھا کہ کہیں نیتا یہ تصویر دیکھ کر ان سے منہ نہ پھیرلے کیونکہ نیتا لیلا کی عمر سے پنڈت جی کے سن کا اندازہ لگا لیگی۔ اور رنگے ہوئے گیسو در کی طرح ان کا پول کھل جائیگا۔

لیکن پنڈت جی جس وقت بھی تصویر کے پاس اُسے اتارنے کے ارادہ سے گئے انھیں خوف سا محسوس ہوا۔ اور الٹے پاؤں کمرے سے باہر نکل آئے اس لئے یہ کام انھوں نے ایک روز کدار کے سپرد کیا۔ کدار اس روز اتفاق سے بورڈنگ سے گھر آیا ہوا تھا۔

"اس تصویر کو اتار لو" پنڈت جی نے کدار کو حکم دیا۔

اب تک پنڈت جی جس تصویر کو دیوی کی مورتی کی طرح سمجھتے تھے اسے ہٹانے کا حکم سن کر کدار کے تعجب کی حد نہ رہی اُس نے دبی زبان سے پوچھا۔ "آپ اسے ہٹا کیوں رہے ہیں؟"

"کام کرتا ہے یا وجہ پوچھتا ہے؟" پنڈت جی نے بگڑ کر کہا۔

کدار نے چپکے سے تصویر دیوار سے اتاری اور سر جھکا کر بولا

"اسے کہاں لگا دوں ——؟"

"کہیں نہیں ——!"

"پھر کیا کروں ——؟"

"اسے لیجا کر لیلا کے صندوق میں رکھدو"

کدار پنڈت جی کے ڈر سے کچھ نہ بول سکا۔ لیکن اسے اس بات سے بہت دُکھ ہوا کیونکہ وہ لیلا کو اپنی ماں سے بڑھکر سمجھتا تھا۔ پنڈت جی اس تصویر کو صندوق میں رکھوا کر لیلا کی یادگار کی تذلیل کر رہے تھے کدار کے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی۔ لیکن وہ کر ہی کیا سکتا تھا اس نے روتے ہوئے تصویر صندوق میں رکھدی۔

نیتا پنڈت جی کی پتنی بن کر آگئی۔ شادی سے کئی دن پہلے ہی کدار کو اس بات کا پتہ لگ چکا تھا۔ لیکن پنڈت جی نے اسے برات میں جانے سے منع کر دیا تھا۔ نیتا کو بھی شادی سے کچھ دن پہلے ہی معلوم ہوا کہ وہ پنڈت جی کے گلے منڈھی جا رہی ہے۔ یہ سن کر اسے بیحد صدمہ ہوا لیکن غریب کر ہی کیا سکتی تھی۔ اس نے دبی زبان سے اپنی ماں سے کچھ کہا سنا لیکن اُس نے بڑی سنجیدگی سے اپدیش دیا کہ ہندو دھرم شاستر کی رو سے اسے دم مارنے کا بھی ادھیکار نہیں۔ بس اس کا یہی فرض ہے کہ ماں باپ جو کچھ کہیں اسے چپکے سے مان لے اسی میں شاستروں کی مان مرجادہ اور اس کی بھلائی ہے۔ ماں کا اپدیش سن کر غریب نیتا کیا کہتی۔ چپ ہو رہی۔ اس نے اب تک اپنے دل میں سکھ کے سپنوں کی جو حسین دنیا بسا رکھی تھی۔ وہ اجڑ گئی۔ اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اس کا دل زبان بے زبانی سے دُعائیں مار مار کر رو رہا تھا۔ لیکن سماج، دھرم شاستر ماں باپ اور پنڈت جی کو اس کے دل، اس کے آنسوؤں اور اُس کی سسکیوں کی کیا پروا تھی؟ اس نے شادی کی دیوی پر چپ چاپ اپنے کو اسی طرح بلیدان کر دیا جس طرح ایک بے بس گائے اپنا سر قصاب کی چھری کے آگے جھکا دیتی ہے۔

کچھ ہی دنوں تک ساتھ رہنے کے بعد پنڈت جی کو پتہ چل گیا کہ اس بڑھاپے میں شادی کر کے اُنھوں نے بڑی بھول کی ہے۔ وہ نیتا کو کسی طرح بھی مطمئن نہیں کر سکتے تھے۔ وہ شاید نیتا کے سکھ کو کھانے کپڑے اور زیوروں ہی کی بھرمار پر موقوف سمجھتے تھے۔ اس لئے اُنھوں نے ان ساری چیزوں کو کافی سے زیادہ بندوبست کے ساتھ مہیا کر رکھا تھا لیکن انھیں کیا خبر تھی کہ لذیذ کھانے۔ چمکتے دمکتے گہنے کپڑے نیتا کو مطمئن نہیں کر سکتے۔

انتہائی جدوجہد کے بعد بھی اس سن میں پنڈت جی نینا کے دل کو سمجھنے میں ناکام ہی رہے۔ نینا جو کچھ چاہتی تھی جس کے لئے وہ ہر لمحہ بےچین رہتی تھی اس کا بہم پہنچانا پنڈت جی کے بس کی بات نہ تھی۔ نینا پیاسی تھی والہانہ محبت اور بیتاب چاہت کی ـــــ اور بوڑھے پنڈت جی کے پاس اس پیاس کو بجھانے کیلئے ایک قطرہ بھی نہ تھا۔ وہ کنواں کھود چکے تھے لیکن اس میں بھرنے کیلئے ان کے پاس پانی نہ تھا۔ نینا اُبلتی ہوئی پرشور ندی بننا چاہتی تھی۔ بھلا سوکھا کنواں بن کر کیسے رہ سکتی تھی۔

نینا ہر وقت اُداس رہنے لگی۔ اسے اصل میں دھوکہ دیا گیا تھا اسے پوری توقع تھی کہ وہ کسی نوجوان سے بیاہی جائیگی اور جب پنڈت جی اس کے گاؤں میں آئے تھے تو اُسے اُمید سی ہو گئی تھی کہ اس کی شادی کدار سے ہوگی۔

نینا گاؤں کی بیاہی ہوئی لڑکیوں سے ان کی سسرال کی باتیں اور ان کے نوجوان شوہروں کا ذکر سنتی تو وہ ایک ہنس مکھ ترچھے بانکے پتی کا تصور کرکے دل ہی دل میں پھولی نہ سماتی۔ لیکن بوڑھے پنڈت جی کے گلے پڑنے کے بعد اُمنگیں، افسردگیوں اور مسرتیں حسرتوں سے بدل گئیں۔

نینا جب سوچتی کہ پنڈت جی نے اپنے دھن کے بل پر اسے کند چھری سے ذبح کیا ہے تو اس کے غم و غصہ کی حد نہ رہتی۔ وہ جب سے ان کے یہاں آئی تھی۔ کسی دن کدار کو نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے پنڈت جی پر اسے اور غصہ آتا اسے اس بات کا پتہ نہ تھا کہ پنڈت جی نے کدار کو آنے سے منع کر دیا ہے وہ سمجھتی تھی کہ کدار اس سے ناراض ہو گیا ہے اس لئے وہ پنڈت جی کا گھر چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے۔ ایک روز وہ پنڈت جی سے پوچھ بیٹھی۔ "کدار اب یہاں نہیں آتا؟"

"نہیں ـــــ!"

"اب کہاں رہتا ہے؟"

"بورڈنگ میں۔"

"کیوں ـــــ؟"

"اب اس کی پڑھائی کے دن ہیں۔ وہاں رہنے سے جی لگا کر پڑھیگا ـــــ!"

"اور یہاں جی لگا کر نہ پڑھتا۔"

"گھر پر سو جھگڑے لگے رہتے ہیں۔"

"پہلے بھی تو یہی گھر تھا۔"

"جب اور بات تھی اب اور بات ہے۔"

"شاید میری وجہ سے اس کی پڑھائی کا حرج ہو۔"

"نہیں یہ بات تو نہیں ہے۔" پنڈت جی دبی زبان سے بولے۔

"شاید یہ بات ہو کہ وہ آپ کی راہ کا کانٹا ہو۔"

"نینا! تم اور ایسی باتیں ـــــ!"

"میں کچھ جھوٹ تھوڑا ہی کہتی ہوں۔ بڑھاپے کی شادی کے بعد یہی ہوتا ہی ہے۔ تنگ دل اور تنگ نظر بوڑھے شوہروں کی نگاہوں میں بےقصور بھی مجرم نظر آنے لگتے ہیں۔" نینا نے کسی قدر گرم ہوتے ہوئے کہا۔ پنڈت جی چپ ہی رہے۔

"کیوں کدار یہاں کبھی کبھی بھی نہیں آسکتا؟" نینا کچھ دیر ٹھہر کر پوچھنے لگی۔

"کیوں نہیں، کبھی کبھی آنے میں کیا حرج ہے؟"

"پھر کیوں نہیں آتا؟"

"یہ تو وہی جانے۔"

"اُسے بلائیے نا ایک دن۔"

"اُسے بلا کر کیا کرو گی؟"

"کھانا کھلاؤنگی، باتیں کرونگی۔"

"کسی تیوہار کے موقع پر آجائیگا۔"

"بورڈنگ میں رہنے والوں کو جب گھر کھانا مل جائے تو ان کے لئے جب ہی تیوہار ہے۔"

"اگر بلانا ہی چاہتی ہو تو بلا لوں گا۔"

دوسرے دن کدار آیا۔ لیکن پنڈت جی نے نینا اور کدار کو ایک لمحہ کیلئے بھی تنہا نہ رہنے دیا۔ وہ دونوں کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے تھے اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ نینا پنڈت جی کے سامنے تو اداس رہتی تھی اور کدار کو ضد کرکے بلوایا تھا اس لئے وہ دونوں پر نگاہ رکھتے تھے۔

کدار جونہی گھر پر پہنچا، نینا نے زور سے پکارا۔ "کدار ـــــ!"

"ہاں پنڈتانی جی ــــ!"

"پنڈتانی جی؟" نیتا نے تعجب سے کہا۔ اسے کدار کے مُنہ سے اس قسم کی بات سننے کی توقع نہ تھی۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ کدار کے لئے وہ اب بھی وہی نیتا ہے۔"

"ہاں اب تو آپ پنڈتانی جی ہیں" کدار نے سکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں اب میں پنڈتانی ہوں ...." نیتا نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا۔

پنڈت جی دونوں کی باتیں سُن رہے تھے اور ان کے بشروں کو بغور دیکھ رہے تھے۔ ابھی کدار کو آئے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ پنڈت جی نے نیتا سے کہا ــــ "جلدی سے کھانا کھلا دو۔ نہیں تو ٹھنڈا ہوجائے گا۔"

نیتا نے کھانا نکالا۔ کدار کے ساتھ پنڈت جی بھی بیٹھ گئے۔

کھانا کھاتے کھاتے نیتا نے کدار سے پوچھا۔ "اتنے دنوں تک آتے کیوں نہیں تھے؟"

کدار نے پنڈت جی کی طرف دیکھ کر کہا ــــ "آنا تو چاہتا تھا، لیکن کسی وجہ سے نہ آسکتا تھا۔"

"کیا مجھ سے ناراض ہو؟"

"بھلا ایسا ہوسکتا ہے ــــ؟"

"تو یہیں آکر کیوں نہیں رہتے ــــ؟"

"میں اب یہاں نہیں رہ سکتا۔"

"کبھی کبھی تو آجایا کرو۔"

"دیکھو وقت ملا تو آنے کی کوشش کرونگا۔"

"اتوار کو تو چھٹی ہی رہتی ہوگی۔"

"ہاں رہتی تو ہے۔"

"تو سارے دن پڑے پڑے کیا کرتے ہو؟"

"کرنا کیا ہے۔ اسکول کا کام کرتا ہے۔" پنڈت جی سے نہ رہا گیا بیچ ہی میں بول اُٹھے۔

"سکول کا کام چوبیس گھنٹے تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ کدار کبھی کبھی یہاں آکر کھانا کھا جایا کرو۔" نیتا نے کہا۔

پنڈت جی کچھ نہ بولے۔ کدار چلا گیا۔ اس روز کے بعد وہ دو بار پھر آیا اور دونوں ہی بار پنڈت جی کی موجودگی میں آیا۔ گو نیتا اور کدار کی باتیں نہایت صاف اور سیدھی ہوتی تھیں پھر بھی پنڈت جی کی بدگمانی بڑھتی ہی گئی۔ وہ نیتا کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اس نے جہاں ذرا سا کھڑکی سے باہر سر نکالا اور یہ کُڑھ گئے۔ وہ کسی سے ذرا بھی بولی اور اُنھوں نے فوراً ٹوک دیا۔ اس نے جہاں کدار کا نام لیا اور پنڈت جی جل بُھن کر خاک ہوگئے۔ غرض انھوں نے اپنے دل میں بدگمانی اور بے اعتمادی کی ایک بھٹی سلگا رکھی تھی جس میں رات دن جل رہے تھے۔

ایک روز پنڈت جی غصہ میں بھرے ہوئے گھر آئے۔ نیتا انھیں بے وجہ غصہ میں لال دیکھ کر سہم گئی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے ڈرتے ڈرتے دبی زبان سے پوچھا۔

"بتاتا ہوں ذرا بیٹھنے دو۔" پنڈت جی کڑک کر بولے۔

پنڈت جی بیٹھ گئے نیتا پاس ہی کھڑی ہوگئی۔

"مجھے پتہ نہ تھا کہ تم ایسے چرتر کرسکتی ہو؟"

"کیسا چرتر؟ کیا ہوا ــ؟" نیتا نے تعجب سے پوچھا۔

"میں نے تمھاری ایک چوری پکڑی ہے۔"

"چوری ــــ؟"

"ہاں! چوری ــــ!"

"کیسی چوری ــــ؟"

"لو دیکھو!" کہہ کر پنڈت جی نے اُس کے ہاتھ میں ایک خط دیدیا، نیتا نے خط پڑھا اور کہا۔

"یہ میں نے کدار کو لکھا تھا۔ اس میں آپ نے چوری کیا پکڑی ہے۔"

"تم نے یہ خط چوری سے لکھا تھا یا نہیں ۔؟"

"مجھے چوری سے لکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اس میں کوئی ایسی بات تو ہے نہیں جسے میں چھپاتی۔ میں نے اسے کھانے کیلئے آنے کو لکھا تھا۔"

"اسے کھانے کیلئے بلانے کی کیا ضرورت تھی ۔؟"

"باتیں کرتی، دل بہلاتی ــــ!"

"باتیں کرنے کے لئے کیا میں مر گیا ہوں۔ وہی باتیں مجھ سے کیا نہیں کی جاسکتیں ۔؟"

کتنی باتیں ایسی ہیں جو آپ سے نہیں کی جاسکتیں - یہ سچ ہے
کہ آپ میرے پتی ہیں لیکن آپ میرے دل کو نہیں سمجھ سکتے - آپ بوڑھے
ہیں میں جوان ہوں - اگر کبھی کبھی کسی ہمسن سے باتیں کر لوں تو اس
میں آپ کا بگڑتا ہی کیا ہے ؟"

"ارے بگڑتا کیا ہے ؟ --- میرا نام، میری عزت، میری مرجادہ
یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے - پوچھتی ہو بگڑتا کیا ہے ؟"

"آپ کا نام، آپ کی عزت، آپ کی مرجادہ! دنیا میں آپ کے
لئے یہی سب کچھ ہے - لیکن آپ خود ان سب کی حفاظت کرنے سے عاجز
ہیں - جب آپ سولہ برس کی لڑکی سے شادی کرنے چلے تھے تو ان سب
باتوں پر غور نہیں کر لیا تھا - آپ نے ایک لڑکی کے جذبات کا کچھ بھی لحاظ
نہ کیا اور اسے صرف پتھر کی مورتی سمجھا - لیکن خود اس بڑھاپے میں جوانی
کی بہار لوٹنا چاہتے ہیں - آپ ایک بے قصور لڑکی کو ہوس کی دیوی پر
بھینٹ چڑھا کر اپنے حرص کی آگ بجھانا چاہتے ہیں - کیا یہی آپ کی
عزت، آپ کی مرجادہ ہے - ؟"

نیتا اتنا کہہ کر روتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی - پنڈت جی
سر جھکا کر کچھ دیر سوچتے رہے -"

پنڈت جی نے نیتا کا خط اگرچہ پڑھ لیا تھا اور کدار کو اس کے یہاں
جانے سے روک دیا تھا پھر بھی وہ نہ مانا اور مقررہ وقت پر نیتا کے پاس
پہنچ گیا - پنڈت جی اس وقت سکول گئے ہوئے تھے -

"نیتا اب میں یہاں نہ آیا کروں گا" کدار نے کہا -

"کیوں ---؟"

"اس لئے کہ ہمارے دل کتنے ہی پاک اور صاف ہیں پھر بھی
ہمارا اس طرح ملنا جلنا خطرے سے خالی نہیں - تم نے کبھی سوچا کہ ہمارے
اس طرح ملنے جلنے کا انجام کیا ہوگا - میں تو سمجھتا ہوں ہمارا اس طرح
ملنا جلنا کسی کے لئے آرام کا باعث نہ ہوگا"

"ہاں کدار! میں بھی خوب سمجھتی ہوں لیکن میں نے کبھی نہیں سوچا
کہ انجام کیا ہوگا؟ میں تو اس مسافر کی طرح ہوں جو بغیر کسی مقصد و مدعا
کے دشوار گذار راہوں کو صرف اس لئے طے کرتا ہے کہ سفر کرنے میں اُسے
ایک طرح کی لذت اور مسرت محسوس ہوتی ہے - میں تم سے آج صاف
صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ تم سے ملنے جلنے میں میری کوئی غرض وابستہ
نہیں ہے"

"میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا ملنا جلنا کسی غرض کی بنا پر نہیں ہے بلکہ
فطری جذبہ کے ماتحت ہے لیکن پنڈت جی کے دل میں بدگمانی کی جو آگ
سلگ رہی ہے اس کا انجام اچھا نہیں نظر آتا"

"بدگمانی اور بے اعتمادی کی آگ اُنہی نے لگائی ہے اس لئے
اس میں انہیں جلنا ہوگا ......"

نیتا جملہ پورا نہ کرنے پائی تھی کہ کسی نے باہر سے دروازے کی
کنڈی کھٹکھٹائی - نیتا نے دروازہ کھولا - غصہ میں بھرے ہوئے پنڈت
جی گھر میں داخل ہوئے - کدار کو دیکھتے ہی آگ بگولہ ہو کر بولے - "تو
یہاں کہاں ---؟"

کدار چپ رہا -

"انہیں میں نے بلوایا تھا" نیتا نے دبی زبان سے کہا -

"تم چپ رہو - یہ میرا گھر ہے - میں جسے نہ چاہوں گا وہ یہاں قدم
بھی نہیں رکھ سکتا"

"یہ تو مجھے ذلیل کرنا ہے" نیتا نے کسی قدر گرم ہو کر کہا -

"تمہیں اپنے دھرم کا لحاظ کرنا چاہئے"

"آپ نے بھی تو اپنے دھرم کا کبھی لحاظ نہیں کیا - مرد تو دھرم کے
نام پر جا و بیجا سب کچھ کرتے چلے جائیں سماج اُن سے پھوٹے مُنہ باز پرس
بھی نہ کرے لیکن غریب عورت اُف بھی کرے تو کشتنی و گردن زدنی
ہے - واہ رے انصاف ---"

پنڈت جی نے نیتا کے جواب میں کچھ نہ کہا - کدار ایک طرف
چپ چاپ کھڑا تھا - اس سے کہا "ہوسٹل چلا جا ---" کدار چلنے لگا
تو نیتا درمیان میں آ کر کھڑی ہو گئی - اور بولی "کدار --- ابھی
نہ جاؤ، بیٹھو ---"

"نیتا --- !" پنڈت جی چلائے -

"آپ کدار کو یہاں سے بھگائیں گے تو میں بھی اس گھر سے نکل
جاؤں گی" نیتا نے گرم ہو کر کہا -

نیتا کی بات سن کر پنڈت جی آپے سے باہر ہو گئے اور پاس ہی رکھی ہوئی چھڑی اٹھا کر نیتا کو پیٹنے لگے۔ اس کے سر سے خون بہنے لگا۔

"اب تک میں نے پوری نیک نیتی سے آپ کے ساتھ اپنے دھرم کو نباہنے کی کوشش کی لیکن اب میں آپ کے برتاؤ سے تنگ آ کر کھلے بندوں باپ کا سودا کرنے جا رہی ہوں۔ آپ نے جس نام، جس عزت جس مرجادہ کے پیچھے انسانیت کو ٹھکرا دیا ہے آج میں اس پر کلنک کا ٹیکہ لگانے جا رہی ہوں۔" یہ کہتی ہوئی نیتا گھر سے باہر نکل گئی۔

نیتا کا پتہ لگانے کیلئے پنڈت جی نے بہت دوڑ دھوپ کی لیکن اس کا کہیں سراغ نہ لگا۔ جب ہر طرف سے ناکام ہو کر بیٹھے تو لیلا کی یاد آئی۔ اس کے آخری الفاظ کانوں میں گونجنے لگے اور پنڈت جی بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ انھیں اب احساس ہوا کہ انھوں نے کتنا ظلم کیا ہے!

پھر دیر بعد جب پنڈت جی کے آنسو تھمے تو اٹھکر دھیرے دھیرے لیلا کے کمرے کی طرف چلے بہت دنوں کے بعد آج انھوں نے لیلا کا صندوق کھولا اور اس میں سے اس کی تصویر نکال کر مجرمانہ انداز سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے ان کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ انھوں نے جلدی سے تصویر اٹھا کر سینے سے لگائی اور پچھاڑ کھا کر زمین پر گر پڑے۔

غزل

از جناب محمد یوسف صاحب یوسف نارنولی

میں خیر در دِ عشق کے قابل نہیں رہا
دل بھی تو اضطراب کا حامل نہیں رہا

اے اضطرابِ عشق تحمّل سے کام لے
میرا دلِ حزیں ترے قابل نہیں رہا

آئی بہار کردے رہا اے جنونِ عشق
زنداں میں اب میں رہنے کے قابل نہیں رہا

جس دن سے دل ہوا مری کشتی کا ناخدا
اُس دن سے بحرِ عشق کا ساحل نہیں رہا

ٹوٹے پڑے ہیں جام و سبو بادہ کش اُداس
بادہ فروش رونقِ محفل نہیں رہا

مجھ پر تھا نازِ عشق کو نازاں تھا دل پہ میں
اب کوئی فخر و ناز کے قابل نہیں رہا

پیہم صدا یہ آتی ہے صحرائے نجد سے
دُنیائے عشق میں کوئی کامل نہیں رہا

بے پردہ ہو کے سامنے آئیگا کیا مرے
میری نظر کا وہ متحمّل نہیں رہا

اِس کو کیا ہے تیری محبت نے ہوشیار
یوسف جنونِ عشق میں غافل نہیں رہا

نقشِ وفا

از جناب شیخ باقر حسین صاحب وفاؔ اکونٹنٹ اناؤ

وہ دن کہاں کوئی پردہ کوئی حجاب نہ تھا!
بہار پر ترا جب گلشنِ شباب نہ تھا!

جنابِ شیخ کی قسمت میں یہ ثواب نہ تھا
ہزار نعمتیں تھیں ساغرِ شراب نہ تھا

ہمیں سے شرم ہمیں سے ہے اس قدر پردہ
ازل میں، وادیٔ ایمن میں کچھ حجاب نہ تھا

نگاہِ شوق ہی شاید ہے پردۂ دیدار
جب اُن کو دیکھنے والے نہ تھے حجاب نہ تھا

بُھلا دیا اُنھیں پیری نے اس طرح گویا،
کبھی زمانۂ طفلی، کبھی شباب نہ تھا

بنایا صانعِ قدرت نے تجھکو لاثانی،
نہ ہے، نہ ہوگا ترے حُسن کا جواب، نہ تھا

گِلہ حجاب کا ناحق ہے تھی کمی اپنی
کہ شوقِ دید باندازۂ حجاب نہ تھا

وہی تھا دید کا ارماں وہی تمنّائیں
فنا کے بعد فقط دل کا اضطراب نہ تھا

اُسی کی ذات میں پنہاں تھا رازِ کُن فیکوں
خراب اب ہے ہمیشہ بشر خراب نہ تھا

دراز ہوتے ہی تربت میں کھُل گئیں آنکھیں
کبھی خیال میں میرے یہ فرشِ خواب نہ تھا

ہمیں خلاف رہے عمر بھر زمانے کے
خراب ہم تھے زمانہ کبھی خراب نہ تھا

عبث شباب میں امیدِ عاقبت بینی
کہ غور کا متحمل کبھی شباب نہ تھا

تمام عُمر رہا شغل گریہ و زاری،
مرے عمل میں کچھ اندیشۂ عذاب نہ تھا

زمانے بھر کے لئے تھا وہ ایک درسِ عمل
مری زبان پہ افسانۂ شباب نہ تھا

بیانِ جور و جفا، ذکر تھا تغافل کا
کتابِ حُسن میں لیکن وفاؔ کا باب نہ تھا

ریاض بحیثیت ادیب و نثار

ایک قیمتی ادبی مقالہ

از حضرت خبیر بھوروی

میرے "مقالے" کا موضوع "بیان ہندوستان کے حافظ" "خیام" لسان الملک حضرت ریاض مرحوم کی "ادبی حیثیت" "نثری قابلیت" کی تقریب و تعارف سے متعلق ہے۔ لیکن جس طرح "مشاہدۂ حق کی گفتگو" "بادہ و ساغر" کہے بغیر نہیں بنتی ——— میں سمجھتا ہوں یہ "مقالہ" بھی تشنہ رہ جائیگا اگر اسی سلسلے میں شوخ طبع ریاض کی رنگین شاعری کی لذیذ حکایت بیان نہ کی گئی اور یوں بھی نثر نظم سے اور نظم نثر سے الگ کوئی چیز نہیں ہے جس کا ایک دوسرے کے سامنے نام لینا گناہ سمجھا جائے۔ بلکہ میرا ادبی "ایمان" تو یہ ہے کہ جس طرح "خزاں" "بہار" کی گود میں سوئی رہتی ہے اسی طرح نظم نثر کے پہلو میں دبکی رہتی ہے۔ نہ اس کی آغوش سے اس کو جدا کر سکتے نہ اس کی گود سے اس کو ——— اس لئے مقطع میں اگر سخن گسترانہ بات یعنی ریاض کی شاعری کا ذکر جمیل آجائے تو اسے قلم کی غیر محمود جنبش نہ سمجھی جائے۔

ریاض مرحوم کی "ادبی حیثیت" اور "مرتبۂ انشا پردازی" کی "دستاویز" پیش کرنے سے پہلے عرضی دعوی کو وزن دار بنانے کے لئے ہندوستان کے "معتبر ادیب" اور "نامور انشا پرداز" ایم مہدی حسن مرحوم صاحب افادی الاقتصادی کی تحریری شہادت پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ "قوت فیصلہ" اس دعوی کو ستائشی جنبش قلم اور انشا پردازی کا اضطراری حسن سمجھ کر غلط رائے کا اعلان نہ کر دے۔

"اردو لٹریچر کا دم واپسیں" اس عنوان سے ۱۹۱۴ء میں مہدی مرحوم نے اپنے تاثرات کا اظہار فرمایا تھا جس کے سلسلے کی ایک کڑی یہ تھی۔

"اردو لٹریچر جب تک باقی ہے۔ "ریاض - احمد علی شوق" شرر اور سرشار ہمیشہ محبت آمیز عزت کے ساتھ یاد کئے جائینگے۔ موجودہ لٹریچر کی خلاقی میں یہ اپنے ہاتھ نہ سہی بائیں ہاتھ کی حیثیت قطعاً رکھتے ہیں آج ریاض اور شوق کی لطافت نثر گذشتہ تاریخ کا بھولا ہوا سبق ہے لیکن کل کی بات ہے جب یہ دونوں اپنے وقت کے بہترین پرچوں میں داد سخن دے رہے تھے آئندہ دنیا کو زیادہ سے زیادہ مٹی ہوئی شاعری کی حیثیت سے جانے گی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ "نظم" کے ساتھ یہ "نثر" کے بھی "آقا" تھے۔"

یہ اس "ماہر ادب و انشا" کی بے لاگ زندہ شہادت ہے جس کی ادبی ہستی نے علامہ شبلی مرحوم کی معیاری زبان ستائش میں "نذیر احمد و آزاد" کی دو روحوں نے ایک قالب اختیار کر لیا تھا۔"

(مکاتیب شبلی جلد ۲ صفحہ ۲۲۸)

ادیب مہدی مرحوم کی پیشین گوئی کی صداقت کا اثر دیکھئے ——— آج دنیا "ادیب و نثار ریاض" کو صرف مٹی ہوئی شاعری کی حیثیت سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ اور تو اور "علائق کے فریب زدوں" کا وہ "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کہنے والا سازشی گروہ بھی جو خادم زبان و ادب

کا کاغذی مرثیہ ہے اور جو بخیال خود انتہائی تحقیق و تفتیش کا چراغ جلا کر اردو زبان کے ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ لکھنے بیٹھتا ہے ریاض مرحوم کا ادبی مرتبہ نہیں جانتا پہچانتا۔

درآنحالیکہ جس وقت مرحوم سرسید "تہذیب الاخلاق" کی روشنی میں اصلاح مذہب و ملت کا پاکیزہ ترین لٹریچر پیش کر کے محراب و منبر کو بے نقاب کر رہے تھے اور خانبہادر میر ناصر علی رسالہ چودھویں صدی کی شمع جلا کر علمی مناظروں کی شان بڑھا رہے تھے اس وقت "ریاض" "ریاض الاخبار" "گلکدۂ ریاض" "صلح کل" "فتنہ" اور "عطر فتنہ" نکال کر ادب و انشاء کا عطر افشاں خزانہ لٹا رہے تھے۔

افسوس ہے کہ حضرت ریاض کا کوئی سرمایہ ادب و انشاء محفوظ نہیں ہے اور نہ زمانے کے بیدداد اور فراموش کار مورخین "زبان و ادب" نے اس کی حفاظت کے لئے قلم کو جنبش دی ورنہ وہ ریاض کا مخصوص ادب جو انہیں کے ساتھ خاموش ہو گیا آج اردو زبان کی آبرو بڑھاتا ہوتا۔

"اس تنگئ گلستاں سے بہار" کا قیاس کرنے کے لئے مرحوم کے چند خطوط کے اقتباسات پیش کر کے خاموش ہو جاؤنگا۔

رئیس القلم جناب نیاز مدیر نگار کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "قسمت بھی بری، بدخط بھی۔ مجھ سے اپنا لکھا خود نہیں پڑھا جاتا۔ حرف نہیں قسمت کی آڑی ترچھی لکیریں ہیں۔"

اسی خط میں دوسری جگہ لکھتے ہیں "لکھنؤ اس لئے آؤنگا کہ ہلال صیام بن کر زار رونا تو ان خیرآباد واپس آجاؤں۔ ماہ مبارک کا آغاز لکھنؤ میں ہونے پائے۔ بھوک کا مزہ گھر پر لطف دیتا ہے۔

مرے موئے پڑے رہتے ہیں رات دن گویا
ہماری عمر میں شاید مہ صیام نہیں!

روزے دار کی رات مزے کی ہوتی ہے۔ میں نے خود کہا ہے۔

روزے نہیں ہیں سخت یہ سب باتیں ہیں — ہاں لطف فزا شب کی ملاقاتیں ہیں
یاروں میں مہ صوم کی تعریف یہ ہے — کچھ ہجر کے دن وصل کی کچھ راتیں ہیں

مگر مجھ سے مفلس گرسنہ کیلئے رات دن برابر مرے ہوئے پڑے رہنا اچھا کہ مہ صیام شمار عمر میں نہ رہے۔"

ایک دفعہ نیاز صاحب نے مرحوم سے ان کی تصویر نگار میں شایع کرنے کے لئے طلب فرمائی جس کے جواب میں لکھتے ہیں۔

"نیاز صاحب! آپ میری تصویر کو بڑھاپے میں روشناس خلق یا رسوائے عالم کرنا چاہتے ہیں۔

میں پھرا اس در سے تو خلقت تماشائی ہوئی
لگے آگے داغ پیچھے پیچھے رسوائی ہوئی

میں خود بھی اپنی صورت دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ اوروں کی نسبت کیا عرض کروں وہ دن گئے۔

دنیا کی پڑ رہی ہیں نگاہیں ریاض پر
کس وضع کا جوان ہے کس آن بان کا

یہ کہنے کا موقع کہاں۔

تم جوانی کے مزے لوٹو ریاض — عیب بھی نیا مرا اس سن کیلئے

اب تو میرے لئے ہر ایک کو مجبوراً یہ کہنا پڑیگا۔

جنت میں بھی یہ پیر جواں ہو نہیں سکتا

گو بڑھاپے کی بڑھی ہوئی ہوس اس عمر میں بھی یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے۔

دے پیر مغاں دختر رز عمر رسیدہ
بوڑھا ہوں ملے نور نظر چرخ کہن کی

وہ زمانہ بھی غنیمت تھا جب صوب چھاں یا نیم سپید ریش کسی کے دست حنائی سے رنگ حنا کی خواستگار ہوتی تھی۔ اور کسی موقع پر خانبہادر سید احمد حسین صاحب رضوی لکھنوی سے یہ سننا پڑا تھا۔

حنا لگا کے پہنچتے ہیں گھر خوں میں ریاض
کچھ ان کی ریش مبارک کا اعتبار نہیں

یا خداوند نعمت حضور مہاراجہ صاحب بہادر بالقابہ والی محمود آباد (اودھ) صورت دیکھتے ہی ارشاد فرمایا کرتے تھے۔

بڑے نیک طینت بڑے صاف باطن
ریاض آپ کو کچھ ہیں جانتے ہیں!

خود بھی رنگینی خضاب کے اسباب فراہم کر کے شوق خضاب میں کہنا پڑتا ہے۔

خوب ہیں شاہدان بازاری — ہم سیہ کار وہ خضاب فروش

دیکھیے کالا منہ کرنے کے محاورے کو کس حسن سے ادا کیا ہے ایسے ابتذال پر غیر مبتذل صدہا شعر صدقے۔ آپ بھی غالباً قدر کرینگے گو بہ [illegible]

ریش گوری کالی یعنی سیاہ وسپید دونوں سے آپ بے نیاز ہیں۔

کالی گوری کے مبتذل استعمال نے اس وقت ایک شعر بے محل اور ریش سے غیر متعلق یاد دلوایا۔ شاید اُڑتی جوانی اور ریش آہن کردہ سے کوئی دور کا تعلق ہو۔ آپ جبین پر بل ڈال کر یا دل ناخواستہ وہ میرا مبتذل شعر بھی سُن لیجئے مگر کوشش فرمایئے گا کہ میرے قدردان مہربان مولوی عبدالسلام صاحب ندوی مؤلف شعر الہند تک نہ پہنچنے پائے۔

کالی۔ گوری کوئی نہ چھوٹی، افیون کھاکر، پی لی، تو بہ

آپ اس زمانہ میں تصویر شائع کر رہے ہیں۔ جب ریش سفید پر کوئی رنگ ہی نہیں چڑھتا۔ نہ ساون کی مہندی کام دیتی ہے نہ کسی شوخ کے لب نازک سے شراب کی کلیاں ——!

اب ریش سفید نے دراز عمر شیخو خیت سے زیادہ اعتبار پیدا کرلیا ہے کبھی کبھی "دراں بجیہ دہ خر گوشے" بھی سن لینا پڑا ہے مگر "قصر نماز" کی طرح "قصر ریش" کی طرف مائل نہ ہوئی۔

اس وقت ریش مبارک کے ذکر میں ایک غیر متعلق قصہ عنفوان شباب یا اس سے کچھ پہلے کا یاد آگیا اسے بھی سن لیجئے اب تو بہ اعتبار ریش وبروت یہ کہنے کے قابل بھی نہیں ؎

تشنہ تھا مرا شباب، پی لی

بھیگیں جو مسیں شراب پی لی

یہ وہی زمانہ ہے کہ بغیر شراب کے مسیں بھیگ رہی تھیں۔

واقعہ یہ ہے کہ لکھنؤ میں کسی تقریب سرکاری کے [illegible] سے کچھ والیان ملک بھی آئے تھے۔ داروغہ عباس علی مرحوم انجینیر وکیلئے فن فوٹوگرافر کے دولت خانے پر جس کا اب نشان تک نہیں ہے چند معتمد نوابین ورؤسائے شہر تشریف فرما تھے۔ منشی نولکشور آنجہانی بھی موجود تھے اور میں بھی تھا۔ اتنے میں ایک رئیس با اختیار مع مختصر اسٹاف کے "مرغ زریں" بنے آتے نظر آئے۔ اطلاع کے ساتھ ہی سب حضرات تعظیماً استقبال کے لئے بہ عجلت بڑھے۔ دیکھا کہ ریش دونوں جانب پلٹے پر چڑھی ہوئی۔ شکل شتیں۔ چہرہ غضبناک۔ نہ سلام میں خود سبقت کی نہ سلام کا جواب دیا۔ زبان پر لکھنؤ کا نام اور صد ہا صلواتیں۔ لعنت اور پھٹکار کی بار بار تکرار اس طرح مقام نشست تک تشریف لائے۔ اور با وصف تلخ گوئی اعزاز کے ساتھ بٹھائے گئے۔ مگر گفتار وکردار ولہجہ میں فرق نہ آیا۔ مزاج پرسی کی جرأت کون کر سکتا تھا۔ وہ البتہ سنبھلے درشت سے مزاج پرسی فرمائے جاتے تھے۔ کچھ دیر کے بعد جب زبان تالو سے لگی تو ایک سن رسیدہ گرم وسرد دیدہ نواب صاحب نے بادب عرض کیا۔ لکھنؤ سے برافروختگی کا سبب معلوم ہو تو ہم بھی ہم نوا ہونے کی جرأت کریں۔ فرمایا یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے اسلامی شہر مگر جسے دیکھئے ڈاڑھی صاف۔ مسلمان وغیر مسلمان میں امتیاز نہیں۔ نہ مصافحہ ومعانقہ کا موقع نہ سلام علیک کا۔ ساتھ ہی پھر لعنت کی تکرار سلسلہ ٹوٹنے پر مسن نواب صاحب نے عرض کیا۔ برافروختگی کا سبب تو معلوم ہوگیا مگر حضور نے خود سبب نہ دریافت فرمایا بہ ادب عرض کرتا ہوں سنئے!

غدر سے پہلے میں بھی اور سب مسلمانان لکھنؤ بھی ریش کے رکھ رکھاؤ میں آپ ہی کے مقلد تھے ایک روز میں خط بنوا رہا تھا۔ آئینے پر نظر تھی۔ اطلاع پر اطلاع مسجدوں امام باڑوں کے منہدم کئے جانے اور بے احتیاطی برتنے کی آرہی تھی۔ دفعتہً اطلاع ملی کہ نواب آصف الدولہ کا مشہور امام باڑہ اور اس کی وسیع وحسین مسجد گھوڑوں کا اصطبل بنا دی گئی نہ روک تھام کی طاقت تھی، نہ انتقام کی۔ میں نے مشتعل ہو کر خاص تراش سے کہا کہ ریش رکھ کر مسلمان صورت رہوں اور یہ خبریں سنوں تو اسے صاف کردے۔ اس کے بعد ہی رئیس صاحب کی طرف ہاتھ بڑھا کر لعنت ہے اس داڑھی پر پھٹکار ہے اس داڑھی پر۔ جواب میں خاموشی تھی اور سناٹا۔ وہ سین اس وقت تک خیال کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ مسن نواب کے وقتی جواب سے بہتر ایسے کج خلق رئیس کیلئے اور کیا ہو سکتا تھا؟"

اسی خط میں ایک جگہ اپنے اشعار کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں۔

"میں شعر صرف اپنے لئے کہتا ہوں جو ایسا نہیں سمجھتے ان کو اپنے مذاق کے خلاف خواہ وہ مبتذل اشعار ہوں یا عریاں موقع اور محل کے لحاظ سے ضرورتاً استعمال کرنا چاہئے ورنہ تضیع وقت اور ان کے عریاں مبتذل مذاق کا ثبوت!

"ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مقامے دارد"

ابھی عرض کر چکا ہوں ع

"کالی، گوری، کوئی نہ چھوٹی!"

جو مبتذل بھی ہے اور عریاں بھی ہے گر دوسرے مصرعے نے نہ ابتذال باقی رکھا نہ عریانی ضرب المثل کا موقع سے استعمال ہوگیا اور لعنت ٹکا رو کے لئے سند کی دقت رفع ہوگئی ہیں نے یہ مثالاً کہا نہ کہ اس خیال سے کہ میرے اشعار سند کا کام دینگے۔ دوسری مثال امیر مینائی کے کلام سے پیش کرتا ہوں۔ ارشاد فرماتے ہیں۔ ع

"سینہ پہ چڑھ کے جس نے کیا پیار کیا ہوا"

اس سے زیادہ ابتذال اور عریانی کیا ہوسکتی ہے۔ یہ کمال شاعری ہے کہ مصرع مبتذل کیلئے مصرع بہم پہنچانا ناممکن تھا۔ نہ اب قوت شعری کوئی دوسرا مصرع بہم پہنچانے کیلئے کارفرما ہوسکتی ہے۔ اب مصرع اول کے ساتھ دوسرا مصرع ملاحظہ فرمایئے۔ ے

اُترا ہوا گلے کا ترے ہار کیا ہوا؟
سینے پہ چڑھ کے جس نے کیا پیار کیا ہوا؟

جناب داغ ارشاد فرماتے ہیں ے

ایسے کو تو خدا کی قسم چھوڑنا ہے کفر
مٹی کی بھی ملے تو ردا ہے شباب میں

یہ شعر داغ صاحب موزوں نہ فرماتے تو ضرب المثل کیلئے سند کا ملنا دقت سے خالی نہ تھا۔ واقعاتی اسلوب بیان ایسا ہے کہ با وصف ابتذال ادھر اُدھر ہا دہ ہوگیا۔ قسم شاہد پرستی کے اعتبار سے ہے یا اثر حسن و شباب کا تقاضا طبیعت پر قابو نہ رہنے کی حالت میں وہی اثر قسم کے استعمال کا حامی ہے۔ یہ شعر خود ہی اجازت نہیں دیتا کہ بے محل اس کو زبان پر لایئے۔ اس کا ابتذال بے محل سنانے والے کیلئے الزامی صورت پیدا کرتا ہے۔ نہ کہ کہنے والے کے لئے۔ غالب کا شعر ملاحظہ فرمایئے جس کا مسلمہ صحیح مذاق سخن اور پاکیزگی زبان و قدرت بیان اوروں میں کم پائی جاتی ہے۔

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

قدرت بیان نے بیساختہ زبان کے اتفاقی واقعات کے اس سخت قافئے کو موزوں کرنے میں شاعری کے کمال فن کو ظاہر کردیا۔ علیٰ ہذا مستند شعرائے متقدمین و متاخرین کے کلام میں ایسے ابتذال و عریانی کے اشعار بھی پائے جائیں گے۔

مجھے کہنا صرف یہ تھا کہ میں شعر اپنے لئے کہتا ہوں مگر اور لوگ بھی لطف اندوز ہونے میں اپنا حق سمجھتے ہیں تو بہ اعتبار موقع و محل ان کا استعمال کریں ورنہ الزام ان کے سر۔ ان کی خاطر سے اخلاقی طور پر میں اپنے سر ہی مبتذل گوئی و لغو گوئی کا الزام لے لونگا اور آفرین کے عوض نفرین کو اپنا حصہ سمجھونگا۔ ے ریاض

تحسین ناشناس کا صائب ہے شکوہ سنج
نفرین ناشناس کا ہم کیوں گلہ کریں

مجھے اس وقت دور حاضر کے مہذب تعلیم یافتہ شعراء کے مذاق اور زبان شعری سے بحث نہیں ہے وہ صحیح ارتقائی حالت میں ہو یا اس کے برعکس مجھکو دور آخر کے مستند اساتذہ و ثقات شعراء سے ملنے اور مستفید ہونے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان کے لطیف اشعار کا تو کیا ذکر۔ ان کی ہر بات نقش دل ہے۔ میں نے مذاق شعری میں عاشقانہ رنگ ہو یا صوفیانہ یہاں تک کہ سوقیانہ بھی با اعتبار نوعیت کلام قریب قریب یکسانیت دیکھی گو کہنے کا جادہ جدا ہوتا تھا۔ ان کی انتخابی یکسانیت نے جو متقدمین کے تتبع سے علیحدہ نہ تھی صحیح مذاق سخن کا معیار ہمیشہ کے لئے میرے خیال میں پیدا کردیا ہے۔ موجودہ دور میں مغربی شعری مذاق نے احترامی تغیرات ضرور پیدا کئے۔ جن سے نظم و نثر دونوں میں ارتقائی شان کا خاص رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ اب ہندی نامانوس الفاظ کی جدید آمیزش کا زیادہ بیجا حصہ اسی طرح دکنی اختراعی اصطلاحات (جو مستند اہل زبان کے اتفاق رائے سے غالباً محتاج ہے) ٹکسالی اُردو پر کب تک اور کہاں تک اثر ڈالیں گے ابھی نہیں کہا جاسکتا۔ اور وہ جگہ حاصل کرنے کے بعد دیرپا بھی ہوگا یا نہیں۔ تراجم کی خصوصیات اور انہا ہی زبان کی ہمہ گیر وسعت آئندہ یہ ترقی جو صورت ٹکسالی اُردو کے لئے اختیار کرے با عتبار بلندی مضامین نہ پاکیزگی تخیل ٹکسالی خصوصیات چھوڑ کر اُردو زبان بہت کچھ سرمایہ دار ہوگئی ہے۔ خدا کرے صحیح زبان اور صحیح مذاق سے جو بیگانگی یا بے نیازی پائی جاتی ہے وہ جاتی رہے۔ کاش انگریزی مذاق و خیالات کے متبع حضرات ایسے اشعار موزوں کرنے کی طرف اور زیادہ توجہ کو دخل دیں۔ جو مغربی اور ایشیائی مذاق دونوں میں اعلیٰ درجہ مقبولیت

حاصل کریں۔

مجھے یاد ہے غازی پور میں شاہ احمد اللہ مرحوم سب جج اور شاہ امجد اللہ مرحوم منصف کے دولتخانے پر چند حضرات بی۔اے۔ایم۔اے پاس تشریف فرما تھے۔ ایشیائی شاعری کے متعلق کسی قدر بڑے پہلو کو لئے ہوئے اظہار خیالات ہو رہا تھا۔

میں نے عرض کیا۔ میر انیس مرحوم و مغفور کے نیچرل مناظر کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ میں امیر مینائی کا ایک شعر سنانا چاہتا ہوں شاید وہ اس صحبت میں درجہ قبولیت حاصل کرے اور آپ حضرات اس سے بہتر یا اس کے برابر کسی انگریزی شعر کے ترجمے سے مجھے ممنون فرمائیں۔ اجازت ملنے پر میں نے یہ شعر سنایا ؎

لچک ہے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں
بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

میں نہیں کہہ سکتا۔ سننے والوں پر کب تک وجد کی حالت طاری رہی۔ ممکن ہے یہ صورت میرے بنانے کے لئے اختیار کی گئی ہو۔ کبھی کبھی شعراء کے قلم سے ایسے ایسے شعر نکل جاتے ہیں جو مغربی مذاق سے خراج تحسین حاصل کرتے ہیں۔

تقریباً تیس سال سے زیادہ زمانہ ہوا کہ میرا ایک شعر کسی ولایت کے اخبار میں کسی خاص وجہ سے درج ہو گیا۔ جسے "پانیر" نے بھی اور "سول اینڈ ملٹری گزٹ" لاہور نے بھی لیا۔ یہ اتفاق ہے کہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کا وہ ترجمہ خانبہادر سید ناصر علی خاں صاحب حال پنشنر انسپکٹر نمک مالک "صلائے عام" دہلی کی نظر سے گذرا۔ ممدوح نے وہ شعر اور اس کا نوٹ تراش کر مجھے بھیجدیا۔ اور اس کے ساتھ جو الفاظ مجھے لکھے میں لے انھیں مایہ ناز سمجھا سے متعدد خطوط بھی انگریزی داں حضرات کے میرے پاس آئے اور خاص الفاظ سے میری عزت افزائی کی گئی۔ برسبیل تذکرہ وہ شعر ذیل میں درج کئے دیتا ہوں ممکن ہے آپ کو بھی پسند آجائے اور پسند فرمانے میں میرے لئے اخلاقی رعایت سے کام نہ لیا جائے ؎ ریاضؔ

عالم ہُو میں کچھ آواز سی آجاتی ہے
چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دل کا

خطوط انسانی زندگی کا "بے تکلف" مرقع ہوتے ہیں اور بقول مہدی مرحوم "بے تکلف تحریروں میں چونکہ اہتمام کو دخل نہیں ہوتا۔ یعنی اظہار خیال میں صنعت گری طبع کی جگہ صرف آمد جذبات ہوتی ہے اس لئے لٹریچر کا یہ ایسا اضطراری حصہ ہے جو لکھنے والے کے مرتبہ انشا پردازی کی صحیح غمازی کرتا ہے"

مرحوم ریاض کے یہ خطوط "نگار" ۱۹۳۱ء میں بعنوان "حضرت ریاض آپ اپنے آئینہ میں" شایع ہو چکے ہیں اور بلاشبہ بغیر کسی اہتمام اور صنعت گری کے منتشر خیالات کے تحت میں لکھے گئے ہیں۔ جہاں ترتیب و تہذیب اور نظم و اصول کو دخل نہیں تھا۔ لیکن ہر فقرہ ریاض مرحوم کی ادبی شان اور مرتبہ انشا پردازی کا اعلان کر رہا ہے۔

کاش ریاض کا "حسن انشا" دوبارہ زندہ ہو سکتا؟

ریاض مرحوم کے یہ خوشرنگ ادبی جواہر ریزے اس دور کی یادگار ہیں جب ان کو زمانہ کے ناموافق حالات نے سخت دلگیر بنا رکھا تھا۔ اور ہجوم افکار کی وجہ سے بقول خود وہ گناہ کرنا بھول جاتے تھے۔ لیکن ان کی لطیف بذلہ سنجیاں اور انداز بیان کی یکسر "بہار و شگفتگی" جو مرحوم کی فطرت تھی ہر جگہ نمایاں ہے اور یہی ہے ریاض مرحوم کی نظم و نثر کی وہ امتیازی نوعیت جو ان کو ہمیشہ ان کے ہمعصروں سے ممتاز کرتی رہی اور مورخ کا "حقیقت نگار قلم" بھی اسی کو خضر راہ بنائے گا۔

شوخ طبع ریاض کی لطافت نثر کا حسن و شباب دیکھ چکے آیئے اب ان کی چلبلی شاعری کی بھی سیر کر لیں اس لئے کہ ریاض کی ذات در اصل عبارت ہے اسی شوخی و چلبلاہٹ سے۔

ریاض کی شاعری آپ اپنی غایت ہے اور صرف محسوسات حسن و عشق کی تفسیر ——— ناممکن ہے کہ آپ ریاض کا کوئی شعر پڑھیں اور اس کی لطافتوں میں کھو نہ جائیں۔

ریاض کی شاعری کا "اختتامی پہلو" جس نے امیر و داغ کی شاعری کا رنگ پھیکا کر دیا صرف ان کی شوخی طبع اور لطیف شرارت شعری ہے جو کبھی کبھی عریانیوں کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ مثلاً

ہم آنکھ کئے بند تصور میں پڑے ہوں
ایسے میں کوئی چھم سے جو آجائے تو کیا ہو

اس طرح کہ گھنگرو کوئی چھاگل کا نہ بولے
جب چھم سے چلیں گود میں چپکے سے اٹھا لے

ریاض یاد ہے ان کا وصال میں کہنا
خدا کے واسطے چھوڑو زبان سوکھ گئی

آڑی ہیکل کو چوم لیں گی، وہ چیز جو کچھ اُٹھی اٹھی ہے

وصل کی شب چلی ایک بھی شوخی اُن کی کچھ نہ بن آئی تو چپکے سے کہا مان گئے

کوئی مُنہ چوم لیگا اس نہیں پر شکن رہ جائیگی رکھی جبین پر

جب مل جائیں کلیجہ سے لگا لے ان کو ان حسینوں سے کسی بات کا شکوہ کیسا

ہر چند کہ ریاض کا یہ شوخ رنگ سنجیدگی پسند دماغوں کیلئے محمود نہیں ہے لیکن حضرات لکھنؤ کی شاعرانہ اصطلاح میں بادب عرض کروں گا کہ نقد و تبصرے سے پہلے اپنے اوپر وہی کیفیت طاری کر لیجئے جس کی شراب سے بدمست ہو کر "رند پاکباز" ریاض نے یہ محاکاتی شعر کہے ہیں تو میرا خیال ہے کہ آپ حسن و شباب کی اس رنگین دنیا میں پہنچ جائیں گے جہاں "ابتذال شعری" کا تصور بھی معصیت سمجھا جاتا ہے۔ حدیث حسن و شباب کی تفسیر کے علاوہ خوش صفات ریاض کی شاعری کا ایک پہلو "خمریات" بھی ہے جس میں وہ زیادہ کھل کھیلے ہیں۔ لیکن اس حقیقت کا علم بہت کم لوگوں کو ہے کہ شراب و متعلقات شراب کا خاتم المفسرین ریاض نے ساری عمر خمریات کی شاعری میں مبتلا ہو کر شراب ہاتھ سے چھوئی تک نہیں۔ درآنحالیکہ مرحوم نے جب ہوش سنبھالا تو ہر صحبت "موسیقی و شراب و جوانی و حسن و ناز" کا مکمل نمونہ تھی۔

ایک خوش خیال بزرگ "ریاض کی شراب کو" حافظ و خیام کی شراب کی طرح جوش عقیدت میں "شراب معرفت" بنا کر پیش کر رہے ہیں لیکن اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ ریاض تمام عمر ذوق بادہ سے ناآشنا رہے۔ انسان پیدا ہوئے اور انسان مرے کسی طرح یہ ماننے کو جی نہیں چاہتا۔ کہ میکدۂ ریاض میں شراب کی جتنی بوتلیں ہیں ان میں معرفت و عرفان کی خوش رنگ و لذیذ شراب بھری ہوئی ہے۔ بہرحال اس حقیقت سے انکار کی گستاخی نہیں کی جا سکتی کہ اسلوب ادا اور قادر الکلام انداز بیان نے خیالی شراب و خیالی بادہ نوشی کو حقیقت کا رنگ دے دیا ہے ملاحظہ فرمایئے۔

پنچی داڑھی نے آبرو رکھ لی قرض پی آئے اک دکان سے آج

مے ریاض آپ بھی پیتے ہیں بایں ریش سپید
ہائے یہ نور کی شکل اور سیہ کاروں میں

اچھی پی لی خراب پی لی، جیسی پائی شراب پی لی
عادت سی ہے نشہ ہو نہ اب کیف پانی نہ پیا شراب پی لی

یہ جھوٹ ہے جو کہوں میں کبھی خراب پی یہ وہ کہیگا کہ جس نے کبھی شراب پی

قسمت میں ہماری اب پینا ہے نہ کھانا ہے انگور کا پانی ہے انگور کا دانا ہے

اٹھواؤ منیر سے مرو ساغر ریاض جلد آتے ہیں اک بزرگ پرانے خیال کے

افسوس ہے کہ ضیق وقت گلوگیر ہے اور "مدت سے جو چپ ہوں تو زباں صاف نہیں ہے۔" ورنہ ریاض کا کلام بالخصوص ان کی شراب تفصیل چاہتی ہے یہ چند سطریں دیرینہ کرمفرما جناب حافظ محمد عالم صاحب مدیر عالمگیر و خیام کے ارشاد کی تعمیل میں پیش کر رہا ہوں۔

ریاض مرحوم کے خطوط کا مجموعہ شائع کرنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں جو صاحب میرا ہاتھ بٹانا چاہیں مجھ سے خط و کتابت کریں۔ میرا پتہ یہ ہے۔ "خیر بھوروی۔ گورکھپور"

مرحوم کے خطوط کا اضطراری اور جذباتی پہلو ادب اردو کی جان ہے اور سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت انداز بیان کی لطیف بذلہ سنجیاں ہیں جن سے "آقائے نثر و نظم" ریاض کا ادبی مرتبہ معلوم ہوتا ہے۔

خیر بھوروی

سید الشعراء حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم کا ایک قطعہ

مرسلہ جناب حمید عظیم آبادی

حکمائے فلسفہ یونانی اور اُن کے کاسہ لیس حکمائے اسلام جیسے بوعلی سینا الشیخ مقتول یا محقق طوسی و میر باقر داماد و مُلّا صدرا و صاحب شمس بازغہ شدومد سے مادۂ عالم (ہیولیٰ) کو قدیم جانتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ کل عالم کا ہیولیٰ ایک ہے۔ اسی سے مختلف شکلیں بنی ہیں۔ آریہ فرقہ اسی کو حق سمجھتا ہے۔ اس میں بڑی قباحت یہ ہے کہ اگر اس کو سچ مان لیا جائے تو جیسا کہ کتابوں میں بحث کی گئی ہے اور ثبوت میں دلائل لائے گئے ہیں، ہیولیٰ کو بغیر قدیم مانے چارہ نہیں ہے۔ اسی لیے متکلمین یعنی حکمائے مذہب نے ہیولیٰ کو باطل کہا ہے اور ترکیب عالم کی بنا جزو لایتجزیٰ[۱] پر رکھی ہے مگر جو دلائل پیش کئے ہیں وہ ایسے واضح نہیں ہیں کہ جب تک انسان مالہٗ و ما علیہ کو نہ سمجھے مختصر طور سے بہ آسانی سمجھ سکے۔ بہر کیف دسمبر ۱۹۲۱ء میں جناب نواب سید جعفر حسین خاں صاحب مغفور کے ہاں ایک صحبتِ مشاعرہ منعقد ہوئی تھی مصرعِ طرح یہ تھا "خدا کو علم ہے کیا راز گفتگو ہوگا" اُستاد مرحوم شاد عظیم آبادی نے ایک قطعہ بند غزل کہی اردو میں یہ چیز رائج نہیں۔ بعض اساتذۂ فارس نے اس طرف توجہ کی ہے لیکن بجز غطیمائے شیرازی کے کسی نے خاص مسئلہ پر روشنی نہیں ڈالی جس کا مطلع یہ ہے ؎ قاصد آمد گفتمش آہ ماہ سیمیں بر چہ گفت۔ گفت باہجرم بہ سازد گفتمش دیگر چہ گفت۔ تمام اساتذہ اس کو الہامی کہتے آئے ہیں استاد مرحوم ہر چند انواع امراض و ضعف و مکارہ سے پریشان حال تھے تاہم قلم برداشتہ ایسے مشکل مسئلہ کی گتھی مشاطۂ سخن کے ذریعہ سلجھائی ہے۔ ؎

واۓ بر جانِ سخن تا بہ سخنداں نہ رسد۔ بہر ایں خیال یہ قطعہ پیش کش ارباب علم ہے۔

ھُوَ ہٰذا

نہ کر گا دھیان کہ معدومِ محض تو ہوگا — برنگِ سبزۂ نوخیز پھر نمو ہوگا
زمیں سے اُگتے ہیں جیسے نبات مٹ مٹ کر — یوہیں ظہور ترا اے خجستہ خو ہوگا
وہ جزوِ لایتجزیٰ جو تخم[۱] ہے تیرا — وہ تخم بڑھ کے یہی جسم ہُو بہ ہُو ہوگا
ملے گا جیت تجھے اور یہ ہوگا اُس کا فیض — مقام جس کا قریبِ رگِ گلو ہوگا
یہ جیت ہے جو حقیقت میں عکسِ روح الروح — وہ ہم ہیں آکے ہُوا ہم تو تجھ میں تو ہوگا
وہ روح شمع بھی خورشید بھی سمندر بھی — اُسی کی تو ہو، ضیا ہو کہ موج، تو ہوگا

۱؎ جزو لایتجزیٰ کے مقابلہ میں تخم کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

غرضکہ پھول سا یہ جسم جب ہُوا طیارہ — عیاں یہ جیت بھی مانندِ رنگ و بو ہوگا
حریمِ قدس میں جس وقت ہوگا تو داخل — ترا بھی مسکن و ماوا مقامِ ہُو ہوگا
اُسی کی ذات میں ہو جائیگا فنا پھر تو — ترا معاملہ تب جا کے ایک سُو ہوگا
نہ پوچھ ہوگا تجھے جبکہ وصلِ یار نصیب — مرقعِ دو جہاں تیرے روبرو ہوگا
سرورِ محض و لقائے دوام و علمِ شدن — صفات و ذات میں پیدا بہ صد غلو ہوگا
وہ جا ملے گی تجھے جس پہ سَو بہشت نثار — کہیں بہشت پہ فوق ای خجستہ خُو ہوگا
اسی پہ ناز ہے زاہد! بہشت میں ہے کیا — یہی کہ مجمعِ حورانِ ماہ رو ہوگا
خیال دل سے مٹا ایسی مادیت کا — وگرنہ موردِ ایرادِ عقل تو ہوگا
خدانہ کردہ رہا گر کثیف جامۂ تن — لباسِ نفس بھی محتاجِ شست و شو ہوگا
تعصب و حسد و کینہ و دل آزاری — اسی قبیل کا عصیاں ترا عدو ہوگا
بچا نہ تو اگر اس قسم کے گناہوں سے — تو یاد رکھ کہ معذّب ضرور تو ہوگا
یہی گناہ مرض بن کے دیں گے ایذائیں — مقامِ عذر نہ یارائے گفتگو ہوگا
یہ وہ گناہ ہیں دل کو کثیف جو کردیں — یہی بڑھے تو بشر بھر کے زرد رو ہوگا
یہی بنیں گے ترے حق میں عقرب و افعی — خود اپنی آگ میں خاک ای کمینہ خو ہوگا
فرشتے یعنی قوا تیرے نیک، جو ہیں سعید — کبھی نہ اُن کو ترا پاسِ آبرو ہوگا
گماں یہی ہے کہ اک مدتِ طویل کے بعد — جو تُو رہا بھی بصد شوق و آرزو ہوگا
انہیں نجوم میں ہیں بے شمار دنیائیں — پہونچ کے تو وہیں آوارہ کُو بہ کُو ہوگا
یہ اِس لئے ہے کہ باقی کثافتیں مٹ جائیں — بغیر اس کے نہ انسان فرشتہ خُو ہوگا
عجب نہیں ہے کہ تبدیلیاں وہاں بھی ہوں — پس از زمانۂ بسیار پاک تو ہوگا
سمجھ نہ اس کو تناسخ یہ وہ مسائل ہیں — کھُلیں گے اُس پہ جو عرفاں کا راز جُو ہوگا

معاف کردے تجھے پہلے ہی یہ ممکن ہے — کہ آخر اس کا کرم بھی تو حیلہ جُو ہوگا
بکے پکار کے وہ آ گنا ہگار مرے — کروں جو عدل تو رسوائے خلق تو ہوگا
کرم مرا ہے وسیع، اس لئے ترے حق میں — معین و یاورِ امید و آرزو ہوگا

نہ کانپ خوف سے رہ مطمئن مرے پیارے || ترا مقام بھی اب سے مقام ہُو ہو گا
یہ سُن کے اپنی خوشی کا ذرا کر اندازہ || کہ اپنے جامۂ تن میں نہ میں نہ تُو ہو گا
جب اُس بہشت میں اے دوست ہوگا تو داخل || سرورِ حسن کا مرکز جو مُو بہ مُو ہو گا
بلند ہوں گے کہیں نغمہ ہائے غیلِ طیور || کہیں ہجوم حسینانِ ماہ رُو ہو گا
غرضکہ جتنے لطائف ترے خیال میں ہیں || ہر ایک حاضر و موجود و پیش رُو ہو گا
یہ استعارے ہیں سب تاکہ تو سمجھ لے جلد || کہ جھکہ چکا ہے متاثر ضرور تو ہو گا

غرض بہشت کی کیا خوبیاں بیان کروں || علی الخصوص کہیں جس مکاں میں تو ہو گا

جو اپنے شاد کو ڈھونڈھے گا تو وہیں وہ بھی
غزل سرا کسی گوشہ میں با وضو ہو گا

سرشکِ غم

حضرت حمید عظیم آبادی

بچایا لاکھ دامن بے وفا بیدرد قاتل نے || مگر مُہرِ وفا کی ثبت کر دیں خونِ بسمل نے
نہ دی فرصت تڑپنے کی کبھی بیتابی دل نے || کیا آسان ساری مشکلوں کو ایک مشکل نے
شمیم خُلد آتی ہے گلِ اُمید کھلتے ہیں || سرورِ دائمی بخشا بہارِ تیغ قاتل نے
تمنائے شہادت اب گلے مِل مِل کے روتی ہے || کیا پامال مجھ کو شوخیِ رفتارِ قاتل نے
جو دریا دل ہیں وہ گردِ کدورت سے مُبرّا ہیں || جگہ آغوش میں موجوں کو دی دامانِ ساحل نے
کسی نے بھی نہ جانا اور چھری بھی چل گئی دل پر || کیا کچھ اس طرح بسمل نگاہِ نازِ قاتل نے
سکوں کیسا، کہاں کا چین کیسی نیند تربت میں || خدا معلوم کیا جادو جگایا چشمِ قاتل نے

یہ آگ اپنی لگائی ہے حمید اب اس کا رونا کیا
گرائی تجھ پہ بجلی خود تری بیتابیٔ دل نے

جھوٹ

ایک بے مروّت حسینہ کا خوفناک انجام

از جناب طالب باغپتی

"تم جھوٹی ہو، خدا کی قسم بالکل جھوٹی ہو!"

"پھر اتنا کیوں چیخ رہے ہو؟ کیا محلہ والوں سے اپنے قول کی تصدیق کرانا چاہتے ہو؟"

یہ بات بھی جھوٹ تھی۔ اس لئے کہ میں چیخ ہی نہیں رہا تھا۔ بالکل آہستہ آہستہ باتیں ہو رہی تھیں، اس کی کلائی میری گرفت میں تھی اور میں بالکل عاشقانہ لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔ ہاں یہ بات میں نے بھی محسوس کی کہ "جھوٹ" کا لفظ سانپ کی پھنکار کی طرح میری زبان سے نکل رہا تھا۔

"آہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے!؟ اسنے دردآمیز لہجے میں کہا "تمہیں اسکا یقین ہی نہیں۔ آخر میں کس طرح باور کراؤں؟"

مگر جب میں نے اُسے قریب کھینچ کر اپنی آغوش میں لینا چاہا تو وہ تیتری کی طرح اُڑ گئی، میں نے برآمدے کے اندھیرے سے نکل کر اس کمرے تک اس کا تعاقب کیا جہاں ابھی تک رقص و سرود کی محفل گرم تھی۔ مگر دروازے کے پاس پہونچکر میں ٹھٹک گیا۔ اسنے پلٹ کر دیکھا اور مسکراتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اندر بلا لیا۔

کئی جوڑے مصروف رقص تھے۔ مجھ سے کوئی مخاطب ہوا نہ مجھے دعوت رقص دی گئی۔ سب نگاہوں میں شاید ایک میں ہی تھا جو اجنبی خیال کیا جا رہا تھا۔ اس لئے میں نے بھی سب سے علیحدہ ایک گوشے میں سازندوں کے قریب بیٹھنا مناسب سمجھا۔ تاشے کی ساعت آزما نفری کا منہ بالکل میرے سر کے قریب تھا۔ اسکی آواز سے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے مگر میں پھر بھی اس طرح خاموش بیٹھا رہا گویا موسیقی سے مجھے انتہائی رغبت ہے۔

ہر دس پانچ منٹ کے بعد ایک سفید معطّر سایہ میرے پاس سے ہو کر گزرتا تھا —— یہ وہی تھی —— مجھے معلوم نہیں کہ وہ کس ترکیب سے دوسروں کی نگاہیں بچا کر بار بار پروانہ وار آتی تھی، اور مجھے مدہوش محبت کر جاتی تھی۔ البتہ اتنا احساس ہے کہ ایک لمحہ کے لئے محض چشم زدن کے لئے اس کی مرمریں انگلیاں میرے شانوں سے مس ہوتیں۔ ایک لمحے کے لئے میری نگاہیں اُٹھتیں، مجھے ایک بلوریں گردن، ایک چمکدار لباس کا سا دھوکہ ہوتا پھر ایک بلوریں چہرے کا خیال، ایسا بلوریں چہرہ جس میں وفا و محبت بیک وقت موجود ہوں اور جسے حُور شمایل سمجھ کر بھی خیال مطمئن نہ ہو —— یقین کیجئے بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے زہرہ رقص کرتے کرتے تھک کر آ گری ہے!!

میں نے اس کی آنکھیں دیکھیں وہ ہرنی کی طرح بیقرار، شوخ اور کسی روشنی کی متمنی تھیں، خوبصورتی کا مفہوم یقیناً ان کی دلکشی کی تشریح نہیں کر سکتا!

دراز پلکوں کے سایہ میں اس کی گہری گہری سیاہ اور سراپا محبت پتلیاں تھیں —— جس وقت میری نگاہ ملی ان کی گہرائی سمندروں کی طرح اتھاہ ہو گئی۔ جب میں نے ان پر غور کیا میرا قلب ایک جھٹکے کے ساتھ ساکن ہو گیا۔ اس میں مطلق مبالغہ نہیں، ممکن ہے یہ وقفہ لمحہ بھر یا اس سے بھی کچھ کم رہا ہو مگر وہ زندگی کا یہی لمحہ ہے جس میں مَیں نے کائنات کی گردش

کا تعلق حسین پتلیوں کی لرزش کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ صرف محسوس ہی نہیں بلکہ خوب اچھی طرح اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے!!

ہر اس مجبوری کی ایک مسلسل کشمکش لئے ہوئے میری روح کشاں کشاں اس کی نگاہوں میں جذب ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ میں اپنی ہستی سے بھی بیگانہ ہو گیا ——— بے بس، بے یار و مددگار، قریب قریب مردہ، زندہ تو یقیناً نہ تھا۔

دیکھتے دیکھتے وہ پھر فاختہ کی طرح اڑ گئی!! اس مرتبہ میری روح بھی اس کے ساتھ تھی!

ہال میں ایک کشیدہ قامت، خوشرو نوجوان کے ساتھ وہ مصروف رقص تھی، خدا معلوم وہ کون تھا؟ میں اس کی ایک ایک چیز کو گہری نظروں سے مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کے جوتوں کی ساخت، شانوں کی بناوٹ، بالوں کے لچھے، خوفناک تبسم، خوش رنگ رومال غرض ہر چیز میری نگاہوں میں کھٹک رہی تھی۔ لیکن وہ ایک شانِ استغنا کے ساتھ، بالکل لاپرواہی سے ادھر اُدھر نگاہیں ڈال کر مجھے پامال کئے جا رہا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات سے ظاہر تھا کہ دلچسپی کے ساتھ اس نے ارادۃً کسی چیز کو بھی نہیں دیکھا!

مجھے اس کی یہ آسودہ نگاہی دیوار میں پیوست کئے دیتی تھی میں تباہ ہو رہا تھا، یہاں تک کہ جس دیوار کے سہارے میں بیٹھا تھا۔ رفتہ رفتہ اس میں اور مجھ میں کوئی فرق نہ رہا۔ محفل میں روشنیاں گل ہونے لگیں۔ ساز کی آواز آخری گونج کے بعد خاموشی کے اتھاہ سمندر میں کھو گئی میں چپکے سے اُٹھ کر اس کے پاس گیا۔ اور آہستہ آہستہ کہنے لگا۔

"چلو جلسہ ختم ہو گیا، میں تمہیں گھر تک پہنچا دوں!"

مگر اُس نے بالکل معصومانہ انداز میں جواب دیا:-

"اور میرا چچا زاد بھائی کس کے ساتھ جائیگا؟"

یہ کہہ کر مجھے خالی کمرے میں لے گئی اور مسلسل بوسوں سے میرے لب بند کر دیئے۔ جب وہ رخصت ہونے لگی تو میں نے چپکے سے کہا۔ "تم جھوٹی ہو!"

"پھر وہی!" اس نے مسکرا کر کہا: "کل پھر اُسی جگہ ملنا"

یہ کہا اور اجنبی کے ساتھ چل دی۔

جس وقت میں گھر کی طرف روانہ ہوا، اچھا خاصہ صبح کا وقت ہو گیا تھا۔ بازار بند تھے۔ اور سڑک پر صرف دو آدمیوں کے علاوہ کسی کی صورت نظر نہ آتی تھی ——— ایک میں دوسرا میرا کوچبان۔

سرد ہوا سے بچنے کے لئے کوچبان کسی قدر جھک گیا تھا اور اس کے لمبے برفانی کوٹ کا دامن میری پیشانی پر لٹک رہا تھا۔ وہ علیحدہ کسی خیال میں مستغرق تھا۔ میں علیحدہ اپنی فکر میں مدہوش تھا۔ اور بلند دیواروں کے پیچھے تمام شہر سکون و اطمینان کی میٹھی نیند سوتے ہوئے علیحدہ اپنے خواب و خیال میں کھویا ہوا تھا۔

اس وقت میری آنکھوں میں اس کی بھولی بھالی صورت، خیال میں اس کا جھوٹ! ——— حیات و ممات کا فلسفہ بھی بعض اوقات اس خیال میں اپنی جگہ نکال لیتا۔ اور پھر اس قدر غلبہ پا لیتا کہ سنگین مکانوں کی بلند اور کشیدہ قامت دیواریں جو صبح کے دھندلکے میں بتدریج نمایاں ہو رہی تھیں۔ موت کی مختلف ڈراؤنی صورتیں معلوم ہونے لگتیں جس طرح لاش ٹھنڈی ہو کر اکڑ جاتی ہے اسی طرح وہ بھی ایک حالت میں ساکت و صامت ہو کر رہ گئی تھیں۔

مجھے کوچبان کے خیالات کا اندازہ نہ ہو سکا اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ پیچھے سونے والے کیا خواب دیکھ رہے تھے مگر پھر اُن ہی کو میرے خواب و خیالات کا کیا اندازہ تھا!

اس حالت میں میری گاڑی خالی سڑک پر برابر راستہ طے کرتی جا رہی تھی، سورج کی ابتدائی شفقی شعاعیں، مکانوں کی چھتوں اور درختوں کی بلند چوٹیوں کو رفتہ رفتہ نمایاں کر رہی تھیں اور ماحول کی ہر شے میں ایک ایسی زندگی پیدا ہو رہی تھی جو احساس و حرکات سے مطلقاً بے نیاز ہو۔

یک لخت ——— کوئی مختصر سفید چیز سایہ کی طرح میری گاڑی کے برابر سے گذر گئی۔ جس وقت وہ میرے پاس سے گذری۔ کسی کے بے محابا مردانہ قہقہے کی آواز میرے کانوں میں آئی ——— ہا ہا ہا۔ ہا ہا ہا

(۲)

اُسنے مجھ سے جھوٹا وعدہ کیا تھا، میں نے صبح سے شام تک انتظار کیا، مگر اُسے نہ آنا تھا نہ آئی۔

ایک دھندلی اگر مٹا تاریکی رفتہ رفتہ فضا پر غالب آگئی تھی۔ میں

نہیں بتا سکتا کہ دن کی روشنی شام کی سنہری شفق میں اور شفق رات کے
تاریک دھندلکے میں کب اور کس طرح تبدیل ہوئی! میرے لئے تو انتظار
کی گھڑیاں ایک طویل رات سے مشابہ تھیں۔ ایسی طویل اور تاریک رات
جس میں کسی تارے کی روشنی کا بھی نشان نہ ہو ۔۔۔ !

میں نے تمام دن خاموش چہل قدمی میں گذار دیا۔ میں نہ اس
مکان کے قریب گیا جس میں وہ رہا کرتی تھی نہ اس دلکشا دروازے کے
پاس سے گذرا جو زرد بارجے کے سایہ میں میری نگاہوں کو خوش آمدید کہا
کرتا تھا۔ دن بھر اپنے گھر کے سامنے والی سڑک پر جہاں سے اس کا دروازہ
اور بارجہ دونوں نظر آتے تھے۔ ایک معینہ رفتار اور یکساں قدموں سے
ٹہلتا رہا۔ اس طرح کہ جب آگے بڑھتا دروازے پر بلا کسی خاص ارادے کے
نگاہیں جمی رہتیں۔ اور جب واپس ہوتا تو اکثر راستہ میں ٹھہر ٹھہر کر مڑ مڑ کر دروازے
کو دیکھ لیتا ۔۔۔ یہاں تک کہ برف گرنے لگی۔ اور اس کی تیز خنکی جا بجا
نشتروں کی طرح میرے چہرے پر چبھنے لگی۔

نشتر! ۔۔۔ ہاں ایسے خطرناک! ایسے تیز! ایسے سرد! ایسے جاں خراش!
نشتر جو رفتہ رفتہ میرے دل میں پیوست ہوگئے اور اسے چھید چھید کر اتنا مجروح کر دیا
کہ اس میں سوائے افسردگی، انتقام اور غم وغصہ کے کچھ نہ رہا ۔۔۔ خدا جانے
محبت کہاں چلی گئی تھی؟!

انتظار کی گھڑیاں قیامت بنکر گذر رہی تھیں۔ مگر اس کا کوئی پتہ نہ تھا۔ میں
اب بھی سرکاری لالٹینوں کی روشنی میں کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد ایسا محسوس
ہونے لگا گویا میرے جسم میں بھی کوئی شے چراغ کی طرح جل رہی ہے ۔۔۔!!

جس راستہ پر میں ٹہل رہا تھا اس پر آمد و رفت بہت کم تھی۔ بعض
اوقات میرے سامنے والی سڑک پر دور کوئی انسانی صورت نظر آتی اور جوں
جوں قریب ہوتی جاتی اس کا قد بڑھتا ہوا معلوم ہوتا یہاں تک کہ وہ خاموشی سے
ایک تاریک سایہ کی طرح میرے برابر سے گذر کر بتدریج گھٹنا شروع ہوتی اور
سفید عمارت کی دیواروں کے نیچے پہونچکر رفتہ رفتہ نگاہوں سے غائب ہو جاتی۔

پھر جب میں واپس ہوتا تو انہی دیواروں کے پاس سے کوئی شخص
برآمد ہوتا میرے قریب سے گذرتا اور اسی طرح گھٹتے گھٹتے گرآلود فضا میں نگاہوں
سے غائب ہو جاتا۔

لمبے لمبے لبادوں میں لپٹے ہوئے یہ غیر متشکل مجسمے ایک دوسرے سے
اس قدر مشابہ تھے اور سڑک پر ٹہلتے ہوئے جا بجا اس طرح نظر آتے گویا کسی
مخصوص گروہ کے مدہم آدمیوں نے سڑک پر پہرہ لگا لیا ہے۔

میں اب بھی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ مگر بے سود۔ انتہائے غم و افسوس
سے میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے اور بے تحاشا رونے کو جی چاہنے لگا۔
انگلیاں از خود کسی درندے کے پنجوں کی طرح اینٹھنے لگیں اور یہ محسوس ہونے
لگا گویا وہ کسی زہریلے سانپ کو جس کی پھنکار سے جھوٹ کے شعلے نکل رہے ہوں
اپنی گرفت سے کچل دینا چاہتی ہیں ۔۔۔!

اُدھر یہ خیالی سانپ میرے ہاتھ پر لپٹ رہا تھا اور رسّے کی طرح
انہیں جکڑ کر بار بار دل پر ڈنگ مار رہا تھا تاآنکہ اس کے زہریلے اثر سے میرا سر
ڈھلکنے لگا ۔۔۔ دنیا کی ہر چیز جھوٹ تھی!!!

میرے عدم و وجود کی حد فاصل جوش خیال میں ناپید ہوگئی۔ بعض
دفعہ یہ محسوس ہونے لگتا گویا مجھے زندگی سے کبھی کوئی واسطہ ہی نہیں رہا۔
اور بعض اوقات یہ خیال ہوتا کہ زندگی دراصل نام ہی اس کیفیت کا ہے جو
مجھے حاصل ہے!

اُس وقت یہ معلوم کرنا کہ درحقیقت میں موجود تھا یا معدوم میری قوت فیصلہ
کے لئے ناممکن تھا۔ البتہ یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ "وہ" میرے عدم و وجود
کی دونوں حالتوں میں ہمیشہ و ہمہ وقت شریک رہی ہے۔ صرف اُسے مجھ پر
حکومت کرنے کے لئے اور مجھے اس کا مجبور و محکوم بنانے کے لئے من و تو کی
بحث چھیڑی گئی ہے!!

مجھے اکثر اس خیال پر تعجب ہونے لگتا کہ اس کا بھی مجھ سے علیحدہ کوئی
نام مجھ سے جدا کوئی جسم ہے۔ اس کی ہستی بھی کسی مخصوص ابتدا یا انتہا کی رہین منت
ہے ...... اس کا کوئی نام نہ تھا۔ وہ ہرگز مجھ سے علیحدہ کوئی خاص شخصیت
نہ تھی۔ میرے نزدیک تو وہ میری ہی شخصیت کا ایک ایسا فریب تھی جسے صرف
جھوٹ بولنے، تڑپانے اور کشمکش انتظار میں ڈال کر کبھی نہ آنے کے لئے قدرت
نے تخلیق کیا تھا۔

مجھے معلوم نہیں کیوں اور کس بنا پر مجھے ہنسی آئی ۔۔۔ میں نے ایک
طویل قہقہہ لگایا۔ کھٹکنے والے نشتر دل میں اور پیوست ہوگئے۔ کچھ دیر بعد
کانوں میں یا تو میرے ہی قہقہہ کی بازگشت یا کسی دوسرے خیالی قہقہے کی آواز
آئی ۔۔۔ ہا ۔۔۔ ہا ۔۔۔ ہا ۔۔۔ ہا ہا ہا ہا!!!

میں نے آنکھ اُٹھا کر سفید عمارت کی ان کھڑکیوں کو دیکھا جن کے رنگین شیشیوں سے روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی.......... وہ اب بھی اپنی سرخ و سبز زبان میں مجھ ہی سے مخاطب تھیں اور صاف کہہ رہی تھیں:-

"بیوقوف وہ تجھے دہوکہ دے رہی ہے۔ مچھلی کی طرح کھلا رہی ہے تو صبح سے اس کے انتظار میں ٹہل رہا ہے برف اور طوفانی ہوا کی مصیبتیں جھیل رہا ہے۔ مگر وہ خوبصورت، حسین، جفاجو، عربدہ جُو سفید ناگن اپنے عاشق کے ساتھ مصروفِ عیش و نشاط ہے۔ ایسے میں اگر تو بہادرانہ جذبۂ انتقام کے ساتھ یکایک اندر داخل ہو جائے اور اس بے مروّت رَن کو جسے غلطی سے تو نے اپنی روح پر مسلّط کر لیا ہے۔ قتل کردے تو دنیا جھوٹ سے پاک ہو جائے!

میں نے سختی سے اُس مٹھی کو بھینچ لیا جس میں چاقو تھا اور قہقہہ لگا کر زیرِ لب کہا:-

"ہاں ٹھیک ہے۔ میں ضرور اسے ماروں گا۔ جھوٹ کا دنیا سے خاتمہ کر دینا ہی بہتر ہے" لیکن کھڑکیوں نے مجھے طنزیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا:-

"تو اسے نہیں مار سکتا۔ تیرے ہاتھ میں جو چاقو ہے وہ خود ایک فریب ہے۔ اس کے بوسوں سے زیادہ بے معنی فریب!!"

سڑک پر آمد و رفت بند ہو چکی تھی۔ اور برف کے طوفان میں صرف ایک میں ہی ایسا شخص تھا۔ جسے خانہ بدوش کہا جا سکتا تھا ورنہ ہر جاندار کو کہیں نہ کہیں پناہ مل گئی تھی۔

میں اور شاہراہ کی لالٹین کا بیکس شعلہ ——— بظاہر کائنات میں یہی دو چیزیں سردی کھانے اور غم و آلام سے سلگنے کے لئے بنائی گئی تھیں۔

قریب کے گرجا کا گھنٹہ بجا اور اس کی تیز، سماعت شکن آواز ماحول کے اثر سے مضمحل ہو کر کانپتی ہوئی۔ برف کی طوفانی فضا میں کھو گئی ——— ٹھیک اس طرح جس طرح کوئی بیمار آخری ہچکیاں لے کر دم توڑ دیتا ہے!!

میں نے گھنٹے گننا شروع کئے اور گن کر قہقہہ لگایا ——— پندرہ بجے تھے۔ گرجا اور اس کا گھنٹہ دونوں پُرانے تھے۔ ہر چند کہ گھڑی ٹھیک وقت دیتی تھی۔ لیکن گھنٹہ ہمیشہ بے تکا بجاتی تھی بعض اوقات تو اتنا بے تکا کہ پادری صاحب کو مینار پر چڑھ کر اپنے ہاتھ سے اُسے روکنا پڑتا تھا۔

مگر اسوقت گرجا کے گھنٹہ کی آواز کس لئے جھوٹ بول رہی تھی ——— یقیناً میرا مذاق اڑا رہی تھی

گھنٹے کی آخری آواز کے ساتھ سامنے والے مکان کا دروازہ کھلا۔ اور ایک کشیدہ قامت آدمی زینہ سے اترتا ہوا معلوم ہوا۔ میں صرف اس کی پشت دیکھ سکا مگر فوراً پہچان گیا۔ اس لئے کہ میں نے یہی مغرور، سراپا نخوت صورت گذشتہ شب دیکھی تھی۔ اس کی مطمئن چال سے اُس کی قلبی مسرت جھلک رہی تھی۔ وہ کل شام کی نسبت یقیناً اسوقت زیادہ مسرور تھا ——— میں بھی اسی دروازے سے اکثر اسی قسم کی مستانہ روی کے ساتھ برآمد ہوتا تھا۔ اس کے ایک ایک قدم سے اس بات کی تصدیق ہوتی تھی کہ کسی نوجوان عورت کے جھوٹے بوسوں کے نشہ آور خیال میں مدہوش ہے۔

(۳)

میں نے اسے دھمکایا، ڈرایا، پھر خوشامد کی، ہاتھ جوڑے اور کہا:-

"خدا کے لئے مجھ سے دورنگی نہ برتو، مجھے فریب نہ دو، جتنی بات ہو۔ سچ سچ بتا دو!" مگر وہ بے لوث اور معصومانہ انداز سے اپنی بھویں چڑھاتے ہوئے مسکرائی اور حسین نیلیوں کی اتھاہ گہرائی سے وفا و محبت کا یقین دلاتے ہوئے مجھ سے کہنے لگی "بھلا تم سے اور جھوٹ!"

وہ جانتی تھی کہ میرے پاس اس کے جھوٹ کا کوئی باقاعدہ ثبوت نہیں ہے۔ میرے تمام شبہات ساری روح فرسا بدگمانیوں کے لئے اُس کا صرف ایک مختصر سا جھوٹا فقرہ کافی ہے۔ میں اسی فقرے کا منتظر تھا وہ اس کی زبان سے بظاہر وفا و محبت کے رنگ میں ڈوبا ہوا لیکن درحقیقت اپنے مفہوم میں سفید جھوٹ ادا ہوا:-

"آہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے؟ کیا میں تمہاری .... نہیں ہوں۔ مگر تمہیں یقین ہی نہیں آتا۔ خدا جانے کیا ہو گیا ہے؟"

ہم قصبہ کی آبادی کے آخری کنارے پر رہتے تھے اور برف سے ڈھکی ہوئی سفید سفید چوٹیاں کھڑکیوں سے دکھائی دیا کرتی تھیں۔ مگر اس وقت اندھیرے میں چھپی ہوئی تھیں اور ماحول کی ہر چیز پر رات نے ایک سیاہ غلاف ڈال دیا تھا لیکن جھیل چمک رہی تھی ——— بالکل اس طرح جس طرح گہری تاریکی میں کسی مردے کی کفنائی ہوئی لاش!

کمرے میں صرف ایک دھیمے لیمپ کی روشنی پڑ رہی تھی مگر اس میں بھی مردہ جھیل کا عکس نمایاں تھا۔ "بتا دو، خدا کے لئے سچ سچ بتا دو۔ اس کی پرواہ مت کرو کہ مجھے صدمہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ میں اسے سنکر

مرہی جاؤں گا۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ جھوٹ اور فریب کاری کی زندگی سے سچی موت بہتر ہے۔ مجھے صرف ایک مرتبہ تم اپنے دل کی بات بتا دو پھر میں ہمیشہ کے لئے تمہارا پیچھا چھوڑ دوں گا۔"

میں جذبات کے طوفان میں بہا چلا جا رہا تھا۔ لیکن وہ خاموش تھی، سمندر کی اس چٹان کی طرح خاموش جسے طوفان کے تھپیڑوں کی مطلق پرواہ نہ ہو۔ اس کی بھولی بھالی مغموم نگاہیں نشتر کی طرح میرے دل میں اُتری جا رہی تھیں، میری روح تڑپ رہی تھی اور میں درد و کرب کا مجسمہ بنا ہوا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ . . . . . . بالآخر میں نے پھر کہا:

"بتا دو! ــــــ للہ بتا دو!! ورنہ . . . میں . . . . تمہیں قتل کرد . . . . ونگا"

"کر دو!" اُس نے اطمینان سے جواب دیا "تمہاری محبت کے مقابلہ میں مجھے زندگی کی بالکل پرواہ نہیں ہے ــــ موت . . . . . . پھر تمہارے ہاتھ سے ــــ زہے نصیب! ــــ مگر . . . .

اُس نے ذرا رُک کر کہا: "جس خیالی حقیقت کی تمہیں تلاش ہے۔ جو سچ تم معلوم کرنا چاہتے ہو وہ بھی تمہیں معلوم ہو جائیگا؟ ــــ یا میری موت بھی تمہیں مطمئن نہ کر سکے گی؟"

میں بلا ارادہ اسکے قدموں پر گر پڑا اور انتہائی عاجزی سے گڑگڑا کر کہنے لگا:۔

"خدا کے لئے! اپنی جوانی کا صدقہ!! مجھ پر رحم کرو اور اپنے دل کی بات بتا دو۔ صاف صاف کہہ دو کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے"۔

"کیوں کہدوں؟" اس نے ازراہِ محبت میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور کہنے لگی: "اللہ رحم کرے! آخر آج تمہیں ہو کیا رہا ہے؟"

"رحم!" میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "اب تو بتا دو!"

میری نگاہیں اس کی شفاف پیشانی پر پڑیں اور معاً خیال آیا کہ صرف اس نازک سے پردے میں اصلی حقیقت چھپی ہوئی ہے۔ کسی دیوانہ خواہش کے ماتحت دل نے کہا ــــ اسے توڑ کر حقیقت معلوم کر لینا کتنا آسان ہے! پھر خیال سینہ کی طرف منتقل ہو گیا۔ اس کے مرمریں اُبھار کے پیچھے صاف دل دھڑکتا ہوا معلوم ہو رہا تھا وہی جھوٹا، فریبی، مکار، دغاباز دل جس نے مجھے دیوانہ بنا دیا تھا۔ میں نے چاہا کہ اپنے تیز ناخنوں سے اس کے ٹکڑے کر دوں۔ تاکہ اس میں چھپی ہوئی حقیقت ــــ وہ چیز جسے میں دل کی بات سمجھتا تھا جوں کی توں معلوم ہو جائے . . . . . مگر نہیں!"

لیمپ کا ہلالی شعلہ رفتہ رفتہ بے نور ہو رہا تھا۔ اس میں بھی کوئی حرکت نہ تھی۔ حقیقت کو وہ بھی چھپا رہا تھا۔ دیواریں بتدریج بڑھنے والی دھندلی دھندلی تاریکی میں مٹی جا رہی تھیں۔ مگر مجھ سے انہیں بھی کوئی ہمدردی نہ تھی۔ ہر چیز پر ایک قسم کی ویرانی، خوف، دہشت اور سوگ برس رہا تھا۔

"خدایا رحم کر! میرے اچھے" . . . . کی حالت پر رحم کر" اس نے زیر لب کہا۔ لیمپ کے زرد شعلے میں ایک قسم کی تھرتھری پیدا ہوئی۔ لمحے بھر کے لئے نیلی سی چمک نمودار ہوئی ــــ اور وہ گُل ہو گیا!!

گہری تاریکی نے ہمیں چھپا لیا۔

اب مجھے نہ اس کا چہرہ نظر آ رہا تھا نہ آنکھیں۔ صرف ایک ہاتھ میرے سر پر رکھا ہوا تھا۔ اور اس سے محبت کی ایسی قوی لہر جسم میں سرایت کر رہی تھی کہ میں مدہوش تھا اور جھوٹ کا خیال رفتہ رفتہ خواب کی طرح میرے دماغ سے محو ہو رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور خیال کو غور و فکر، احساس و عمل سے آزاد کر کے صرف اس روح افزا لمس کی طرف منتقل کر دیا!

وہ سچی تھی! . . . . میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی محبت حقیقی اور بے داغ ہے!!

اندھیرے میں بہکی ہوئی سی آواز میں کسی نے آہستہ سے کہا:۔

"ذرا اور پاس جاؤ . . . . . . مجھے ڈر لگ رہا ہے!"

پھر خاموشی . . . . . وہی بے معنی خاموشی، اور پھر . . . . وہی بہکی بہکی زیر لب گفتگو!

"تم کونسی سچی بات پوچھتے ہو! . . . . مجھے خود معلوم نہیں . . . . . میرے دل میں سوائے تمہارے خیال کے اور کونسی سچی بات ہے؟ ــــــ آہ خدا کرے میں پہلے سے جانتی کہ تم اتنے سخت دل ہو . . . . . . بس یہیں رہو ــــ دیکھو تو کتنی ڈراؤنی رات ہے؟!"

یہ کہہ کر اس نے میرے سینے میں اپنی آنکھیں چھپا لیں۔

میں نے نگاہ اٹھائی تو تاریکی کھڑکیوں سے دور ہو کر رفتہ رفتہ دیوار کے گوشوں میں مجتمع ہو رہی تھی۔ اور رنگین شیشوں کے پیچھے کوئی نہایت ہی طویل خوفناک سفید سفید چیز، کفنائے ہوئے مُردے کا سا جسم اختیار کر رہی تھی!

معلوم ہو رہا تھا کہ کسی کی بے نور پتلیاں ہمیں تک رہی ہیں!

خوف کی وجہ سے بیساختہ ہمارے جسم میں تھرتھری دوڑ گئی ہم اور زیادہ ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ اُس کے بہکے بہکے الفاظ نغمے کی طرح میرے دماغ میں گونج رہے تھے:-

"دیکھو تو کتنی ڈراؤنی رات ہے!!!"

(۴)

میں نے اُسے قتل کر دیا!

جب وہ کھڑکی کے قریب، ایک بے حس اور بے جان مجسمے کی صورت میں پڑی تھی۔ میں نے اُس کی لاش پر اپنا پاؤں رکھ دیا۔ اور خوب ہنسا۔ ——

یہ دیوانگی کی ہنسی نہ تھی —— جی نہیں! میں صرف اس لئے ہنس رہا تھا کہ اب میرا دل قرار پر تھا۔ اُسے پورا اطمینان و سکون حاصل ہو چکا تھا اور سینہ کی وہ مستقل خلش جس نے مجھے کرب مجسم بنا دیا تھا۔ اب کافور تھی۔ میں نے جھک کر اس کی بے نور آنکھوں کو دیکھا:

اُف وہ دلکش، روشنی کی متمنی نیم وا آنکھیں ——! آہ وہ نرگسی پرشباب پراسرار آنکھیں!!

یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی موم کی گڑیا سے مستعار لے لی گئی ہیں!!

میں انہیں انگلیوں سے چھو سکتا تھا۔ حسب مرضی کھول سکتا تھا۔ بند کر سکتا تھا، مطلق خوف محسوس نہ ہوتا تھا۔ اس لئے کہ ان کی اتھاہ گہرائیوں میں اب مکر و فریب، اشتباہ و بدگمانی کا وہ جن موجود نہ تھا جو ایک زمانہ سے میرے سر پر سوار تھا۔ اور مدتوں سے میرا خون چوس کر پرورش پا رہا تھا۔

میں جس وقت گرفتار ہوا اس وقت بھی ہنسا یہ بات ان لوگوں کے لئے جنہوں نے مجھے گرفتار کرایا تھا۔ قطعی ناقابل برداشت ثابت ہوئی۔ وہ مجھے درندہ کہہ رہے تھے اور نفرت و حقارت کے ساتھ میری طرف سے منہ پھیر پھیر کر گالیاں دے رہے تھے۔ شاید کوس بھی رہے ہوں۔ دوسرے لوگ جو ذرا اجنبی تھے میری بدقسمتی سے متاثر ہو کر ازراہ ہمدردی میری طرف بڑھ رہے تھے۔ اور میرے استقلال و اطمینان پر انگشت بدنداں تھے۔

"کوئی دیوانہ ہے!"

ان الفاظ میں وہ اپنے دل کو تسلی دے رہے تھے۔ اور فی الواقع یہی الفاظ اس بے معنی صورت حال کی تشریح ہو بھی سکتے تھے۔ سب متحیر تھے کہ اس قدر وفاکیش عاشق ہو کر میں نے کیوں اپنے بیگناہ و معصوم معشوق کو قتل کر دیا۔ پھر یہی نہیں اسے قتل کرنے کے بعد مجھے وہ کونسی مسرت حاصل ہوئی ہے کہ کسی طرح ہنسی نہیں رکتی۔ صرف ایک خوش مزاج آزاد منش شخص نے مجھے دوسرے الفاظ میں مخاطب کیا اور وہی الفاظ میری مسرت کو پامال کر گئے میں مبہوت ہو کر رہ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ ہمدردانہ لہجے میں کہہ رہا تھا:-

"آہ! اس غریب کی حالت کس قدر قابل رحم ہے!"

"بس خبردار! یہی الفاظ زبان سے نہ نکالنا۔ میں نے اُسے ڈانٹ کر کہا۔ نہیں کہہ سکتا کہ کن جذبات سے متاثر ہو کر میں نے ایک جست کی اور اس شخص کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

میں یقیناً نہ اُسے مارنا چاہتا تھا نہ اُسے سزا دینا چاہتا تھا۔ مگر پھر بھی تمام مجمع جو مجھے دیوانہ اور مجرم سمجھ رہا تھا خوف و دہشت سے کانپ اُٹھا اور چیخیں مار کر اس طرح پیچھے ہٹنے لگا کہ مجھے پھر ہنسی آ گئی اور میں نے خوب قہقہے لگائے۔

اس کے بعد جب لوگ مجھے اس کمرے سے باہر لے گئے جس میں لاش پڑی تھی میں نے باآواز بلند سب سے مخاطب ہو کر کہا:-

"دنیا میں مجھ سے زیادہ کوئی مسرور نہیں ہو سکتا میں بیحد مطمئن ہوں"

—— یہ واقعہ تھا!

(۵)

بچپن میں میں نے عجائب گھر میں ایک چیتا دیکھا تھا اُسے دیکھ کر میں اتنا متاثر ہوا تھا کہ مدتوں خیال میں اس کی صورت قائم رہی وہ اُن درندوں کی مانند نہیں تھا۔ جو تماشائیوں کو بے معنی اور مبہم نگاہوں سے تکا کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اقلیدس کے اُصولوں کے ماتحت ایک کونے سے دوسرے کونے تک خطِ مستقیم بناتا ہوا ٹہلا کرتا اور ہر مرتبہ ٹھیک اُسی نقطے پر مڑا کرتا۔ جہاں سے چلتا تھا۔ صرف اُسی آہنی سلاخ سے جسم رگڑتا جو پانچواں قدم اُٹھانے کے بعد اس کے شانے کے پاس ہوتی۔ اس کا سر ایک فلسفیانہ انداز سے جھکا ہوتا اور آنکھیں ٹھیک خطِ مستقیم پر سامنے دیکھا کرتیں ایک مرتبہ بھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ اس نے کسی برابر کی چیز کو دیکھا ہو۔

دن بھر تماشائیوں کا ہجوم اس کے پنجرے کے سامنے لگا رہتا مگر اسے اس کی پرواہ بھی نہ ہوتی وہ بدستور اپنی مقررہ رفتار سے پنجرے میں چل رہی

کرتا رہتا اور تماشائیوں کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔

آنے والوں میں سے اکثر اس کی حالت پر افسوس کرتے اور اکثر مسکرا کر چلے جاتے لیکن جس وقت وہ تمام جانوروں کو دیکھ کر عجائب گھر سے نکلتے تو بالعموم مڑ کر چیتے کے پنجرے کو ایک دو مرتبہ ضرور دیکھ لیتے خدا معلوم یہ کونسی کشش تھی، بہت ممکن ہے۔ ان میں اور اس مقید درندے میں کوئی جنسی مناسبت یا صفت مشترک موجود ہو۔

اس کے بعد جب میں بڑا ہوا تو کتابوں میں انسان کو "حیوان ناطق" لکھا دیکھا۔ میں نے جس قدر اس مسئلہ پر غور کیا مجھے اس چیتے کی مثال میرے سامنے آتی رہی، انسان واقعی حیوان ہے۔ جسے اس کی حیوانیت کا حصہ چیتے کے ساتھ ملا ہے۔ مگر کن چیتوں کے ساتھ؟

جنگلی چیتوں کے ساتھ نہیں بلکہ ان چیتوں کے ساتھ جنہیں مقید رہنے اور کڑھنے کے لئے "تخلیق" کیا گیا ہے۔

میں بھی اس وقت جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں بالکل اُسی چیتے کی طرح مقید تھا۔ میں بھی اسی طرح کوٹھری کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ایک خط مستقیم پر ٹہلا کرتا اس دوران میں خیالات کے ہجوم سے دماغ اتنا بھاری ہو جاتا کہ تمام دنیا کے مصائب کا بار مجھے اپنے سر پر معلوم ہونے لگتا۔

یہ تمام خیالات ایک لفظ صرف ایک خوفناک لفظ پر قائم تھے اور وہ لفظ "جھوٹ" ہے

جیل کی ہر کوٹھری سے، کوٹھری کی ہر دیوار سے، دیوار کی ہر اینٹ سے جھوٹ کی آواز میرے کانوں میں سانپ کی پھنکار کی طرح آ رہی تھی۔ اور میری روح پر ایک تاریک بادل کی طرح چھائی جا رہی تھی۔ اب وہ معمولی سانپ کی پھنکار نہیں معلوم ہوتی تھی۔ بلکہ کسی بڑے بھاری خونخوار اژدھے کی پھنکار تھی۔ جو ہر طرف سے میری روح کو اپنی آہنی گرفت میں کس رہا تھا۔ اور جب درد کی شدت سے ایک ایسا احساس لئے ہوئے گویا میرے تمام جسم پر سانپ رینگ رہے ہیں، چیخ اُٹھتا، تو زبان سے صرف "جھوٹ" پھنکار بنکر نکلتا، جس سے مجھے خود بھی یہ شبہ ہونے لگتا کہ کہیں میں سانپ ہی تو نہیں بنگیا ہوں۔

میں ان ہی خیالات میں منہمک صبح سے شام تک ٹہلا کرتا۔ یہاں تک کہ سنگریزوں کا فرش میری نگاہ میں ایک دھندلی اور بے رنگ سی تاریک خندق معلوم ہونے لگتا۔ پیروں سے فرش کے لمس کا احساس جاتا رہتا۔ اور اکثر یہ محسوس ہونے لگتا گویا میں کسی کہر آلود فضا میں نہایت بلندی سے گرایا جا رہا ہوں۔

پھر میرا دل خوف سے اُچھلنے لگتا اور اس سے ایک کراہ بنکر وہی پھنکار نکلتی جو اوپر سے نیچے سے، آسمان سے زمین سے، درختوں سے اینٹوں سے غرض کائنات کی ہر چیز سے بازگشت ہوتی —— اس طرح گویا وہ کسی دوسری دنیا سے ہزارہا منزلیں طے کر کے کہر اور برف میں لڑکھڑاتی ہوئی مجھ تک پہونچ رہی ہے

مجھے یقین تھا کہ اسی مدہم پھنکار کے پردے میں ایک ایسا تیز طوفانی جھونکا ہے جو درختوں کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک سکتا ہے لیکن مجھ تک پہونچے میں وہ صرف اس زیرِ لب کہے ہوئے بالکل آہستہ لفظ کی صورت اختیار کر لیتا ہے —— "جھوٹ"۔

اس ذلیل لفظ نے بالآخر مجھے برافروختہ کر دیا اور میں نے زور سے فرش پر پاؤں مارتے ہوئے کہا:۔

"کوئی جھوٹ نہیں ہے، جھوٹ کا میں نے خاتمہ کر دیا ہے"

یہ کہہ کر میں قصداً دوسری طرف مخاطب ہو گیا۔ مگر بے کار، جس جواب سے ڈرتا تھا وہی جواب خاموشی کے ساتھ فرش کی خوفناک خندق سے برآمد ہوا:۔

"جھوٹ"!!

آہ! اب مجھے احساس ہوا کہ میں نے بڑی سخت غلطی کی کہ جھوٹی عورت کو قتل کر کے اُسکے "جھوٹ" کو غیر فانی بنا دیا۔ پس عوام کو میری نصیحت ہے کہ ہرگز کسی جھوٹی یا فریب کار عورت کو قتل نہ کیا جائے تاوقتیکہ عجز و الحاح، استدعا و التجا، جبر و تشدد سے جس طرح بن پڑے اس کی دلی کیفیت نہ معلوم کر لی جائے۔

جیل کی کوٹھری میں مسلسل ۷۲ گھنٹہ چہل قدمی کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں ——!

(۴)

وہ جگہ جہاں اس نے سچی بات کے ساتھ اپنا جھوٹ بھی چھپا لیا ہے۔ نہایت اندھیری اور خوفناک ہے —— مگر میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ وہاں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑوں خدا کے سامنے اُسے پیش کروں گا۔

اور اس کے قدموں پر گر کر روؤنگا۔ وہاں تو کوئی بات نہیں چھپ سکتی!
خدا میرا انصاف کرے گا!

لیکن خدا! —— !؟!!؟ ادہو . . . . خدا! یہ بھی جھوٹ محض فریب! وہاں بھی صرف یہی بے پایاں تاریکی ہے اور صدہا صدیوں، ہزارہا قرنوں کا ایک لامحدود خلا —— !! . . . . لیکن وہ بھی نہیں ہے! . . . . . . کہیں بھی نہیں ہے! . . . . . . صرف جھوٹ اس کی یادگار رہ گیا ہے، بالکل غیر فانی یادگار —— !!

فضا کے ذرات میں دنیا کی گردش میں عقبیٰ کی تاریکی میں ہو وقت کی رفتار میں ہر جگہ جھوٹ ہی جھوٹ ہے۔ فریب ہی فریب بھرا ہوا ہے اور جب میں سانس لیتا ہوں وہ ہوا کے ساتھ میرے پھیپھڑے میں داخل ہو کر سانپ کی طرح پھنکارتا ہے۔ اور دل کو ڈس کر سارے جسم میں زہر ہی زہر پھیلا دیتا ہے . . . . . . نہایت ہی قاتل زہر!!

آہ حقیقت کی تلاش بھی انسان کی کتنی زبردست دیوانگی ہے؟ انسان کیوں مجبور ہے؟؟

کوئی نہیں بتاتا . . . . بتا ہی نہیں سکتا!!

سب فریب! . . . . خدا کے لئے . . . . بچاؤ میں مرا . . . . !! لوگو مجھے بچاؤ!!!

(لیونیڈ اینڈریو)

غزل

از قمر نعمانی سہسرامی

ملے ہیں بعد مدت کچھ نہ پوچھو دل کی طغیانی
یہ وہ آنسو نہیں ہیں جذب ہو جائیں جو داماں میں

ازل میں جو سنائے تھے کسی نے دلنشیں نغمے
وہی نغمے تڑپتے ہیں مرے سازِ رگ جاں میں

ہوئی جاتی ہیں شرحیں آجتک لفظِ محبّت کی
نہیں معلوم کتنی وسعتیں ہیں ایک عنواں میں

عنایت کا تمہاری دل سے میں ممنون ہوں لیکن
کمی کوئی نظر آتی نہیں ہے میرے ارمانوں میں

یہ اندازِ پشیمانی بھر آئیں وہ حسیں آنکھیں
نہیں معلوم کیا دیکھا میرے چاکِ گریباں میں

وہ ظرفِ عشق تھا جس کو ملائک نے کیا سجدہ
نہیں تو اور کیا رکھا تھا مشتِ خاکِ انساں میں

نہیں معلوم کس عالم میں پہونچا آپ کا وحشی
نظر آتے ہیں دھبّے خون کے سارے بیاباں میں

اُمنڈ آئے ہیں جذباتِ محبت سیلِ غم بن کر
خدا حافظ، سفینہ عمر کا ہے تیز طوفاں میں

ملی جاتی ہے اب معراج میری سجدہ ریزی کو
تری صورت نمایاں ہو چلی داغِ فروزاں میں

قمرؔ اندھیر یہ کیا ہو رہا ہے وقت نظارہ
نظر کیوں جذب ہوتی جا رہی ہے رُوئے تاباں میں

گلزار خلیل!

از حضرت خلیل بیگوسرائی،

بگڑ کر بنے وصل میں بات کیونکر
جو رُوٹھے ہو تم تو کٹے رات کیونکر

کٹے کس طرح دن کٹے رات کیونکر
نہ ہوں وہ تو پھر گذرے برسات کیونکر

ہے اعجاز اعجاز، جادُو ہے جادُو
لبوں سے چلے آنکھ کی گھات کیونکر

تمھیں اپنے جانے کی جلدی پڑی ہے
جُدائی میں کاٹینگے ہم رات کیونکر

کمر بھی نہیں ہے دہن بھی نہیں ہے
بندھے تیغ کیونکر، کریں بات کیونکر

خبر ہی نہیں سرنوشتِ ازل کی
نتیجے نکالیں قیاسات کیونکر

وہ کیا اس کو جانیں یہ ہم جانتے ہیں
تڑپتے ہیں عشاق دن رات کیونکر

کجی اُن کی رفتار و گفتار میں ہے
کریں مجھ سے سیدھی کوئی بات کیونکر

زمانہ تو دشمن ہے اہلِ ہنر کا
بسر کرتے ہیں پھر یہ اوقات کیونکر

وہ صبحِ شبِ ہجر کہتے ہیں آکر
کہو رات کی کچھ، کٹی رات کیونکر

کہیں اس کو بھی وہ شکایت نہ سمجھیں
بیاں کیجئے دل کے حالات کیونکر

وہ دیکھیں ذرا زُلف بکھرا کے رُخ پر
گذرتی ہے پھر وصل کی رات کیونکر

تغافل، تجاہل سے فرصت کہاں ہے
کسی سے کریں وہ مُلاقات کیونکر

بتائے جو چال اُن کو دشمن سا شاطر
تو پھر بازی اپنی نہ ہو مات کیونکر

سرِ مُصحفِ رُخ بھی ہے خالِ ہندو
کسی کی رہے عشق میں ذات کیونکر

زباں ایک ہے نعمتیں لاتعد ہیں
ادا پھر ہو شُکرِ عنایات کیونکر

جو سُن سُن کے پی جائیں ہم واعظوں کی
خفا پھر ہو پیرِ خرابات کیونکر

خلیل آپ کا دل تو نازک بہت تھا
سہے ہجر کے رنج دن رات کیونکر

حنوط شدہ لاشیں

یعنی

خوشبودار مسالہ لگا کر نعشوں کو محفوظ رکھنے کا نایاب فن

اسرارِ مصر کا ایک ہیبت ناک باب

از جناب عبدالرحیم صاحب شبلی۔ بی کام۔ مدیر معاون "خیام"

مصر اپنے آثارِ قدیمہ کی وجہ سے دنیا بھر میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے فراعنہ کے زمانہ کی بنی ہوئی عمارات امتدادِ زمانہ سے اب تک مامون و مصئون ہیں جن کو دیکھنے کے لئے لوگ اکنافِ عالم سے جاتے ہیں اور قدمائے مصر کے فنِ سنگتراشی اور تعمیر پر محض متحیّر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن اِن سب عجائبات میں سے زیادہ روح فرسا، ہیبت ناک اور لاجواب وہ ممیّاں یا حنوط شدہ لاشیں ہیں جو اب تک تر و تازہ مصر کے عجائب گھروں میں صحیح و سالم موجود ہیں۔

قدیم مصری مسئلہ تناسخ کے قائل تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ مُردے کی روح کبھی نہ کبھی پھر اپنے جسم میں حلول کر آئیگی۔ اس لئے وہ اپنے مُردوں کی لاشیں نہایت سنبھال سنبھال کر رکھا کرتے تھے۔

لاش محفوظ کرنے کے لئے بہت سے آدمی درکار ہوتے تھے۔ بعض تو نتھنوں کے راستہ سے کسی اوزار کے ذریعہ مُردہ کا بھیجا نکال لیتے تھے۔ اور بعض حبش کے ایک قسم کے پتھر کے ذریعہ جو اُسترے کی مانند تیز ہوتا تھا پہلو میں سوراخ کر کے آنتیں باہر لاتے تھے۔ اور بعض کھوکھلی کھوپری اور خالی پیٹ کو طرح طرح کے عطریات اور خوشبودار مصالحوں سے بھرتے تھے۔

جو لوگ جسم کو آلائشوں سے پاک کرتے تھے اُن کو اچھا نہ سمجھا جاتا تھا۔ لوگ اُن کے پیچھے پتھر لے کر بھاگتے تھے۔ لیکن عطریات اور مصالحے بھرنے والوں کی بہت عزت و تکریم کی جاتی تھی۔

لاش کو مصالحوں سے بھر کر اُس پر ایک اعلیٰ قسم کے کپڑے کی پٹیاں لیسدار گوند میں تر کر کے لپیٹی جاتی تھیں۔ اور اُس پر پھر خوشبودار مصالحوں کی ایک تہہ چڑھا دی جاتی تھی۔ اِن تدابیر سے مُردے کی ہیئت جُوں کی توں باقی رہتی اور کسی نوع کے تغیّر کو اس میں دخل نہ ہوتا تھا۔

لاش علی العموم صندوقچوں میں بکمال احتیاط بند کر کے یا تو قبرستان میں رکھ دی جاتی تھی اور یا گھروں میں دیوار کے سہارے کھڑی کر دی جاتی تا کہ رشتہ دار اپنے بڑوں کی بھلائیاں یاد کر کے نصیحت حاصل کریں اور اُن کی طرح خود بھی نیک بنیں۔

ممی کے صندوق پر علی العموم مرحوم کی شکل کھینچ دی جاتی تھی اور ساتھ ہی مختصر طور پر اس کے خاندانی حالات درج کر دیئے جاتے تھے۔ تا کہ مصریوں کے اعتقاد کے مطابق جب روح دوبارہ واپس آئے تو اُسے اپنے جسم کے پہچاننے میں چنداں دِقّت محسوس نہ ہو۔

ابتدا میں لاشوں کو زمین دوز قبروں میں دفن کیا جاتا تھا اور بعض اوقات زمین کے اندر دیواریں بنا کر اُن کے چور خانوں میں محفوظ

کر دی جاتی تھیں۔

آہستہ آہستہ قبروں کی عزت کا خیال پیدا ہوا تو مصری قبروں کے اوپر گنبد نما چبوترے بنانے لگے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور خرابی پیدا ہو گئی۔ اور وہ یہ کہ مصری اپنے مُردوں کے ساتھ اُن کے مملوکات اور مالوفات بھی دفن کر دیتے تھے۔ اس سے وہاں چوروں کی ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی جو ان قبروں کو کھود کر اُن میں سے سونے چاندی کی اشیا نکال لیتے تھے۔ اس طرح پر مُردوں کی بے حرمتی ہونے لگی جس کا ازالہ کرنے کے لئے اُمراء اور خصوصاً بادشاہوں کی نعشیں خاص طور پر محفوظ کی جانے لگیں اور اس کا طریقہ یہ تھا کہ مُردہ کو دفنانے کے لئے سنگین مقبرے بنائے گئے جس میں اس قدر تہہ خانے اور اندھیرے کمرے ہوتے تھے۔ کہ اُس میں تمام قیمتی اور نایاب مالوفات بہ آسانی آ سکتے تھے ان سنگین مقبروں کو "اہرامات" کہتے ہیں جن کے آثار آج تک مصر میں موجود ہیں اور دنیا کے سات عجائبات میں شمار ہوتے ہیں۔

لیکن باوجود اس حزم و احتیاط کے "ممیاں" چوری سے محفوظ نہ رہ سکیں چنانچہ یہاں ہم سب سے بڑے ہرم کی ایک مشہور چوری کا قصّہ درج کرتے ہیں:۔

سب سے بڑے ہرم کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ خوفو فرعون کا ہے لیکن کہتے ہیں کہ یہ شخص کسی شاہی خاندان سے تعلق نہ رکھتا تھا بلکہ مصر میں منقرو نامی ایک زبردست بادشاہ ہو گزرا ہے۔ اُسے روپیہ جمع کرنے کا از حد شوق تھا۔ اس نے ایک ماہر انجینئر سے اپنے لئے ایک محل بنوایا اور اس میں خزانہ رکھنے کے لئے خاص کمرے تیار کرائے۔ انجینئر نے اس خزانہ تک پہونچنے کے لئے ایک چور دروازہ بھی رکھا جس کا بھید سوائے بادشاہ اور اس انجینئر کے اور کوئی نہ جانتا تھا۔ بادشاہ نے افشائے راز کے خوف سے انجینئر کی آنکھیں بھی اندھی کرا دیں۔ لیکن جب انجینئر مرنے لگا تو اُس نے اس دروازے کا راز اپنے دو بیٹوں کو بتا دیا۔ انہی میں سے ایک کا نام خوفو تھا۔

چنانچہ یہ دونوں لڑکے ہر روز چوری چھپے مقبرے میں جاتے اور وہاں سے قیمتی اشیا چرا لاتے۔ مدتوں تک اس راز کا کسی کو علم نہ ہو سکا۔

اُدھر فرعون نے جب اپنے خزانے کو گھٹتے دیکھا تو اُسے بہت حیرت ہوئی اور اُس نے چور پکڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

ماہر کاریگروں سے اُس نے ایک ایسا آلہ تیار کرا کے خزانے کے صندوق پر رکھا دیا جو ہاتھ لگانے والے کو فوراً جکڑ لیتا تھا۔

دونوں چور بھائیوں کا دستور یہ تھا کہ ایک اندر جاتا اور دوسرا باہر کھڑا رہتا تھا۔ اس مرتبہ جب ایک بھائی اندر گیا تو آلے نے اُسے پکڑ لیا۔ اُس نے اپنے کو چھڑانے کی بہتیری کوشش کی۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر اُس نے اپنے دوسرے بھائی خوفو کو آواز دی اور کہا کہ میرے تو بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ اب مناسب یہی ہے کہ تم میرا سر کاٹ لو ورنہ تم اور والدہ دونوں پھنس جاؤ گے۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا اور گھر آ کر ماں کو سب قصّہ کہہ سنایا۔

دوسرے دن صبح کو بادشاہ خزانہ میں گیا تو اُس نے سر بریدہ لاش دیکھی۔ اصل آدمی کا کھوج لگانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن کچھ پتہ نہ چلا تب منقرو نے حکم دیا کہ اس لاش کو سرِ راہ گزر لٹکا دیا جائے۔ اور نگرانی کی جائے تاکہ جو بھی حزن وملال کا اظہار کرے اُس کو گرفتار کر لیا جائے۔

اُدھر خوفو کی ماں اپنے بیٹے کی لاش کا سُن کر بہت غمگین ہوئی۔ اور اس نے خوفو سے کہا کہ بھائی کو دفن کراؤ ورنہ میں جا کر بادشاہ سے سب حال کہہ دُوں گی۔ خوفو نے بہت سمجھایا۔ لیکن وہ نہ مانی۔

بالآخر اُس نے ایک ترکیب نکالی۔ اور وہ یہ کہ اُس نے چار مشکوں پر شراب لادی اور اُس جگہ آ کر اُن میں چھید کر دیا جب پہریداروں نے بہتی ہوئی شراب دیکھی تو وہ لٹو ہو گئے اور آ کر بے تحاشا پینے لگے۔ خوفو نے اپنے آپ کو بیوقوف بنا لیا اور اچھلنے کودنے لگا سپاہی اُسے احمق جان کر خوب مے نوشی میں مصروف ہو گئے۔ اور آخر اتنی پی کہ وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔

خوفو نے موقع کا فائدہ اُٹھایا اور بدمست پہرہ داروں کی ڈاڑھی مونچھ کا صفایا کر کے لاش بغل میں دبائی اور چلتا بنا۔

جب ہوش آیا تو پہرہ دار لاش گم پا کر بہت حیران و پریشان ہوئے۔ بادشاہ کو علم ہوا تو وہ بہت ناراض ہوا۔ لیکن اس چور کی چالاکی اور ہوشیاری کا اُس کی طبیعت پر بہت اثر ہوا۔ اُس نے اعلان

لیا کہ جو شخص اپنے آپ کو رضا کارانہ پیش کر دے گا۔ میں اُس سے اپنی لڑکی کی شادی کر دوں گا۔

لیکن جب یہ تجویز کارگر نہ ہوئی تو منقرو نے اعلان کر دیا کہ جس شخص نے یہ فعل کیا ہے۔ اگر وہ خود حاضر ہو جائیگا۔ تو میں اُسے بالکل معاف کر دوں گا۔

یہ سنکر خوفو خود حاضر ہوا اور اصل حالات کہہ سنائے۔ بادشاہ نے اُس کے ذہنِ رسا کی داد دی اور جب اُسے معلوم ہوا کہ وہ شاہی انجنیئر کا لڑکا ہے تو اُس نے اپنی بیٹی سے اُس کا نکاح کر دیا۔

جب منقرو مر گیا تو خوفو تخت نشین ہوا۔ یہ چونکہ یہ علم الہندسہ میں ماہر تھا اور انجنیرانہ دماغ باپ سے ورثہ میں پایا تھا۔ اس لئے اُس نے اپنے لئے یہ عظیم الشان مقبرہ بنوایا اور اُس میں اپنی ممّی محفوظ رکھنے کا فرمان جاری کر دیا۔

مدت تک ماہرین کو اس مقبرے کے اندر جانے کا کوئی راستہ معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن اب علمائے آثار نے پتھر توڑ کر راستہ بنالیا ہے۔

اندر خوفو کی لاش کا کچھ پتہ نہ چل سکا لیکن وہاں اُس کی محبوب اشیاء مثلاً پلنگ، کرسیاں، میزیں۔ کپڑے حتیٰ کہ کھانے بھی رکھے ہوئے تھے۔ اور پاس ہی پتھر کے دربان مؤدبانہ کھڑے تھے۔ لیکن اب یہ تمام چیزیں اُٹھا کر عجائب گھر میں رکھ دی گئی ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چوروں کے ڈر سے لاش کو کسی اور جگہ دفن کر دیا گیا تھا اور یہاں صرف اُس کے مالوفات رکھے گئے تھے۔

رولن نے اپنی کتاب "مصر کی قدیم تاریخ" میں لکھا ہے کہ عمدہ طریق پر لاش کو مومیائی بنانے کے لئے ایک ہزار تین سو پچھتر روپے خرچ آیا کرتے تھے اور مسالے وغیرہ لگانے میں تقریباً چالیس دن صرف ہو جاتے تھے۔

مصر میں حنوط شدہ "لاشیں" بہت ہیں لیکن انہیں کسی اور ملک میں لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ حال ہی اخبارات میں شائع ہوا تھا کہ ہندوستانی عجائب گھر میں ایک ممّی موجود ہے جس کی حالت اب خراب ہو رہی ہے۔

ممیوں کی بابت عام طور پر عجیب عجیب قصے مشہور ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ ان لاشوں کو چھیڑنے سے انسان پر وبال آتا ہے چنانچہ مدت ہوئی کسی انگریز کا ایک مضمون اخبارات میں شائع ہوا تھا کہ جن جن لوگوں نے توت انخ آمون کی لاش کو ہات لگایا ہے۔ وہ نہایت عبرت انگیز طریق سے راہیٔ عدم ہوئے۔ واللہ اعلم بالصواب +

غزل

سامنے جب شراب ہوتی ہے
جل کے توبہ کباب ہوتی ہے

مفلسی ہی خراب ہوتی ہے
زندگی اِک عذاب ہوتی ہے

آرزو کامیاب ہوتی ہے
دل سی شئے انتخاب ہوتی ہے

حُسن کب بے نقاب ہوتا ہے
بے خودی خود حجاب ہوتی ہے

تیری مستی بھری نگاہوں کی!
ہر نظر آفتاب ہوتی ہے

دُختِ رز بھی ہماری محفل میں
شرم سے آب آب ہوتی ہے

شامِ فرقت مری دعا حیدر
آپ اپنا جواب ہوتی ہے

مزدور اور سرمایہ دار

ایک انقلاب انگیز نظم

از جناب چودھری عبدالرشید صاحب تبسم بی۔ اے

مزدور

زندگی لعنت مسلسل بلکہ لعنت سے فزوں — ہر قدم پر ایک تازہ موت خودداری کا خوں

میری پیشانی پہ ہے لکھا مشقت کا صلہ — ذلت و خواری غریبی اور بخت واژگوں

خاک کا تودہ تھا یہ تیرا جہانِ نازِ اش — اے خدا میں نے بنائے گنبد و قصر و ستوں

میرے ہاتھوں سے بنی کوشک امیروں کیلئے — سر چھپانے کیلئے خود ٹھوکریں کھاتا پھروں

اس سے اک خوشہ نہ حاصل ہو مجھے اندھیر ہے — میں لہو سے رات دن جس کھیت کو سینچا کروں

خانۂ مزدور ہی فاقوں سے لبریزِ فغاں! — محفلِ ثروت میں مستی اور چنگ و ارغنوں

کور ذوقی اور جفا زردار کی حسنِ مذاق — میری خوش فہمی وفا ایثار سب فعلِ زبوں

اُس کی ننگ آدمیت خواہشیں عقلِ سلیم — میری جائز آرزوئیں آئینہ دارِ جنوں

مذہب و تہذیب کے احکام سب میرے لئے — اُس کے آگے محتسب کی شوخ چشمی سرنگوں

فاطرِ ہستی یہی انساں ہے تیرا شاہکار؟ — ایک دل جب مضطرب ہو دوسرا پائے سکوں

عمر بھر مجبوریوں نے سر بہ خم رکھا مجھے — ورنہ مجھ پر اور چلے سرمایہ داری کا فسوں

کر رہا ہوں پرورش صدیوں سے جوشِ انتقام — اس زمیں کو خون سے اک دن کرونگا لالہ گوں

آسماں تھرا اٹھے جس سے وہ ہوگا انقلاب — جب کرونگا میں عَلَم سرمایہ داری کا نگوں

سرمایہ دار

میری تن آسانیوں پر کیوں ہے یہ آہ و فغاں — زندگی انساں کی استحقاق ہے کوشش نہیں

فردوس خواب

مجھکو بابا سے ملا ورثے میں کمخواب و حریر
جدِّ امجد کی عنایت ہے یہ قصرِ مرمریں

اور یہ مزدور قسمت کا ہے دھتکارا ہوا،
دفن ہونے کو اسے ملتی نہیں گز بھر زمیں

اس کی کم ظرفی نے فطرت کا بگاڑا ہی مزاج
رفتہ رفتہ ہو رہی ہے وہ خبیس و خشمگیں

سیم و زر لیکر بھی ہیں راضی نہ تھا روزِ ازل
بن گیا مزدور جھٹ جاروب و تیشہ کا امیں

کل جہاں کی نعمتیں کافی نہیں میرے لئے
شکر کرتا ہے جو مل جائے اسے نانِ جویں

دے رہا ہوں مزد کی صورت میں اسکو میں زکات
درحقیقت اس کی محنت کا صلہ کچھ بھی نہیں

یہ جہاں ہے میری تکمیل تمنا کے لئے
اور اسے مرکر ملیگی حور و جوئے انگبیں،

دہر کی سب خوبیاں پنہاں ہیں میری جیب میں
عقل و دانش ہے مرے خوانِ کرم کی ریزہ چیں

مذہب و تہذیب یہ سب مکر ہے انسان کا
فعلِ بد میں محتسب بنتا ہے خود میرا معیں،

میری ہر تدبیر ہے مزدور کی موت و حیات
میرے در سے وہ اٹھا سکتا نہیں اپنی جبیں،

حق تو یہ ہے بن گیا اُس کا لہو میرا نکھار
دیدنی ہے میرے چہرے کی بہارِ احمریں

مجھ کو استبداد سے روکیگا کس کا انقلاب
خود کئی فتنے لئے پھرتا ہوں زیرِ آستیں

میرے چنگل سے رہا مزدور ہو سکتا نہیں
تا ابد یونہی رہیگی یہ گرفتِ آہنیں

تندرستی

از نثار الملک میر احمدی اجمیری

اے بصارت آدمی لاچار ہے تیرے بغیر
ہر چمن اس کی نظر میں خار ہے تیرے بغیر

اے مری کھوئی ہوئی طاقت کہاں پاؤں تجھے
زندگی کا ہر نفس دشوار ہے تیرے بغیر

اے شفا تو کون سے دارالشفا میں جا چھپی
آج دستِ چارہ گر ناچار ہے تیرے بغیر

واقعی اے تندرستی تو ہے جانِ زندگی
آدمی کی زندگی بیکار ہے تیرے بغیر

اے مری "وعدہ وفائی" تو نہیں تو کچھ نہیں
میر کا اقرار بھی انکار ہے تیرے بغیر

ڈاکٹر راشد

ایک ڈاکٹر کا حیرت انگیز قصہ جسے خود اپنے کو قتل کر دینے کے جرم میں پھانسی ملی

از جناب سید منظر صاحب کاظمی بی اے آنرز

اس خیال کا ایک موہوم سا عکس ڈاکٹر راشد کے دل میں اس بیمہ کے ایجنٹ کی ضد سے پیدا ہو گیا تھا جو ہر روز دروازے پر آدھمکتا اور ملاقات کا طالب ہوتا۔ یہ خیال رفتہ رفتہ قوت پکڑتا گیا۔ اور آخر ایک دن اُسنے اُسے شرف ملاقات بخشا۔ خاموشی سے اس کی لچھے دار باتوں کو سُنا، در قطعی فیصلہ کے لئے کچھ مہلت لیکر اُسے ایک ہفتہ بعد آنے کو کہا۔

ڈاکٹر راشد بمبئی کا ایک مشہور و معروف ڈاکٹر تھا۔ جیسا کہ ہر شخص اس کے دروازے پر لگی ہوئی تختی دیکھ کر معلوم کر سکتا تھا وہ ایک پلاسٹک سرجن تھا۔ اُس قسم کا ڈاکٹر جسکے وجود اور ارتقا کی وجہ صنف نازک اور ان کی خوبصورتی اور جوانی کو عرصہ تک برقرار رکھنے کی خواہش تھی وہ اپنے تیز چاقو چلتے ہوئے ہاتھ اور دیگر ادویات کے ذریعہ یہی نہیں کہ چہرے پر جھریاں صاف کر دیتا یا یہ کہ پچکے ہوئے گالوں اور اندر دھنسی ہوئی آنکھوں کو درست اور خوشنما بنا دیتا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ چہرے پر سے کئی سالوں کو غایب کر دیتا ساٹھ برس کے بوڑھے کو پچیس برس کا جوان بنا دیتا۔

شروع شروع میں تو گاہکوں کی تعداد بہت ہی کم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھی لوگ اوّل تو یقین بھی نہ کرتے تھے کہ ایسا ہو جانا بھی ممکن ہے اور پھر اُس چاقو سے بھی خوف کھاتے جو ڈاکٹر راشد بیدردی لیکن انتہائے اطمینان و وثوق کے ساتھ استعمال کرتا تھا لیکن رفتہ رفتہ لوگ اُس کی قابلیت کے قائل ہو گئے اور کچھ ہی دنوں بعد اس کی آمدنی معقول ہو گئی اور پھر تو یہ حالت ہو گئی کہ بوڑھی عورتیں جن کے دل ابھی تک شباب کی نیرنگیوں سے بھرے ہوئے تھے اور جو ایک بار پھر اپنی کھوئی ہوئی جوانی کو دیکھنے کی متمنی تھیں۔ جوق در جوق آنے لگیں چونکہ وہ اپنے ہر مریض کے ساتھ انتہائی خلاق سے پیش آتا تھا اس لئے اُس کی پریکٹس اور بھی عروج پکڑتی گئی جب وہ کافی مشہور ہو گیا اور اس کی آمدنی اچھی خاصی ہو گئی تو اس نے اُس چھوٹے سے کمرے کو خیرباد کہا اور دادر میں ایک نفیس بنگلہ لیکر رہنے لگا اور بڑی شان و شوکت سے زندگی بسر کرنے لگا کہ جو کچھ بھی کماتا سب ظاہری نمائش پر ختم کر دیتا۔

جیسا کہ دنیا کے ہر پیشہ میں قاعدہ ہے اس کام کے کرنے والے اور بہت سے نئے ڈاکٹر پیدا ہو گئے اور لوگوں کو اپنی طرف مخاطب کرنے کے لئے ان لوگوں نے فیس بھی بہت کم رکھی پہلے تو ڈاکٹر راشد کچھ پریشان ہوا لیکن پھر اسنے بھی اپنی فیس کئی درجہ کم کر دی لیکن واقعات اس کی خلاف اُمید بد سے بدتر ہوتے گئے اور اس کا خرچ ویسا ہی رہا آخر اُس نے یہ سوچا کہ اس بنگلہ کو چھوڑ کر اور ظاہری نمائش و آرائش کو خیرباد کہکر پھر وہ کوئی کمرہ کرایہ کا لیکر رہنے لگے تاکہ اس قلیل آمدنی میں گذر اوقات ہو سکے لیکن اس نے یہ بھی سوچا کہ اگر اُس نے ایسا کیا تو رہی سہی آمدنی اور شہرت بھی ہمیشہ کے لئے جاتی رہے گی اب اُسے اپنے اخراجات اور ظاہری نمائش کو قائم رکھنے کے لئے قرض لینے کی ضرورت پڑنے لگی یہ آمدنی کم اور خرچ زیادہ۔ قرض کی رقم بھی بڑھنے لگی اور آمدنی سے کہیں زیادہ اس کا سود ہونے لگا معاملہ خطرناک صورت اختیار کرتا معلوم ہوتا اور ڈاکٹر راشد رات رات بھر پڑا سوچا کرتا کہ کس طرح وہ قرض کو ادا کر کے نجات حاصل کرے

بیمہ کے ایجنٹ کی آمد نے جس خیال کو اس کے دل میں پیدا کر دیا تھا وہ اب اُسے منطق کی روشنی میں جانچنے لگا اور اُسے یہ معلوم کر کے اطمینان ہو گیا کہ اُس کی تدبیر ہر پہلو سے جامع اور مکمل تھی اور ناکامیابی کی کوئی وجہ بھی معلوم نہ ہوتی تھی۔ اب اُس نے اِس کو عمل میں لانے کی ٹھانی

ایک دن وہ اُٹھ کر اُس کمرے میں گیا جہاں وہ سامان رکھا کرتا تھا اور کامل ایک گھنٹہ مدتوں سے پڑے ہوئے ڈبوں اور بوتلوں کو دیکھتا رہا پھر ایک چھوٹے سے بکس کو لئے باہر بڑے کمرے میں آیا۔ اِس میں صورت تبدیل کرنے کا سامان تھا۔ جو وہ کالج کی تعلیم کے زمانے میں ڈراموں میں استعمال کیا کرتا تھا اور اُسے صورت تبدیل کرنے میں زبردست مہارت تھی۔

شام کو اُس نے نوکروں کو جلد ہی رخصت کر دیا اور خانساماں سے کہدیا کہ کھانا جلد ہی لگا دے اِس لئے کہ اُس نے کسی مریض کے یہاں جانا ہے۔ جب سب نوکر ایک ایک کر کے چلے گئے تو وہ دروازہ بند کر کے اپنے سونے کے کمرے میں گیا اُس چھوٹے بکس کو کھولا اور آئینہ کے سامنے جا بیٹھا۔ اس نے بائیں کنپٹی کے پاس ایک بہت بڑا سُرخ نشان بنایا پھر دراز کھول کر کچھ اپریشن کے اوزار نکالے۔ ایک چھوٹی شیشی سے کوئی دوا نکال کر اپنی ناک کے پاس کئی انجکشن دیئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی اصلی ناک غائب ہو گئی اور اُس کی جگہ کہیں بڑی اور لمبی پھولی ہوئی ناک آموجود ہوئی۔ کچھ دوائیں اُس نے اپنے گالوں اور آنکھوں کے حلقوں پر لگائیں بالوں پر ایک سفوف مَلا اور .... اور اب اس کو روز کا دیکھنے والا بھی نہ پہچان سکتا تھا کہ وہی ڈاکٹر راشد تھا۔ اس کے اصلی اور اس نقلی چہرے میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ آنکھیں چھوٹی ہو گئیں تھیں ناک لمبی اور پھولی ہوئی۔ بال بجائے سیاہ کے بھورے اور کنپٹی پر ایک بڑا سُرخ نشان۔ جب یہ اطمینان ہو گیا کہ اُس کا چہرہ بالکل ہی تبدیل ہو گیا ہے اور کوئی بھی اُسے پہچان نہیں سکتا تو اس نے اپنا لباس تبدیل کرنا شروع کیا اور قدِ آدم آئینہ کے سامنے کھڑا ہو گیا ایک چالیس سال کا ادھیڑ آدمی معمولی کپڑوں میں ملبوس جیسے بازار میں سینکڑوں اور ہزاروں آدمی پہنے ہوئے نکلتے ہیں۔ کھڑا تھا اور ڈاکٹر راشد اور اس کے خوبصورت اور وجیہہ چہرے کی شباہت تک نہ تھی اس نے ایک بڑا اطمینان سانس لی اب اُس نے ایک بکس سے ایک چھوٹا قیمتی کیمرہ نکالا۔ کمرے میں بہت سے مختلف طاقتوں کے برقی لیمپ موجود تھے جنہیں وہ اپریشن کے وقت کام میں لایا کرتا۔ اُس نے بٹن دبا کر دن کر دیا۔ اور انہی برقی لیمپوں کی روشنی میں وہ تصویر لینے کو تیار ہو گیا۔ اُس نے اپنی ہی تصویر مختلف زاویوں سے کھینچی اور فوراً ہی سُرخ روشنی میں بیٹھ کر وہ اُن کو دھونے لگا۔ فلم کو خشک ہونے کے لئے لٹکا کر وہ آرام کرسی پر دراز ہو گیا اور اخبار پڑھنے لگا وہ بہت غور سے اشتہارات کو دیکھ رہا تھا۔ یکایک اس نے اپنی انگلی ایک خانہ پر رکھ دی جہاں مکان کرایہ کے لئے خالی ہے لکھا ہُوا تھا۔ اُس نے نوٹ بک نکال کر پتہ نوٹ کر لیا۔ پھر جیب سے ایک طلائی سگریٹ کیس نکالا اور ایک قیمتی سگریٹ نکال کر مُنہ میں لگایا مگر فوراً ہی سگریٹ منہ سے نکال کر رکھ دیا۔ کیونکہ یہ قیمتی سگریٹ اس کی اس معمولی شخصیت کے لئے بے موقع اور بے جا تھا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ آخری بار اپنے کو آئینہ میں دیکھا ایک لمبا اور معمولی قسم کا کوٹ پہن لیا۔ گردن میں ایک سوتی مفلر لپیٹ لیا۔ ٹوپی اُٹھائی اور مکان کے خفیہ راستے سے باہر نکل گیا۔

ہوا سرد تھی اور آسمان ابر آلود۔ وہ پیدل ہی سڑک کے کنارے کنارے چلا جا رہا تھا۔ ایک تمباکو والے کی دکان پر رُک کر اُس نے تھوڑا سا معمولی تمباکو اور ایک چھوٹا لکڑی کا پائپ خریدا۔ اگلے چوراہے پر وہ ٹرام میں سوار ہو گیا۔ پائپ سُلگا کر لمبے لمبے کش لئے اور مستقبل کے خیالات میں کھو گیا

بیس منٹ کے بعد وہ اُترا اور ایک گلی میں مُڑ گیا اب کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ سڑک پر برقی لالٹینیں روشن ہو چکی تھیں۔ اُس نے نوٹ بک نکال کر پتہ پڑھا اور مختلف گلیوں سے گذرتا ہُوا ایک بڑے مکان کے پاس آکر رُک گیا۔ دروازے پر ایک تختی لٹک رہی تھی جس پر لکھا ہُوا تھا "کمرے کرایہ کے لئے" اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک ضعیف عورت باہر نکلی "میں تمہارا اشتہار پڑھ کر آیا ہوں"۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا "بہت خوب اندر تشریف لائیے۔ آپکو کس قسم کا کمرہ درکار ہے۔ صرف سو رہنے کے لئے کوئی کمرہ چاہیئے یا آفس کے لئے یا......"

"نہیں نہیں۔ مجھے ایسا کمرہ چاہئے جس میں کوئی خفیہ راستہ ہو۔ کیا کوئی ایسا کمرہ ہے؟"

اُس عورت نے اثبات کے طور پر سر ہلایا اور اُسے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے اندر داخل ہو گئی مختلف کمروں سے گذرتے ہوئے دونوں

ایک بڑا دے میں پہنچے۔ یہاں پہونچکر وہ عورت رک گئی۔ یہ ہے وہ حصہ جناب! اُس نے ڈاکٹر راشد سے کہا۔ ایک سونے کا کمرہ ایک باورچی خانہ اور وہ اُدھر ایک غسلخانہ۔ ڈاکٹر راشد نے کمرہ کا جائزہ لیا۔ باورچی خانہ کو دیکھا اور غسلخانہ کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ اُس نے سامنے والی دیوار کا دروازہ کھولا اور دیکھا کہ وہ ایک مختصر سا احاطہ تھا جس میں خودرو پیڑ اور پھول اُگے ہوئے تھے۔ احاطہ میں ایک چھوٹا دروازہ تھا جو کہیں باہر کھلتا تھا۔ "ہاں مجھے ایسا ہی مکان درکار تھا" اس نے اُس عورت سے کہا "میں ایک کمپنی کا ایجنٹ ہوں مجھے شہر بشہر گھومنا پڑتا ہے اور تم جانتی ہوگی کہ ہم لوگوں کا کوئی پتہ نہیں ہوتا کہ کب اور کس وقت گھر واپس آئیں اس لئے میں نے ایسا حصہ پسند کیا ہے"۔

ہاں! ہاں۔ ٹھیک ہے۔ اس کا پہلا کرایہ دار بھی ایک صابن کا بیوپاری تھا۔ تو اس کا کرایہ بیس روپیہ ماہوار پیشگی ہوگا اور اگر آپ ناشتہ وغیرہ بھی مانگیں تو۔۔۔۔۔"

"نہیں، نہیں"۔ ڈاکٹر راشد نے بیس روپے کے نوٹ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا کہ میں خود نہیں جانتا کہ میں کب اور کس وقت واپس آؤں بس مجھے صرف کمرہ ہی چاہئے"۔ لیکن آپ کا اسم گرامی کیا ہے جناب؟ اس عورت نے نوٹوں کو جیب میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ میرا نام فیاض محمود ہے! ڈاکٹر نے سفید جھوٹ بولتے ہوئے جواب دیا۔

کچھ ہی دیر بعد اس فرضی نام کی رسید لیکر اور کنجی جیب میں ڈالتے ہوئے وہ خفیہ راستہ سے باہر چلا آیا۔ گھر واپس آکر پھر وہ اپنے کمرہ میں گیا اور مختلف دوائیوں کے ذریعہ اُس نے چہرے سے فیاض محمود کی شباہت کو بالکل مٹا ڈالا۔ سرخ نشان غائب ہوگیا۔ پھولی ہوئی ناک چھوٹی ہوگئی آنکھیں چوڑی ہوگئیں اور پیشانی کی شکنیں ظاہر ہوگئیں۔

دوسرے دن ڈاکٹر راشد نے اُن تصویروں کو صاف کیا۔ اور ہوشیاری سے میز کی دراز میں بند کر دیا۔ بازار سے اسنے کچھ کپڑے اور کچھ ضروری چیزیں خریدیں جو اُس کی فیاض محمود کی شخصیت کے لئے لازمی تھیں۔ وہ جب چاہتا ان تصویروں کی مدد سے فیاض محمود کا بھیس بدل لیتا اور جب چاہتا ڈاکٹر راشد بن جاتا۔

ایک ہفتہ بعد بیمہ کا ایجنٹ آیا تو ڈاکٹر راشد اس کے استقبال کے لئے بالکل تیار تھا۔ وہ اپنی تدبیریں مکمل کر چکا تھا۔ اب اُس نے اُسے ایک قدم اور بڑھانا چاہا۔ وہ دیر تک بیمہ کے ایجنٹ سے باتیں کرتا رہا۔ اور کافی بحث کے بعد اُس نے اپنی زندگی کا بیمہ دس ہزار پر کرالینا منظور کر لیا۔

دوسرے ہی ہفتہ ساری باتیں طے ہوگئیں۔ سب کچھ لکھ پڑھ لیا گیا اور ڈاکٹر راشد نے اپنی پالیسی کی پہلی قسط ادا کر دی اُس شخص کا نام جس کو یہ کل روپیہ ڈاکٹر راشد کے انتقال کے بعد ملے گا اس نے فیاض محمود لکھایا۔ اور پتہ اس مکان کا لکھایا جو کہ اُس نے فیاض محمود کے فرضی نام سے بھنڈی بازار میں کرایہ پر لیا تھا۔

ابھی تک اُس کی تدبیریں سہولت کے ساتھ کامیابی حاصل کرتی رہیں لیکن اس کا نہایت ہی خطرناک حصہ ابھی باقی تھا مگر وہ دیر آید درست آید کے مقولے پر عمل کرنے والا انسان تھا وہ جلد بازی سے کام لیکر تمام معاملات کو چوپٹ کرنا نہ چاہتا تھا وہ چاہتا تھا کہ اس کی یہ نئی شخصیت کافی مشہور اور مستحکم ہو جائے۔ تب وہ اس بارے میں دوسرا قدم اٹھائے وہ اب بھی بدستور قرض لے دیکر اپنا کام چلاتا رہا۔

فیاض محمود کی شخصیت اب رفتہ رفتہ اصلیت حاصل کر رہی تھی۔ قریب قریب ہر شب کو ڈاکٹر راشد فیاض محمود کے روپ میں بھنڈی بازار کے اس مکان پر جاتا۔ وہ ہر بار کسی نہ کسی طرح پڑوس والوں کو اپنی آمد و رفت سے واقف کر دیا کرتا کبھی وہ مکان کی مالکہ اس ضعیف عورت سے باتیں کرتا کبھی وہ سڑک کے کنارے والے ہوٹل میں چائے پینے بیٹھ جاتا۔ اور وہ لوگ جو اُس کے پیسوں سے اپنی پیاس بجھاتے اُسے نہایت ہی شریف تعلیمیافتہ نیک آدمی سمجھتے ایک ماہ بعد ڈاکٹر راشد نے یہ تہیہ کر لیا کہ اب وہ موقع آگیا ہے جس کا انتظار تھا اب اُسے اپنی سوچی ہوئی تدبیروں اور بنائے ہوئے راستوں پر جلد از جلد قدم بڑھانا چاہئے کیونکہ اب اُس کی سرخ والی شخصیت ضرورت سے زیادہ مشہور ہو چکی تھی۔

وہ کھانا اب ہوٹلوں میں کھانے لگا۔ گھر پر صرف رسماً دو ایک لقمے چکھ لیا کرتا۔ اور طبیعت ناساز ہونے کا بہانہ کر دیا کرتا کئی بار اُس کے نوکر نے کہا کہ "حضور پھر کیوں نہیں کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرتے یوں کچھ نہ کھانے سے بھی تو حضور کی صحت خراب ہو جائے گی"۔ راشد تو یہ چاہتا ہی تھا اُس نے اس

سے کہا کہ جاکر فوراً کسی اچھے ڈاکٹر کو بلا لائے۔

ڈاکٹر نے راشد سے اختلاج قلب اور درد سر کی شکایت بیان کی اور یہ بھی کہا کہ اُسے کام کی زیادتی کی وجہ سے کبھی کبھی آنکھوں کے سامنے سیاہ دھبے دکھائی دیتے ہیں۔ چونکہ خود ڈاکٹر راشد کا تیاس تھا ڈاکٹر نے اُسے ایک طویل آرام کا مشورہ دیا۔ اور کہا کہ اُس کی صحت کے لئے بہتر یہ ہوگا کہ وہ کم سے کم دو تین ہفتے بحری سفر میں گذارے کیونکہ اُس کی تمام شکایتیں کام کی زیادتی کی وجہ سے ہیں اور اُسے آرام کی سخت ضرورت ہے جب ڈاکٹر فیس سے جیب گرم کرکے چلا گیا تو ڈاکٹر راشد نے زور کا ایک قہقہہ لگایا اور اُٹھ کر کسی غیر معروف سے ہوٹل کی تلاش میں روانہ ہوگیا۔ اُس نے ڈاکٹر کے اس مشورہ کی خبر کو خوب جی کھول کر مشتہر کیا ایک ایک کرکے اپنے تمام دوستوں سے کہا کہ ڈاکٹر نے اسے بحری سفر کی رائے دی ہے اُن لوگوں نے بھی ہمدردی ظاہر کی اور بحری سفر کے فوائد بتا کر ڈاکٹر کی رائے پر صاد کیا۔

وہ سفر کی تیاریاں کرنے لگا آخر وہ دن آگیا جس روز شام کی گاڑی سے وہ سفر کے لئے روانہ ہونے والا تھا۔ اُس نے صرف دو بڑے بڑے سوٹ کیس اپنے ہمراہ لئے اور خانساماں سے یہ کہہ دیا کہ علالت کی وجہ سے وہ صرف مختصر سامان لیجانا چاہتا ہے۔ دیگر ضروریات کو وقت پر خرید کر پوری کر لیگا۔

شام کو اُس نے ایک ٹیکسی بلوائی۔ اور خانساماں کے ہمراہ وکٹوریہ ٹرمنس کو روانہ ہوگیا۔ خانساماں نے ایک فرسٹ کلاس کا ٹکٹ مہابلیشور کے لئے مع چند انگریزی رسالوں اور ناولوں کے اُس کے حوالے کر دیا۔ گاڑی نے سیٹی دی۔ خانساماں نے خدا حافظ کہا اور ڈاکٹر راشد اپنے فرضی سفر پر روانہ ہوگیا۔

ڈاکٹر راشد نے پورا ڈبہ ریزرو کرا لیا تھا اور اس وقت وہ ڈبہ میں بالکل تنہا تھا۔ گاڑی کی رفتار کافی تیز تھی وہ سگریٹ کے کش پر کش لگا تا تیزی سے گذرنے والے مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا شام ہو چکی تھی اور باہر درختوں پر گھر چھا رہی تھی۔ جب ڈبے میں روشنی ہوگئی اور باہر کافی اندھیرا ہوگیا۔ تو ڈاکٹر راشد نے سوٹ کیس اُتار کر ایک خفیف اور معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بڑے سوٹ کیس کو کھولا........ اگر اس وقت اُس کا خانساماں وہاں موجود ہوتا تو شاید وہ یہ دیکھ کر حواس باختہ ہو جاتا کہ وہ سوٹ کیس اینٹ پتھروں سے بھرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر راشد نے تمام پتھر نکال کر باہر پھینک دیئے اور اُس سوٹ کیس کو بنچ کے نیچے ڈال دیا اب اُس نے دوسرا سوٹ کیس کھولا۔ اس میں دو خانے تھے۔ ایک خانے میں تو کچھ پتھر قرینہ سے رکھے ہوئے تھے اور دوسرے خانہ میں ایک لمبا چمڑے کا تھیلا رکھا ہوا تھا۔ اُس نے اُن پتھروں کو بھی کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور تھیلہ کھولا۔ اس میں وہی نسر کا کوٹ اور مفلر تھا۔ اُس نے کوٹ پہن لیا اور مفلر لپیٹ لیا۔ اپنے قیمتی اور دوکوٹ کو اُس نے اُسی سوٹ کیس میں رکھ کر سوٹ کیس کو اوپر والی بنچ پر رکھدیا

پندرہ منٹ بعد وہ راستہ میں ایک چھوٹے اور غیر آباد اسٹیشن پر اُتر پڑا ٹکٹ جو اس نے پھاٹک پر دیا وہ اصلی اور درست تھا اور اُسی اسٹیشن کا تھا۔ اُس نے یہ ہوشیاری کی تھی کہ دوپہر ہی کو اُسی اسٹیشن کا ایک دوسرا ٹکٹ خرید لیا تھا کیونکہ بہت ممکن تھا کہ لوگوں کی نظروں میں مہابلیشور کے مسافر کا اپنی منزل سے اسقدر پہلے ہی اُتر جانا مشتبہ ہوتا وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بھی اُس کے بارے میں کسی قسم کا شک وشبہ کرے۔

کوٹ کا کالر اوپر اُٹھائے ہاتھ میں سوٹ کیس لئے وہ گاؤں سے گذرتا ہوا اُس سڑک پر پہونچ گیا جو شہر کو جاتی تھی۔ سڑک کے کنارے ہی ایک لوہار کی دکان تھی۔ یہاں سے اسنے ایک ہتھوڑا ایک پیچ کش اور ایک کدال خریدی اور پاس ہی کی دکان سے کچھ کھانے کا سامان بھی خریدا اور سب کچھ اُسی سوٹ کیس میں ٹھونس دیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ شہر کو جانے والی موٹر میں بیٹھ گیا شہر ابھی کافی فاصلہ پر تھا کہ وہ موٹر سے اُتر پڑا اور چند قدم چل کر ایک وکٹوریہ پر بیٹھ گیا اور جلد ہی بھنڈی بازار میں اُس مکان پر پہنچ گیا۔ جو اُس نے کرایہ پر لے رکھا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ دبے پاؤں اندر داخل ہوگیا اور سونے کے کمرے میں پہونچ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ کسی نے اُسے ڈاکٹر راشد کے روپ میں یہاں داخل ہوتے نہ دیکھا۔ کھونٹی پر ٹنگے ہوئے میلے پاجامہ کو پہن کر وہ پلنگ پر لیٹ گیا اور اپنے تمام کپڑوں کو اُسی سوٹ کیس میں رکھدیا۔ ہتھوڑا اور کدال پلنگ کے نیچے ڈال دی اور کھانے کی چیزوں کو باورچی خانہ کے طاق پر رکھ دیا۔

دوسرے دن ڈاکٹر راشد اپنی تدبیر کے سب سے خطرناک حصہ پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔ وہ صبح ہی بڑے آئینہ کے سامنے جا بیٹھا۔ فیاض محمود کی ایک بہت بڑی تصویر سامنے میز پر رکھی اور چمڑے کے تھیلے کو کھولا۔ اپریشن کے مختلف اوزار باہر نکالے اور نہایت ہی خطرناک کام

کے لئے مستعد ہوگیا یہی وہ آخری قدم تھا جس پر اس کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار تھا اس کو اب ہمیشہ کے لئے فیاض محمود بن جانا تھا۔ اب یہ وقتی تبدیلی نہ ہوگی۔ جو کہ ویسلین اور مختلف دوائیوں کے ذریعہ پھر تبدیل ہوسکتی بلکہ دم آخر تک قائم رہنے والی تبدیلی جو دن رات قائم رہتی اور اب اُسے وہ سُرخ نشان والا چہرہ اپنے ہمراہ قبر میں بھی لیجانا پڑے گا۔ ایک بار اگر چاقو اپنا کام کر چکتا تو پھر اصلی صورت کی واپسی کی کوئی صورت بھی پیدا نہ ہوسکتی تھی پھر کبھی بھی وہ ڈاکٹر راشد نہ بن سکتا بلکہ فیاض محمود ہی بن کر رہ جاتا۔ لیکن وہ پیشتر ہی ان تمام باتوں پر غور کر چکا تھا۔ اور اب بھی اُس کے چہرے پر استقلال اور اطمینان نمایاں تھا۔ اس کے ہاتھ جو ہزاروں اور لاکھوں اپریشن کر چکے تھے اب بھی نہایت مستعدی سے سب سے بڑا اور آخری اپریشن کرنے کو تیار تھے۔

کامل تین روز تک ڈاکٹر راشد اپنی صورت تبدیل کرتا رہا تیسرے روز اُس نے اطمینان کا سانس لے کر چاقو کو میز پر رکھ دیا۔ آئینہ میں ڈاکٹر راشد کے بجائے فیاض محمود کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ہاں چاقو کے زخم ابھی ہرے تھے اس کے علاوہ مشابہت میں اور کوئی فرق نہ تھا۔ ایک ہفتہ کے بعد تمام زخموں کے نشان بھی غائب ہوگئے سوائے اس بڑے سُرخ نشان کے جو دائیں جانب کنپٹی کے پاس تھا اس کا بھیس اب بالکل مکمل تھا۔ رات کو اُسے باہر کے احاطہ میں ایک بڑا گڑھا کھودا۔ اور اس سوٹ کیس میں اپنے تمام قیمتی کپڑوں کو مع اپریشن کے اوزار کے رکھ کر گڑھے میں دفن کر دیا۔ اب اُس کی اصلی شخصیت کی آخری نشانی بھی مٹ چکی تھی۔

ڈاکٹر راشد ہر شام کو اس پُل کے پاس ٹہلنے کو جاتا جو اُس کی جائے قیام کے قریب ہی تھا وہ ہر آنے جانے والے کو غور سے دیکھتا۔ وہاں کئی بنچیں پڑی تھیں جس پر قرب و جوار کے لوگ شام کو آکر دریا کی ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہوتے۔ ایک شام کو وہ ایک بنچ کے قریب پہنچکر یکایک رُک گیا۔ ایک شخص جس کے پھٹے ہوئے کپڑے اس کے افلاس اور مفلوک الحالی کا ثبوت دے رہے تھے عجیب یاس کے عالم میں اس بنچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر راشد نے ایک لمحہ اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اسے اپنے سے اس قدر مشابہہ دیکھ کر اُسے تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی۔ وہ جیب سے معمولی سگریٹ نکال کر سلگاتا ہوا اُسی بنچ پر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک سگریٹ اُس اجنبی کو دیا جس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے نہایت تیزی سے اپنی بھوکی انتڑیوں میں کش پر کش کھینچنا شروع کر دیا جس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ مدتوں سے اس کی تمباکو سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ڈاکٹر راشد نے سلسلۂ کلام یوں شروع کیا۔

"میرا خیال ہے کہ تم بیکاری کا شکار ہو؟"

اجنبی نے سر ہلایا اور منہ سے دھوئیں کا بادل نکالتے ہوئے کہا۔

"ہاں جناب۔ میں چھ ماہ سے بیکار ہوں" "لیکن تمہارا پیشہ کیا ہے؟" ڈاکٹر نے سگریٹ کا لمبا کش لیتے ہوئے پوچھا۔

"ایک معمولی کلرک! لیکن آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" اُس نے اُمید بھرے لہجہ میں پوچھا۔

"حساب کتاب سے بھی واقف ہو؟"

"جی ہاں۔ بخوبی" اُس نے بیتابانہ جواب دیا "کیا آپ مجھے کوئی ملازمت دے سکتے ہیں کیا...... ."

"کیا تم شادی شدہ ہو؟" ڈاکٹر نے رعب دار آواز میں پوچھا

"نہیں جناب۔ میرا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے"!

یہ سنکر ڈاکٹر راشد کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی "میں ایک ڈاکٹر ہوں اور مجھے ایک کلرک کی ضرورت ہے جو حساب کتاب کی دیکھ بھال کے علاوہ خط و کتابت بھی کر سکے" اجنبی نے اُسے عاجزانہ اس بات کا یقین دلایا کہ مجھے اس میں کافی مہارت ہے اور اگر آپ نے مجھے ملازم رکھ لیا۔ تو آپ کو بہت ہی ثواب ہوگا اسکا کام نہایت ہی مستعدی اور دیانتداری سے انجام دونگا۔ اور فوراً ہی کام شروع کرنے کو حاضر ہوں۔

"تمہارا نام؟" ڈاکٹر نے بنچ سے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

"میرا نام خواجہ اقبال ہے"؟

"اچھا تو تمہیں تیس روپے ماہوار ملیں گے لیکن تمہیں چوبیس گھنٹے میرے ہی مکان پر رہنا ہوگا"

"بہت ہی بہتر جناب۔ بھلا میں اس مہربانی کا شکریہ کس طرح ادا کروں۔ میرے تو ایک ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا بھی نہیں ہے۔ پچھلے دو ہفتے تو میں نے دو کانوں کے تختوں پر سو کر گذارے ہیں"۔

ڈاکٹر راشد اُسے لیکر ایک معمولی ہوٹل میں گیا اور اجنبی کو خوب پیٹ بھر کر کھانا کھلایا۔ کافی رات گذر چکی تھی جب وہ دونوں ٹرام میں بیٹھ کر

دادر پہونچے چند قدم پر ڈاکٹر راشد کا بنگلہ تھا۔ وہ اسے سے لئے ہوئے صدر دروازہ کی راہ سے اندر داخل ہُوا۔ بہت ممکن تھا کہ وہ شک کرتا کہ وہ خفیہ راستہ سے کیوں اندر جا رہا ہے۔

"یہ تمہارے سونے کا کمرہ ہے۔ ہاں یہ کمرہ بہت دنوں سے خالی پڑا ہے گرد و غبار صاف کر ڈالو اور یہ کپڑے پہن لو۔ کل ہی بازار سے میں تمہیں دوسرے کپڑے دلوا دوں گا۔ خواجہ اقبال نے شکریہ ادا کیا اور اُسے خدا حافظ کہہ کر کپڑے بدلنے لگا۔

ڈاکٹر راشد اپنے آفس کے کمرے میں داخل ہُوا۔ میز کی دراز سے وہی قیمتی سگریٹ کیس نکالا۔ اس میں تازہ سگریٹ رکھے اور جیب میں ڈال لیا پھر آرام کرسی پر دراز ہو کر اُس نے یکے بعد دیگرے دو سگریٹ پیئے۔ اور ان کے بچے ہوئے ٹکڑوں کو احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔ گھڑی دیکھی اور یہ اندازہ کر کے کہ اب تک خواجہ اقبال کپڑے تبدیل کر کے سو تے چلا گیا ہوگا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور ہاتھوں کو اوور کوٹ میں ڈالے اس کمرے کی جانب چلا جس میں خواجہ اقبال تھا۔ اسے کمرے میں دیکھ کر اقبال فوراً ہی تعظیماً کھڑا ہو گیا اور اس کی آمد کی وجہ پوچھی۔ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا میں تمہیں یہ بتلانا بھول گیا تھا کہ صبح کو منہ ہاتھ دھونے کا سامان اور تیل وغیرہ تم کو اس الماری کے نیچے والے خانہ میں ملیگا۔ جونہی خواجہ اقبال نے اس طرف دیکھنے کی کے لئے گردن پھیری۔ ڈاکٹر راشد نے نہایت پھرتی سے اپنے اوور کوٹ سے ہتھوڑا نکالا اور وحشیانہ طاقت سے اور انجام سے بیخبر خواجہ اقبال کے سر پر دے مارا۔ بیچارہ بالکل ہی غافل تھا۔ دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔ ابھی وہ تڑپ ہی رہا تھا۔ کہ ڈاکٹر راشد نے یکے بعد دیگرے چار ضربیں اس کے چہرے اور سر پر لگائیں۔ یہی نہیں بلکہ ہتھوڑے کو رکھ کر اب وہ پاگلوں اور وحشیوں کی طرح گھونسوں سے اُس کے زخمی اور خون بھرے چہرے کی بُری گت بنانے لگا۔ چند ہی سیکنڈ میں خواجہ اقبال کا چہرہ محض ایک گوشت کا لوتھڑا ہو کر رہ گیا۔ ڈاکٹر راشد نے اس کی لاش کو کھینچ کر ایک کونے میں ڈالدیا اور ہتھوڑے کا ہینڈل خوب صاف کر کے فرش پر پھیلے ہوئے خون میں پھینک دیا۔ قریب ہی پڑی ہوئی چھوٹی میز پر اُس نے وہ سگریٹ کیس جیب سے نکال کر رکھ دیا اور بچے ہوئے ٹکڑوں کو خاکدان میں ڈالدیا۔ اور اسی میز پر ایک چھوٹا برقی لیمپ اور ایک کھلی ہوئی کتاب بھی رکھ دی۔ اس کے بعد وہ اُس پلنگ کی جانب متوجہ ہُوا۔ چادر میں شکنیں ڈالیں۔ کمبل کو نیچے بے ترتیبی کی حالت میں پھینک دیا اور تکیوں کو ہو پر تلے گرا دیا۔ میز سے کچھ پرانے استعمال شدہ کپڑے نکال کر کچھ تو اُس نے اس کمرے کی کھونٹی پر لٹکا دئے۔ اور کچھ کرسیوں پر ڈالدیئے۔ خواجہ اقبال کے اُتارے ہوئے کپڑے اور پیچ کش ہاتھ میں لے لیا۔ پیچ کش سے کئی صندوق کھول کر اُس نے کپڑے نکالے اور بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر پھیلا دیئے۔ اور تمام سامان جو کہ مختلف کمروں میں بند تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر پھینک دیا۔ ان کمروں کو دیکھ کر یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کسی نے جلدی جلدی ان کمروں کی تلاشی لی ہے ایک لمحہ وہ خاموش کھڑا اس ہنگامہ کے سین کو دیکھتا رہا۔ جو کہ خود اُس نے مچا رکھا تھا۔ پھر اُس نے خواجہ اقبال کے کپڑوں کو اخبار میں لپیٹا اور خفیہ راستہ کی جانب چلا۔ اس کا کام بخیر و خوبی انجام پا چکا تھا۔ اسنے خفیہ راستہ کے دروازہ کو کنجی سے کھولا لیکن باہر آکر پیچ کش سے اس تالا کو توڑ ڈالا۔ پیچ کش کو جیب میں رکھ کر اور ٹوپی کو آنکھوں پر کھسکا کر وہ سڑک پر روانہ ہو گیا۔ ابھی مشکل سے وہ سو قدم گیا ہوگا۔ کہ ایک ٹیکسی آکر اُس کے قریب رُکی۔ ڈرائیور نے اس سے پوچھا کہ کیا اُسے کہیں جانا ہے لیکن اُس نے یہ کہہ کر کہ نہیں مجھے پاس ہی جانا ہے اُسے رخصت کر دیا جب وہ پیدل چل کر بھنڈی بازار اپنے اُس مکان پر پہنچا تو تھک کر چور ہو گیا تھا چولھا گرم کر کے قہوہ بنایا اور خوب جی بھر کر پیا۔ پھر احاطہ میں گڑھا کھود کر خواجہ اقبال کے کپڑے، پیچ کش اور کدال دفن کر دیا اور مٹی ڈال کر گڑھا برابر کر دیا۔ پھر آکر پلنگ پر دراز ہو گیا اور چونکہ وہ کافی تھکا ہُوا تھا فوراً ہی خرّاٹے لینے لگا۔ جب وہ صبح بیدا ہُوا تو کافی دھوپ نکل آئی تھی۔ ناشتہ کیا اور پائپ سلگا کر آرام کرسی پر گذشتہ رات کے واقعات پر تبصرہ کرنے کے لئے دراز ہو گیا۔ اس کی تدبیر تقریباً کامیاب ہو گئی تھی۔ ابھی تک اس نے کوئی بھی غلطی نہ کی اور ناکامی کی کوئی بھی اُمید نہ تھی۔ اس سوچا کہ پولیس بھی تحقیق و تفتیش کے بعد اُسی نتیجہ پر پہنچے گی جو کہ خود اس نے سوچ رکھا ہے اور جس راہ پر وہ خود پولیس کو لگا آیا ہے کسی پہرے والے پولیس مین کی نظر ٹوٹے ہوئے تالہ پر ضرور پڑے گی اور اُسے قتل کی واردات ضرور معلوم ہو گئی ہوگی۔ یکایک اُسے خواجہ اقبال کا خیال آیا۔ تقدیر اُس کی مددگار تھی۔ کہ اُس نے خواجہ اقبال ایسا آدمی اُس کے

پاس بھیج دیا۔ ایسا آدمی جس کی اُسے سخت ضرورت تھی اور تلاش تھی۔ وہ بالکل ہی اُس سے مشابہ تھا اور اس کے جسم کی ساخت بھی ڈاکٹر راشد کے سے بہت ملتی جلتی تھی وہ مسکراتے ہوئے ان واقعات کا تصور کرنے لگا جو کہ مستقبل قریب میں ظہور پذیر ہونے والے تھے۔ پولیس یقیناً لاش کو ڈاکٹر راشد کی لاش سمجھے گی۔ اور اُس کے دوست احباب بھی یہی شناخت کریں گے۔ اس کا ثبوت وہ سگریٹ کیس اور وہ بجھے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑے دیں گے کھلی ہوئی کتاب اور استعمال شدہ کپڑے یہ ظاہر کریں گے کہ ڈاکٹر راشد سفر سے واپس آیا ہے۔ خفیہ راستہ کا ٹوٹا ہوا تالا یہ بتلائے گا کہ کوئی چور مکان مذکور کو غیر آباد اور بند سمجھ کر اندر داخل ہوا۔ خلاف اُمید کان میں ڈاکٹر راشد کو موجود پاکر وہ گھبرا گیا ہو گا۔ اور ہتھوڑے سے اُس پر حملہ کر دیا ہو گا اور جلدی جلدی گھر کی تلاشی لیکر پھر غائب ہو گیا ہو گا......"

ڈاکٹر راشد کو اپنی اس نمایاں کامیابی پر کچھ غرور سا ہونے لگا۔ ویسا ہی غرور جو کہ اُسے ایک خطرناک مگر کامیاب اپریشن کرنے کے بعد ہوا کرتا تھا وہ اپنے زود دماغ کی خود تعریفیں کر رہا تھا۔ اس کے خیالات کا سلسلہ جاری تھا پولیس کو مکان کی تلاشی لینے پر بیمہ کی پالیسی ضرور ملے گی۔ تحقیقات کی جائے گی۔ اور فیاض محمود تمام جائیداد اور روپوں کا مالک قرار دیا جائیگا وہ اپنے عزیز ڈاکٹر راشد کی موت پر اظہار افسوس کریگا اور اُس کی بے موقع موت پر مکر و فریب کے آنسو بھی بہائے گا......" پھر اُسے بیمہ والی پالیسی کا خیال آیا۔ اُسے فیاض محمود کے نام سے دس ہزار روپے بھی مل جائیں گے۔ امریکہ ہر حال سے بہتر اور محفوظ جگہ ہوگی وہ کوئی تجارت کر کے یہاں نئی زندگی شروع کریگا جہاں اُسے نہ قرضدار ستانے آئیں گے اور نہ کسی قسم کی کوئی تکلیف ہوگی وہ عیش.......

کسی نے دروازہ پر دستک دی وہ چونک پڑا۔ اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا وہ امریکہ کے پُرفضا بنگلوں سے فوراً ہی اپنے کمرے کی چار دیواری میں واپس آگیا "شاید وہ بوڑھی عورت ہوگی" اس نے اپنے دل میں سوچا "لیکن اس وقت کیا چاہتی ہے" اس نے بڑھ کر دروازہ کھولدیا وہ تعجب اور حیرت سے ایک گز پیچھے ہٹ گیا۔ چھ کانسٹبل اس کے کمرے میں گھس آئے۔ اور اُسے گرفتار کر لیا۔

دس روز بعد ڈاکٹر راشد فیاض محمود کے روپ میں بھری عدالت کے کٹہرے میں کھڑا تھا اس کا دماغ مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا وہ خاموش کھڑا ان شہادتوں کو سن رہا تھا جو اس کے خلاف موجود تھیں۔ دو گواہوں نے اُسے اس رات خواجہ اقبال کے ساتھ اس بنگلہ میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے آدھی رات کو اُسے سڑک پر تنہا گذرتے ہوئے اور بھنڈی بازار کے تمام رات کھلے رہنے والے ہوٹل سے دو آدمیوں نے اپنے کرایہ کے مکان میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ شہادتیں کافی اور معقول تھیں۔ اور رہائی کی کوئی بھی گنجائش نہ تھی اور لطف یہ کہ خواجہ اقبال کی لاش کو ہر شخص نے شناخت کیا کہ وہ مشہور ڈاکٹر راشد کی لاش تھی۔

یکایک ڈاکٹر راشد کے دل میں یہ خیال آیا کہ وہ اپنی شخصیت کو ظاہر کردے اور تمام واقعہ بیان کر کے یہ ظاہر کردے کہ خود وہی ڈاکٹر راشد ہے۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ لوگ اُسے بیوقوف اور دیوانہ سمجھیں گے اور کوئی بھی یقین نہ کریگا۔ اور اگر لوگوں نے یقین بھی کر لیا تو وہ خواجہ اقبال کے قاتل ہونے سے خود کو کس طرح بچا سکے گا وہ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ جج نے اُسے ڈاکٹر راشد کے قتل کے جرم میں سزائے موت کا حکم سنا دیا۔

یہ حکم سنا تھا کہ وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا "بھئی خوب کیا قانون کی ستم ظریفی ہے اُسے پھانسی کی سزا دی جارہی ہے اور کیوں؟ ڈاکٹر راشد کو قتل کرنے کے جرم میں۔ اہا۔ ہا کتنا مضحکہ خیز جرم تھا اور ایسا ہی فیصلہ" اور بھی زور سے ہنسنے لگا۔

ایک ہفتہ بعد مخبوط الحواس اور نیم مجنوں ڈاکٹر راشد خود اپنے کو قتل کرنے کے جرم میں پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

از جناب راغب صاحب ہاشمی برہانپوری

ہماری زندگانی اک سرابِ زندگانی ہے
نہ موجیں ہیں۔ نہ دریا ہے۔ نہ طوفاں ہے۔ نہ پانی ہے

پیامِ اس قاتلِ عالم کا خنجر کی زبانی ہے
شہادت کا یہ مژدہ ہے کہ مرگِ ناگہانی ہے

ادائیں مست ہیں اُس مست کی، مدہوش ہیں غمزے
خمار آلودہ آنکھیں ہیں تو متوالی جوانی ہے

شباب آتے ہی آپے سے ہوئے باہر بڑھی وحشت
خدا معلوم یہ دیوانگی ہے یا جوانی ہے

وہ آئے جانبِ مرقد تو آواز آئی مرقد سے
یہی مرقد تمہارے کُشتۂ غم کی نشانی ہے

بہار آئی۔ بنا میخانہ گلشن، باغباں ساقی
ہے جاری دورِ جامِ گُل شرابِ ارغوانی ہے

کوئی رشکِ قمر ہے جلوہ آرا بزمِ عالم میں
اِسی باعث فلک نے چادرِ مہتاب تانی ہے

یہ کس کے حُسن کی تصویر کھینچ کر سامنے آئی
اِدھر بہزاد کو حیرت اُدھر سکتے میں مانی ہے

جواں ہو کر شبابِ حُسن پر اِترا رہے ہیں وہ
خبر اُن کو نہیں کیا یہ شبابِ حُسن فانی ہے

ہمارا نقدِ دل لیکر بھی ہے یہ بے رُخی کیسی
محبّت میں بھی کیا جنسِ مُروّت کی گرانی ہے

اِدھر اُس نے نقاب اُلٹی کہ ذرّے بن گئے تارے
عجب اُس پیکرِ حُسن و ادا کی ضُوفشانی ہے

مرے کاشانۂ دل میں ترا رونق فزا ہونا
نشاطِ روح کا باعث ہے وجہِ شادمانی ہے

قدم تو رکھ دیا ہے عرصہ گاہِ عشق میں راغب
مگر جو معرکہ اِس عشق کا ہے امتحانی ہے

ابراہیم بن مہدی اور مامون الرشید

خلفائے بنی عباس کے بےنظیر اخلاق کی ایک حیرت انگیز مثال

جناب طالوت کے قلم سے

خلفائے بنی عباس میں سے مامون الرشید کا مرتبہ علمی حیثیت سے سب سے زیادہ بلند ہے اور علم و ملوکیت کے تضاد کی عجیب ترین مثال یہ ہے کہ ابتدائے خلافت میں پہلے امین ان کا مقابل ہوا اور اس کے بعد ان کا چچا ابراہیم بن مہدی۔ مامون کے ہاتھ پر جب بیعت ہوگئی تو ابراہیم رے کی طرف بھاگ گیا اور خود مدعی خلافت بنا۔ تقریباً دو سال تک مامون نے اس سے اس توقع پر درگذر کیا کہ وہ عوام میں اپنی غیر ہردلعزیزی کی وجہ سے اپنے آپ کو نامقبول دیکھ کر خود ہی معافی کی خاطر آستان خلافت کی طرف رجوع کریگا۔ مگر باوجود قلتِ جمعیت اور بے سر و سامانی کے ابراہیم واپس نہ ہوا۔ تا مامون کو خوف لاحق ہوا کہ کہیں وہ اپنی جمعیت بڑھا کر کسی فتنہ ہی کا باعث نہ بن جائے اس لئے اس کے قلع قمع کرنے کی خاطر موکب شاہی کو ایک جرار فوج سمیت اس نے کوچ کا حکم دیا اور رے کی جانب روانہ ہوگیا۔ مگر ابراہیم کے پاس خودسری کے سرمائے اور بے سر و سامانی کے سامان کے علاوہ تھا ہی کیا اور کس بل بوتے پر وہ مقابلے پر اُترتا۔ وہ اپنی جان بچا کر بغداد کی طرف چلا گیا اور مختلف مقامات پر چھپتا پھرا۔ مامون نے اس کی گرفتاری کے لئے ایک لاکھ دینار کی رقم خطیر انعام کے لئے مقرر فرمائی۔ جب ابراہیم کو اس بات کا علم ہوا تو اسے کسی ایک جگہ چھپے رہنا مناسب نہ معلوم ہوا۔ اُن کا بیان ہے کہ "ایک دن میں اپنی جان کے خوف سے بیحد پریشان ہو کر جگہ تبدیل کرنے کیلئے نکلا تو ایک بندگلی میں گھس گیا۔ اب وہاں سے واپسی بھی ناممکن تھی اتفاقاً کوچے میں ایک نائی سامنے آگیا۔ میں نے اس سے کہا کیا تم مجھے تھوڑی دیر کے لئے اپنے پاس چھپا سکتے ہو"۔ اس نے نہایت خندہ پیشانی سے دروازہ کھول دیا۔ اور مجھے نہایت عزت و احترام سے بٹھایا اور خود باہر چلا گیا۔ اس کے باہر چلے جانے سے مجھے شک ہوا۔ کہ کہیں اس نے پہچان ہی نہ لیا ہو اور پولیس کو بلانے ہی نہ چلا گیا ہو۔ میں وہاں سے بھاگ جانے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ وہ بازار سے عمدہ کھانا اور فواکہ لے کر واپس آگیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور بھوک کی وجہ سے نہایت رغبت سے کھانا کھایا فراغت کے بعد حجام نے نہایت مودبانہ طریقہ پر کہا: جناب اگرچہ یہ میرے مرتبہ سے بہت بلند بات ہے کہ میں آپ سے گانے کی درخواست کروں لیکن اگر حضور خود اپنے غلام کو مشرف فرمائیں تو یہ آپ کی عالی ظرفی ہے میں ابھی تک سمجھے ہوئے تھا کہ نائی مجھے نہیں پہچانتا۔ میں نے کہا تمہیں کیونکر معلوم ہوا کہ میں گا بھی سکتا ہوں۔ نائی نے جواب دیا سبحان اللہ کیا آپ ابراہیم بن مہدی نہیں جن کی گرفتاری کے لئے مامون نے ایک لاکھ دینار مقرر کیا ہے۔ ابراہیم کہتے ہیں میرے دل میں نائی کی [illegible] بڑھ گئی کہ باوجود پہچاننے کے اس نے میرے ساتھ حسن سلوک روا رکھا اور حرص و آز اس پر غالب نہ آسکے میں نے اس کی خواہش کو ٹھکرانا مناسب نہ سمجھا اور اپنے اہل و عیال کے فراق میں یہ شعر گائے ؎

وعسی الذی اهدی لیوسف اهله !
واعزه فی السجن وهو اسیر
یجیب لنا ویجمع شملنا
والله رب العلمین قدیر

(ترجمہ) امید ہے کہ وہ ذات جس نے قید خانے میں یوسف علیہ السلام
کو عزت بخشی اور پھر ان کو اہل وعیال سے ملایا تھا ہماری دعا کو بھی قبول کریگی۔
ہمیں بھی آپس میں ملائیگی۔ وہ قادر و پروردگار عالم ہے۔

اس کے بعد نائی نے عرض کی اگر اجازت ہو تو میں بھی کچھ عرض
کروں۔ میں نے کہا ضرور۔ نائی نے گانا شروع کیا ؎

شکونا الی احبابنا طول لیلنا
فقالوا لنا ما اقصر اللیل عندنا

ہم نے احباب سے شب ہجراں کی درازی کا شکوہ کیا۔ تو انھوں نے
کہا ہمارے یہاں تو رات بہت ہی چھوٹی ہوتی ہے۔

وذالک لان النوم یغشی عیوننا
سریعا ولا یغشی همیما القلبنا

یہ اس لئے کہ نیند آنکھوں کو تو بند کر سکتی ہے مگر دل کے سوز و
بیت کو بند نہیں کر سکتی۔

اذا ما دنی اللیل المضر بذی الهوی
جزعنا وهم یستبشرون اذا دنا

جب تکلیف دہ رات میرے جیسے عاشق کے پاس آتی ہے تو
ہم غمگین ہو جاتے ہیں اور جب "اُن" کے پاس جاتی ہے تو وہ خوش
ہوتے ہیں۔

فلو انهم کانوا یلاقون مثل ما
نلاقی لکانوا فی المضاجع مثلنا

اور اگر انہیں بھی وہ غم لاحق ہوتا جو ہمیں لاحق ہے تو ان کی رات
بھی بستر پر کروٹیں بدلتے ہی گذرتی۔

ابراہیم فرماتے ہیں کہ میں اس کا گانا سن کر لوٹ لوٹ گیا اور
ایک دفعہ تو میرے دل پر سے بار غم ——— اُٹھ گیا۔ نیچے کچھ دینار ایک
تھیلی میں میرے پاس موجود تھے۔ وہ تھیلی کی تھیلی میں نے اس نائی کی
طرف پھینک دی اور روانہ ہونے کے لئے تیار ہو گیا۔ اُس نے نہایت
ادب سے کہا اگرچہ میں اپنے استحقاق سے بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہا ہوں
مگر ان کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں اس ہم نشینی
کی قیمت لونگا جس کا شرف آپ نے مجھے بغیر کسی استحقاق کے عطا فرمایا؟
تھیلی مجھے واپس کردی اور نہایت ہی یقین آمیز لہجے میں کہا۔ اگر آپ نے
دوبارہ مجھے انعام لینے پر مجبور کیا تو میں خودکشی کرلوں گا۔

ابراہیم کے لئے اب سوائے خاموشی کے کوئی صورت ہی نہیں تھی
وہ چپ چاپ تھیلی اٹھا کر چل دیئے ابھی وہ دروازے تک ہی گئے تھے
کہ نائی نے کہا "جناب میرے خیال میں اس سے بہتر چھپنے کی جگہ آپ کو
نہیں مل سکیگی۔ اگر آپ کچھ اور قیام فرماتے تو بہتر تھا" ابراہیم نے جواب
دیا اگر تم تھیلی میں سے خرچ کرتے رہو تو اس شرط پر میں ٹھہر جاؤنگا
اس نے اس پر آمادگی کا اظہار کیا اور ابراہیم تین چار دن اس کے یہاں
مقیم رہا مگر اس بھلے آدمی نے تھیلی میں سے ایک حبہ بھی خرچ نہ کیا۔ پھر
ابراہیم نے اس کے ذریعہ عورتوں کا لباس مہیا کیا اور برقعہ پہن کر
وہاں سے نکل بھاگنے کا تہیہ کرلیا۔

نائی نے نہایت دردمندی سے انہیں رخصت کیا۔ یہ کوچہ
و بازار سے تو سلامت نکل آئے اور کسی کو شک نہ ہوا مگر جب دجلہ کے
پل کو عبور کرنے لگے تو وہاں کے پہرہ دار کو ان کی چال ڈھال سے شک ہو گیا
اس نے انعام کے لالچ میں انہیں گرفتار کرنا چاہا۔ انھوں نے اسے دھکا
دیکر نیچے گرا دیا۔ اور خود بھاگ کھڑے ہوئے۔ پل کو عبور کرتے ہوئے
ایک گلی میں داخل ہوئے اور چھپ جانے کے لئے ادھر ادھر ملجا
و ماویٰ تلاش کرنے لگے۔ سامنے ایک مکان کا دروازہ کھلا تھا اور ایک
عورت دہلیز میں کھڑی تھی۔ انھوں نے اس سے خائفانہ التجا کی اور
اس نے نہایت بشاشت سے کہا۔ اہلاً وسہلاً اندر آجایئے۔ بالاخانے
پر اس نے نہایت تکلف سے بستر بچھا کر انہیں بٹھایا۔ اور کھانا پیش کیا اور
انہیں تسلی دی کہ آپ کسی قسم کے خطرے کو دل میں جگہ نہ دیں اور یوں
سمجھیں کہ آپ اپنے گھر میں تشریف لائے ہیں۔

ابھی وہ یہ کلمات کہہ رہی تھی کہ دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ وہ گئی
دروازہ کھولا اور ایک شخص کو اندر لائی جس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی

تھی اور کپڑے خون آلود تھے۔ ابراہیم کہتے ہیں میں نے اُوپر سے چھپ کر غور سے دیکھا تو وہ وہی سپاہی تھا جس کو میں ابھی ابھی پل سے نیچے گرا آیا تھا۔ میں بہت ہی پریشان ہوا کہ قدرت نے مجھے پناہ بھی دی تو دشمن ہی کے گھر میں اور انجام کا انتظار کرنے لگا۔

عورت نے اس کا زخم دھویا پٹی باندھی۔ کپڑے تبدیل کئے اور اسے سُلا دیا۔ پھر اوپر آئی اور مجھ سے کہا۔ شاید آپ ہی میرے شوہر کی مصیبت کا باعث ہوئے ہیں؟ پھر نہایت خوش اخلاقی اور لطف آمیز طرز سے کہا آپ کسی قسم کے خوف کو دل میں جگہ نہ دیں۔ میں آپ کو امان دے چکی ہوں اور حتی الامکان میں اپنے عہد کو نبھانے کی کوشش کرونگی۔ ابراہیم تین دن تک اس کے یہاں مقیم رہے۔ اس کے بعد عورت نے کہا میرا شوہر اب اچھا ہوگیا ہے اور چلنے پھرنے لگ گیا۔ ممکن ہے وہ کسی دن اُوپر آکر آپ کو دیکھ لے اور آپ مصیبت میں گرفتار ہو جائیں اس لئے اگر آپ اپنے کو بچا سکتے ہوں تو بچائیں۔

ابراہیم عورتوں کا لباس پہن کر رات کو اُس کے یہاں سے نکل کھڑے ہوئے اور اپنی ایک لونڈی کے گھر پہنچے جس کی وفاداری پر اُنھیں اعتبار تھا۔ اور خیال تھا کہ وہاں امن و سلامتی سے کچھ دن گذار جاسکیں گے۔ لونڈی دیکھتے ہی فرط محبت سے رونے لگی اور ابراہیم کی سلامتی پر ہزار ہزار شکر ادا کرنے لگی۔ پھر ضیافت کے اہتمام میں مصروف ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد کچھ چیزیں بازار سے خریدنے کے بہانے نکلی اور مامون کے فوجیوں کو ساتھ لے کر واپس آئی اور ابراہیم کو اسی زنانہ لباس میں گرفتار کرا دیا۔

ابراہیم کہتے ہیں مامون نے ایک دربار عام کیا اور مجھے اپنے سامنے طلب کیا۔ میں نے جاکر السلام علیک یا امیر المومنین کہا۔ تو مامون نے فرمایا لاسلمک اللہ ولا حیاک۔ میں نے عرض کی امیر المومنین! آپ جلدی نہ فرمائیں۔ خدا نے اب میرا معاملہ آپ کے سپرد کر دیا ہے۔ اگر آپ عفو فرمائیں تو اقرب الی التقویٰ ہے اور اگر گرفت کریں تو یہ آپ کا حق ہے۔ اس کے بعد میں نے یہ شعر پڑھے ؎

ذنبی الیک عظیم — وانت اعظم منہ

میرا گناہ یقیناً بہت بڑا ہے۔ مگر آپ کا کرم اس سے بھی بڑا ہے۔

فخذ بحقک اولا — واصفح بحلمک عنہ

آپ اپنا حق لے لیں اور یا چشم پوشی فرماکر حلم سے کام فرمائیں

ان لم اکن فی فعال — من الکرام فکنہ

اگر میں نے اپنے آپ کو کریم الفعال ثابت نہیں کیا۔ تو آپ تو کریم الفعال ضرور ثابت ہوں۔

مامون سر نیچا کئے میری باتیں سنتا رہا۔ جب اس نے سر اٹھایا تو میں نے یہ شعر پڑھے ؎

اتیت ذنبا عظیما — وانت للعفو اھل

میں نے بہت بڑا گناہ کیا اور آپ اہل عفو ہیں۔

فان عفوت فمن — وان جزیت فعدل

اگر معاف فرمادیں تو یہ احسان ہے اور اگر آپ بدلہ لیں تو انصاف ہوگا۔

یہ شعر سن کر مامون نے پھر سر جھکا لیا اور آہستہ آہستہ یہ شعر پڑھے ؎

وکنت اذا الصدیق اراد غیظی

واشرقنی علی حنق بریقی

جب دوست مجھے انتہائی غصہ دلاتا ہے۔

غفرت ذنوبہ وعفوت عنہ

مخافۃ ان اعیش بلا صدیق

تو میں اس خوف سے اُسے معاف کر دیتا ہوں کہ کہیں بغیر دوست کے نہ ہو جاؤں۔

پھر مامون نے اپنے چچازاد بھائی ابو اسحٰق اور دوسرے لوگوں سے مشورہ لیا۔ سب نے بیک زبان قتل کا اشارہ کیا۔ سب سے آخر میں احمد بن خالد سے پوچھا تمھاری کیا رائے ہے؟ اس نے کہا اگر امیر المومنین اسے قتل کر دیں تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ آپ ایسے آدمی اس طرح کے لوگوں کو ہمیشہ سے قتل ہی کرتے آئے ہیں اور اگر آپ معاف فرمادیں تو البتہ اس کی نظیر زمانہ سلف میں مشکل سے ملیگی جب مامون نے ابن خالد کا یہ مشورہ سنا تو باقی لوگوں کی طرف مُنہ کرکے یہ شعر پڑھے ؎

سامح اخاک اذا خلط — منہ الاصابۃ بالغلط

اگر غلطی سے تمھارا بھائی کوئی تجاوز کر بیٹھے تو اسے معاف کر دو۔

واحفظ صنیعک عند کل شکر الصنیعہ ام غمط

اپنا احسان اس پر کرو خواہ وہ شکر گذار ہو یا نہ ہو۔

من ذا الذی ما ساء قط ومن لہ الحسنیٰ فقط

ایسا کون ہے جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو اور اُس کے یہاں صرف خوبیاں ہی خوبیاں ہوں۔

ابراہیم نے جب معافی کی خوشخبری سنی تو بہت زور سے تکبیر کہی اور مامون کی خدمت میں عرض کی امیر المومنین! میرا گناہ اس سے بہت بڑا ہے کہ میں اس کے لئے کوئی عذر تلاش کروں اور آپ کا عفو اس سے بہت زیادہ ہے کہ میں اس کے لئے تشکر و امتنان کے الفاظ ڈھونڈوں۔ اس کے بعد مامون نے اس کی جاگیروں کی واگذاری اور مال و اسباب کی واپسی کا حکم دیا اور انعام و اکرام سے مالا مال فرمایا۔ پھر بہت دیر تک اس کی سرگذشت سنتا رہا اس کے بعد نائی۔ سپاہی کی عورت اور لونڈی کے حاضر کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ سب حاضر ہوئے تو سب سے پہلے لونڈی سے پوچھا تو نے اپنے سردار اور ولی نعمت سے غداری کیوں کی۔ لونڈی نے کہا انعام کیلئے یا امیر المومنین۔ مامون نے کہا تیرا شوہر ہے اس نے کہا نہیں۔ کوئی اولاد لونڈی نے کہا نہیں مامون نے اس کو سنو کوڑے لگوائے اور قید خانے میں بھیجدیا اور سپاہی کی عورت اور نائی کو بہت سا انعام اور خلعتہائے فاخرہ عنایت فرمائے گئے اور نہایت عزت و مکرمت کے ساتھ رخصت کیا گیا۔

یہ ہے ان لوگوں کا شخصی اخلاق جس کو مخالفین جبارنی الارض ثابت کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں اور یہ ہے ان کی دشمنوں کے ساتھ مروت۔ خیر ان کی سلطنت تو بہر حال شخصی سلطنت تھی مگر آج جمہوریت کے زمانہ میں کیا کوئی ایسا ہے جس کے اخلاق میں اس طرح کا نہیں بلکہ اس سے سویں حصہ کا کوئی کارنامہ موجود ہو۔

اور پھر جب دشمنوں کے ساتھ تلطف و مدارات کا یہ حال تھا تو دوستوں کا کیا حال ہوگا۔ بقول بلبل شیراز ؂

دوستاں را کجا کنی محروم
تو کہ با دشمناں نظر داری

نیا گھر

مترجمہ جناب افسر ماہپوری!

پہلی دفعہ
جب میں نے دروازہ بند کردیا تو
خود کو نئے گھر میں
تن تنہا پایا۔
اس وقت ہوائیں دردانگیز گیت
گاتی ہوئی چل رہی تھیں۔
چشم زدن میں
گھر پُرانا ہوگیا۔ اور میں بھی
پیری سے جھکنا رہو گیا۔
میرے کان اس خوف سے
لرزہ براندام تھے جس کی پیشین گوئی
وہ سُن چکے تھے

طوفان خیز راتیں
یخ بار دن
جن کی کوئی حد نہیں۔
مجھے پیشین گوئیاں یاد تھیں
تاہم میں تاریکی میں رہا
اور کوئی چیز روشنی میں نہ آئی
ہاں! اتنا ضرور معلوم ہوا کہ
اس وقت ہوا کی آوازیں
کیسی ہونگی جب
یہ تمام چیزیں فلک کے غار میں
پھینک دی جائینگی،

(ای۔ طامس)

”ہم کو تم کو“

ناخدائے سخن تاج الشعراء فصیح العصر حضرت نوح ناروی

بہکانے والے بہکائیں شوق سے اکثر ہم کو تم کو
آنا جانا، ملنا جلنا، کھل کر چھپ کر ہم کو تم کو

شکر خدا کا چاہیے کرنا عیش اٹھا کر ہم کو تم کو
جس کی تمنا میں ہم تم تھے وہ ہے میسر ہم کو تم کو

عشق و وفا کے بھی ہیں سلیقے حسن و جفا کے بھی ہیں طریقے
ان سے مستثنیٰ کر دیگا کوئی کیونکر ہم کو تم کو

ربط بڑھے آپس میں ایسا چین نہ آئے دم بھر اصلا
وقت ہو ناوک دن ہو خنجر شب ہو نشتر ہم کو تم کو

عیش میں حاضر رنج میں شامل چھوٹے ساتھ نہایت مشکل
مل نہیں سکتا سچا مونس دل سے بڑھ کر ہم کو تم کو

پھر گردوں پر بدلی چھائی بدلی میں بجلی لہرائی
پیتے جائیں دیتا جائے ساقی ساغر ہم کو تم کو

ہائے وہ دن وہ وقت عالم آپس میں اخلاص وہ ہر دم
عیش کی راتیں لطف کی باتیں بھولیں کیونکر ہم کو تم کو

یاد نہ آئے اب جیتے جی خیر اسی میں ہے دونوں کی
پچھلا ساماں گذرا عالم بھولا منظر ہم کو تم کو

ظلم و ستم کے شکوے کیسے لطف و کرم کے وعدے کیسے
لیکن حاضر رہنا ہوگا حشر میں دن بھر ہم کو تم کو

مولا سے مانگیں یہ دعائیں ہر دم لطف و عیش اٹھائیں
جس میں رنج و غم نہ لکھے ہوں دے وہ مقدر ہم کو تم کو

تم نکلو کیوں دل سے ہمارے ہم نکلیں کیوں دل سے تمہارے
ڈھونڈیں بھی تو مل نہیں سکتا اور کوئی گھر ہم کو تم کو

کتنے دنوں تک بزم آرائی آپس میں پھر ہو گی جدائی
ایک جگہ رہنے ہی نہ دیگا چرخ ستمگر ہم کو تم کو

حسرت ہو جائے نہ مصیبت ارماں ہو جائے نہ قیامت
ربط بڑھانا چاہیئے باہم سوچ سمجھ کر ہم کو تم کو

ذکر محبت کب ہے بجا عذر جفا و جور بھی اچھا
لیکن ہو وہ بات کچھ ایسی آئے باور ہم کو تم کو

کروٹ بدلی اب قسمت نے پھیرا منہ عیش و عشرت نے
بیر تھا ان کو ہم سے تم سے ناز تھا جن پر ہم کو تم کو

کیوں گھبراؤ کیوں گھبرائیں کیوں پچھتاؤ کیوں پچھتائیں؟
شوق کی غایت بس اتنی ہی رکھے مضطر ہم کو تم کو

راہ محبت میں راحت کیا ویسے ہی یہ جیسے صحرا،
کچھ نہ ملے گا صرف ملیں گے کنکر پتھر ہم کو تم کو

جو نہ بھٹکنے دے رستے سے سمجھے پیچ و خم منزل کے
چاہیئے چلتا پھرتا ایسا کوئی رہبر ہم کو تم کو

کل ہی تک تھا جوش محبت کل ہی تک تھی چشم عنایت
دل کا دینا دل کا لینا آج ہے دوبھر ہم کو تم کو

عیش و خوشی پر کیا اترانا کیا کھونا کیا ان کا پانا
رنج و الم ہی پیش آئینگے روز افزوں تر ہم کو تم کو

آنکھوں سے اشکوں کی روانی یہ طوفاں ایسی طغیانی
کیا جانے پہنچائیں کہاں تک نوح بہا کر ہم کو تم کو

تقدیر بدست!

ایک بیحد دلچسپ اور کارآمد مضمون

جناب پروفیسر بشیر صاحب بی۔ اے سائنٹفک پامسٹ رنگپورہ۔ سیالکوٹ

تعارف

علم الید جسے عرف عام میں پامسٹری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے دو حصص پر مشتمل ہے۔ حصہ اول دست انسانی کی صوری حالت سے متعلق ہے اور ناخنوں کی تشکل و شباہت۔ انگلیوں کی صورت۔ ہتھیلی کے نشیب و فراز اور رنگت وغیرہ امور کے مطالعہ سے کردار انسانی کی پیچیدگیوں اور تجزیہ کاری کی راہ میں معاونت کرتا ہے۔

ازمنہ سابقہ میں علم الید کا یہ حصہ مشاہیر دست شناسوں کی بہت کم توجہ حاصل کر سکا اور نسل انسانی اس کے حقیقی افادی پہلو سے ناآشنا رہی حتیٰ کہ فرانس کے ترقی یافتہ اذہان نے انیسویں صدی عیسوی میں اس پر اپنی توجہات مرکوز کیں اور اہل عالم کو اس حصہ دست شناسی کے لامحدود فوائد سے روشناس کرایا۔ چنانچہ عہد مذکور سے دور حاضر تک اہل فرنگ نے علم دست انسانی کے اس شعبہ پر اپنی تحقیقات کے جو نتائج پیش کئے ہیں وہ جہاں محیر العقول ہیں وہاں نفسیاتی اور طبی نقطۂ نظر سے اہل عالم کیلئے ایک لازوال خزانہ ہیں۔ انسانی زندگی میں ان سے استفادہ کے باعث ان گنت روحانی اور مادی فوائد سے غم واندوہ کی نمایاں کاہش اور مسرت کے عنصر کا وافر اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

علم الید کا حصہ ثانی کف دست میں منقوش خطوط اور نشانات کے مطالعہ سے متعلق ہے۔ ہندی زبان میں اسے "ہستھ لیکھا" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہی وہ علم ہے جسے قدیم سے اہل یونان کی زبان میں (Cheiromancy) کیرومنسی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اور یورپ اور امریکا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں میں علم مذکور کے اکثر اسماء اسی نام سے ماخوذ ہیں۔ علم الید کا یہی وہ حصہ ہے جو چند فروعی اختلافات سے قطع نظر اصولی طور پر زمانہ جاہلیت سے کائناتی اور عالمگیر رہا ہے، اور آج بھی مشرق و مغرب کے امتیازات سے بلند و بالا ہے۔ اصولاً علم الید ایک ہے اور ہر حقیقت کی طرح جہاں گیر و جاوداں۔ اس کا تعلق انسان سے ہے اور اس کی دنیا رنگ و نسل کے امتیازات سے قطعی طور پر بے نیاز۔

اہل مغرب نے جہاں دست انسانی کی ساخت سے متعلق از حد مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں وہاں ہست ریکھا کو بھی نہ صرف فراموش ہی نہیں کیا بلکہ اپنی مساعی حسنہ کے طفیل اس کو بھی مکرر ایک سائنٹفک انداز سے چشم عالم کے سامنے پیش کر کے علم الید کی عظمت گم گشتہ کو بحال کر دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہست ریکھا کی تاریخ نسل انسانی کی تاریخ ہے۔ مشرق کی قدیم الہامی کتب میں اس کا ذکر پایا جاتا ہے۔ چنانچہ سرزمین ہند کی قدیم الہامی کتب میں ہستریکھا کا تذکرہ موجود ہے۔ تبت اور چین ایسی قدیم تہذیبوں میں بھی اس کے آثار پائے جاتے ہیں اور مصر قدیم تو اکابر مورخین کے بیانات کے مطابق ایسے علوم کا نہ صرف جنم بھوم بلکہ گہوارہ رہا ہے۔ چنانچہ قدیم مصری تہذیب کے پرشکوہ دور میں

مصر کے مذہبی پیشوا نہ صرف دست شناسی ایسے موقر علم کے ماہر ہوا کرتے تھے بلکہ اس کی سینہ بسینہ تعلیم بھی دیا کرتے تھے اور جب تہذیب مصر کا شیرازہ پریشان ہوا ہے اور ان مذہبی پیشواؤں نے ممالک غیر کا رُخ کیا تو ان کی ایک شاخ یورپ میں جا نکلی اور یہاں علم کے مخفی خزائن بھی اپنے سینوں میں ساتھ لیتی گئی۔ اہل یورپ مصریوں کو Egyptian ای جپشین کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو یہ علوم مغرب میں لے گئے اور بعد میں (Egypsies) جپسیز کے نام سے یاد کئے جانے لگے۔ عہد حاضر میں اہل فرنگ نے ہستر کیا پر تحقیقات کی روشنی میں جو نتایج اہل عالم کے سامنے پیش کئے ہیں ان کی بنیاد در حقیقت انہیں خانہ بدوش دست شناسوں (Gypsies) کی صدری تعلیمات سے حاصل کردہ اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ لیکن اہل مغرب کی اعلیٰ ذہنی کاوشوں کی فیض باریوں نے اس فن کو از سر نو اس مقام پر پہونچا دیا ہے کہ تمام مہذب ممالک کے ارباب فکر کی توجہات آپ سے آپ اس کی طرف کھنچی چلی جا رہی ہیں۔

صحیح دست شناسی کے لئے ہمیں دست انسانی کے مختلف حصص اور کفِ دست میں منقوش لکیروں کے ناموں اور ان کی خصوصیات سے واقف ہونا از بس ضروری ہے۔ اس مقصد کیلئے ہمیں اشکال متعلقہ کی طرف اپنی توجہ منعطف کرنے کی ضرورت ہے۔

شکل نمبر۱

(ل) انگوٹھا (ب) انگشت شہادت (ج) درمیانی انگلی (د) تیسری انگلی (ہ) چھنگلیا (و) پہلی پور (ز) دوسری پور (ح) تیسری پور (ط) مختلف ابھار۔

دست انسانی کے مذکورہ بالا حصص نفسیاتی اور طبی نقطۂ نظر سے مفید ہیں۔
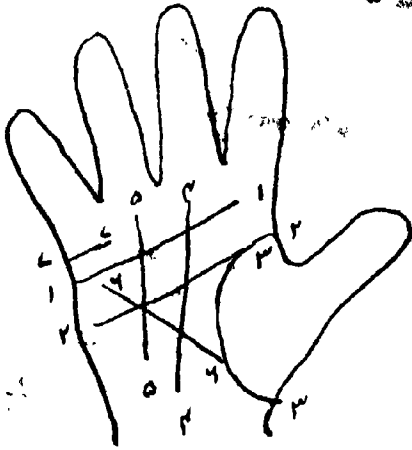
شکل نمبر۲

(۱) دل کی لکیر۔ انسانی جذبات کے مظاہرات پر دال ہے۔
(۲) دماغ کی لکیر۔ ذہن انسانی کی حالت کا نقشہ ہے۔
(۳) زندگی کی لکیر۔ انسانی عمر اور حالات زندگی کی آئینہ دار ہے۔
(۴) قسمت کی لکیر۔ زر و دولت اور شخصیت کا پتہ دیتی ہے۔
(۵) کامیابی کی لکیر۔ کشمکش حیات میں کامرانی کی مقیاس ہے۔
(۶) صحت کی لکیر۔ انسان کی جسمانی حالت کا آئینہ ہے۔
(۷) شادی کی لکیر۔ شادی وغیرہ امور پر روشنی ڈالتی ہے۔

نفسیاتی اور طبی امور کے علاوہ علامات بالا اتفاقی اعتبار سے بھی انسانی زندگی کے رازوں کی عقدہ کشائی کرتی ہیں۔

باب (۱) اوّل

دست شناسی میں صحیح نتائج پر پہنچنے کیلئے ہمیں زیر مطالعہ شخص کے کردار کا بخوبی علم ہونا چاہئے کیونکہ کسی انسان کے اوصاف و نقائص کا صحیح علم اس کی زندگی سے متعلقہ امور پر حکم لگانے کے لئے نہ صرف مفید

بلکہ ضروری ہے۔ کردار کی تفہیم کے لئے ہمیں سب سے پہلے ہتھیلی کے مقابلہ
میں انگلیوں کی اجتماعی طوالت کی طرف اپنی توجہ منعطف کرنے کی ضرورت
ہے۔ ہتھیلی کے مقابلہ میں انگلیاں اگر طویل تر ہوں (شکل نمبر ۱) تو ایسی
صورت میں طبیعت میں سوچ بچار کا پتہ دیتی ہے۔ ایسے اشخاص طبعاً
غور بچار اور تفصیلات کے جاننے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ انھیں کسی
کام میں بھی دھکیلا نہیں جا سکتا۔ جلد بازی سے گریز اور جادۂ حیات پر ہر
قدم کو سوچ کر اُٹھانا ان کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔

اس کے برعکس اگر ہتھیلی طویل تر ہو یعنی انگلیاں چھوٹی ہوں
(شکل نمبر ۲) تو طبیعت میں عجلت پسندی اور جلد بازی کا پتہ دیتی
ہیں۔ ایسے اشخاص تفصیلی مطالعہ سے گریز کرتے ہیں اور معاً نتائج پر پہنچنے
کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے اشخاص عظیم الشان سکیموں کے سوچنے
اور ان کی تنظیم کی تحریک میں لطف حیات محسوس کرتے ہیں ان کا سب سے
بڑا نقص بے صبری اور جلد بازی ہوتا ہے۔

شکل نمبر ۱

لیکن چھوٹی انگلیاں اگر گرہ دار بھی نظر آئیں (شکل نمبر ۳) تو
تیز فکری کی علامت ہیں۔ ایسے اشخاص جہاں معاً نتائج پر پہنچ جاتے ہیں
وہاں بعجلت تفصیلی مطالعہ بھی کر لیتے ہیں۔ گرہ دار انگلیاں طبیعت میں
سوچ بچار اور تفصیلی مطالعہ سے دلچسپی کا پتہ دیتی ہیں۔ انگلیوں کی
گرہ دار صورت چھوٹی انگلیوں کی عجلت پسندی اور جلد بازی کو تیز فکری

شکل نمبر ۲

میں تبدیل کر دیتی ہے چنانچہ ان کے حامل جہاں عظیم الشان سکیمیں سوچتے
ہیں وہاں تفصیلی مطالعہ بھی کر لیتے ہیں اور اپنی طبعی عجلت پسندی کے طفیل
کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ امور سرانجام کر جاتے ہیں۔ لیکن اس
کے برخلاف اگر انگلیاں گرہ دار ہونے کے بجائے ہموار دکھائی دیں جیسا
شکل نمبر ۲ میں ہے تو چھوٹی انگلیوں کی طبعی جلد بازی میں مزید اضافہ
ہو جاتا ہے۔ ایسے اشخاص خیال اور عمل کے مابین بہت کم وقفہ ڈالتے
ہیں اور ذہن میں کسی خیال کے آتے ہی نتائج سے بے پروا ہو کر یکا یک
میدان عمل میں کود پڑتے ہیں۔ لیکن اگر لمبی انگلیاں ہموار صورت میں

شکل نمبر ۳

کریں تو تفصیلی مُطالعہ کے ساتھ ہی ساتھ طبیعت میں تیز فکری بھی آجاتی ہے۔ ایسے اشخاص جہاں بغیر کچھ سوچے سمجھے کوئی قدم اُٹھانے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے وہاں تیز فکر ضرور ہو جاتے ہیں اور اس خوبی کے باعث وقت کے کم سے کم صرف کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کام کر جاتے ہیں۔ لیکن لمبی انگلیاں اگر گرہ دار بھی دکھائی دیں تو ایسے اشخاص کی سوچ بچار میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ اشخاص بال کی کھال اتارنے کی کوشش کرتے ہیں اور طبیعت میں وافر سوچ اور تفصیلی مطالعہ سے بڑھی ہوئی دلچسپی کے باعث بدگمان اور شک کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ خود اعتمادی ایسا جوہر بھی کھو دیتے ہیں۔ ایسے اشخاص انہیں
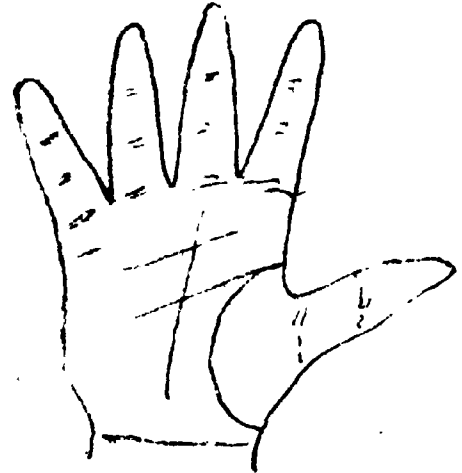
شکل نمبر۲

نقائص کے باعث کسی کام کو بھی تسلی بخش طور پر سرانجام نہیں کر سکتے مزید براں ہر کام میں ضرورت سے زیادہ وقت صرف ہی نہیں کرتے بلکہ ضائع بھی کر دیتے ہیں۔ کثرت فکر اور بدگمانی طبع کے باعث یہ لوگ ہمیشہ غمگین اور اکثر ناکام رہتے ہیں۔

باب (۲) دوم

انگلیوں کی اجتماعی طوالت کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں ان کی انفرادی لمبائی کا مطالعہ بھی کردار انسانی کی تفہیم کے لئے ازبس ضروری ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر ہمیں درمیانی انگلی سے دیکھنا آغاز کرنا چاہیئے درمیانی انگلی عام طور پر ہاتھ میں طویل ترین صورت اختیار کئے ہوتی ہے طویل ترین درمیانی انگلی سوچ بچار اور توازن ذہنی کی آئینہ دار ہے۔ اس کے حامل سنجیدہ طبع۔ عمل پسند اور خردمند ہوتے ہیں۔ لیکن اگر یہ انگلی بے حد طویل نظر آئے تو طبیعت میں شک اور بدگمانی کا عنصر پیدا کر دیتی ہے مزید برآں اس کے حامل ہر امر کی وافر تجزیہ کاری کے باعث غم نصیب ہو جاتے ہیں نشان ا شکل نمبر ۱

شکل نمبر ۱

درمیانی انگلی کی دائیں جانب پہلی انگلی یا انگشت شہادت اور بائیں سمت تیسری انگلی واقع ہے۔ نشانات ب اور ج شکل نمبر ۱ ان ہر دو انگلیوں کا احتیاط سے مطالعہ بھی ضروری ہے۔

انگشت شہادت طبیعت میں حصول قوت اور حکمرانی کی خواہش کو ظاہر کرتی ہے اور اگر یہ انگلی نہایت نمایاں اور لمبی دکھائی دے تو حکمرانی اور حصول عروج کی انتہائی اور پیدائشی خواہش کو ظاہر کرتی ہے لیکن اگر یہ انگلی تیسری انگلی سے طویل تر نظر آئے جیسے کہ شکل نمبر۲ سے واضح ہے تو ایسے کردار کا پتہ دیتی ہے کہ جو آرٹ اور شہرت کے مقابلے میں مادی اشیاء کو ترجیح دیتا ہے اور حصول زر و جاہ کی راہ میں سدا کوشاں رہتا ہے۔ ایسے اشخاص دنیا اور اس کی فراغتوں کے بےحد دلدادہ ہوتے ہیں۔ ذہنی اور غیر مادی اشیاء ان کے لئے بہت کم قابل توجہ ہوتی ہیں۔

شکل نمبر۲

تیسری انگلی آرٹ اور ناموری کی آئینہ دار ہے۔اور اگر یہ انگلی انگشت شہادت کے مقابلہ میں طویل تر دکھائی دے جیسے کہ شکل نمبر۲ سے واضح ہے تو ایسے افراد کا پتہ دیتی ہے کہ جن کے مقاصد حیات ذہنی اور غیر مادی ہوتے ہیں ایسے لوگ شعر، موسیقی اور مصوری ایسے فنون لطیفہ کے میدان میں حصول کمال و ناموری کو سرمایہ زیست تصور کرتے ہیں اور زندگی بھر اسی دھن میں لگے رہتے ہیں جس طرح طویل تر انگشت شہادت حکمرانی اور دنیوی عروج کی فطری خواہش کو ظاہر کرتی ہے عین اسی طرح طویل تر تیسری انگلی آرٹ میں کمال اور حصول شہرت کی پیدائشی تمنا پر دال ہے۔ لیکن اگر یہ دونوں انگلیاں یکساں لمبائی کی حامل ہوں تو ایک

نادر کردار کی تخلیق کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔ایسی صورت آرٹ پرستی اور حصول قوت کا خوشگوار امتزاج پیدا کر دیتی ہے یہ لوگ دنیوی جاہ و ثروت کے ساتھ ہی ساتھ ناموری اور فنون لطیفہ میں بھی دستگاہ رکھنے کے متمنی ہوتے ہیں۔ایسا امتزاج نہایت عمدہ لیکن بیحد کمیاب ہوتا ہے۔

تیسری انگلی کی بائیں طرف چھنگلیا واقع ہے۔ نشان د شکل نمبر۱ اس کا مطالعہ بھی کردار کی تفہیم میں کافی اعانت کرتا ہے۔لمبی چھنگلیا قوت بیان اور ڈپلومیسی کا پتہ دیتی ہے۔ایسے اشخاص نہایت عمدہ مقرر اور انشا پرداز ہو سکتے ہیں۔لیکن اگر یہ انگلی نمایاں طور پر چھوٹی دکھائی دے تو قوت بیان کی دولت سے تہیدستی کا پتہ دیتی ہے۔اس کے حامل اپنی زبان پر بہت کم قابو رکھتے ہیں اور اظہار رائے کے سلسلہ میں تہذیب و سلیقہ مندی کو بہت کم پیش نظر رکھتے ہیں اور اکثر بیڈھب اور ناموزوں باتیں کہہ جاتے ہیں۔

اب ہمیں انگشت شہادت کے دائیں جانب اپنی توجہ انگوٹھے پر مبذول کرنی چاہیئے۔ نشان ہ شکل نمبر۱۔ دست انسانی میں انگوٹھہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔بناوٹ کے اعتبار سے بھی انگوٹھہ دوسری انگلیوں سے مختلف ہے۔ جہاں دوسری انگلیاں تین تین پوروں کی حامل ہیں وہاں انگوٹھہ صرف دو پوروں پر مشتمل ہے۔پہلی پور ناخن کی حامل ہے اور قوت ارادی کا پتہ دیتی ہے۔ دوسری پور اس کے زیریں حصہ پر مشتمل ہے اور استدلال کی آئینہ دار ہے نشان ہ شکل نمبر۱

انگوٹھہ اگر لمبا (یعنی دونوں پوریں لمبی ہوں) اور مضبوط دکھائی دے تو نہایت عمدہ علامت ہے۔ایسا انگوٹھہ زبردست شخصیت کا پتہ دیتا ہے۔اس کے مالک عمدہ قوت ارادی اور معقول استدلال سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ایسے لوگ صاحب آراء ہوتے ہیں اور ان پر کار بند رہنے کے خوگر۔ نشان ہ شکل نمبر۴

انگوٹھے کی ایسی حالت کے ساتھ ہی ساتھ اگر انگشت شہادت جاہ و حشمت کی نمایاں خواہش کا بھی پتہ دے تو ایسے انسان قوت ارادی اور اعلیٰ قوت فکر کے بل بوتہ پر نظام حکومت میں قابل رشک مراتب پر پہنچ کر رہتے ہیں۔اس کے برخلاف اگر تیسری انگلی ناموری اور کمال فن کی نمایاں خواہش کو ظاہر کرے تو اس کے حامل فکر و ارادہ کی اعلیٰ کارفرمائیوں

کے طفیل آسمان شہرت پر مہر و ماہ بن کر چمکتے ہیں۔

لیکن اگر انگوٹھا چھوٹا اور کمزور دکھائی دے (نشان ۵ شکل نمبر ۱) تو کمزور کردار کا پردہ فاش کرتا ہے۔ اس کے حامل دوسروں کی آراء سے اکثر اور بہت زیادہ متاثر ہوتے رہتے ہیں ارادے کی کمی اور استدلال کا فقدان ان کی نمایاں خامیاں ہیں۔ یہ لوگ زندگی کے برق رو دھارے پر ایک تنکے کی طرح بہتے چلے جاتے ہیں۔

کمزور انگوٹھے کے ساتھ ہی انگشت شہادت اگر تیسری انگلی سے طویل تر ہونے کے باعث نمایاں خواہش عروج و حکمرانی کا پتہ دے تو ایسی
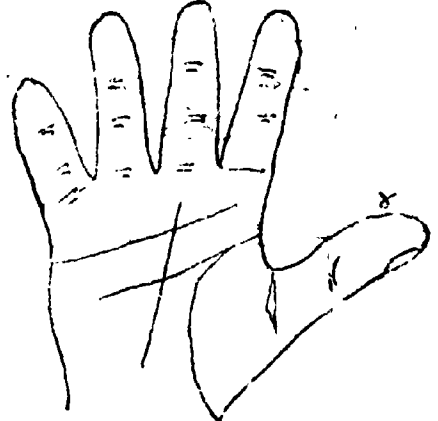
شکل نمبر ۴

صورت میں ایک خیالی حالت سے کچھ بھی زیادہ حیثیت نہیں رکھتی فقدان ارادہ اور حدت فکر کے باعث ایسے لوگ میدان حیات میں ارتقائی منازل طے کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اسی طرح اگر تیسری انگلی انگشت شہادت سے طویل تر نظر آئے اور ناموری اور حصول کمال کی پیدائشی خواہش کو ظاہر کرے تو اس صورت میں بھی ارادے کی کمی اور فکر کا فقدان کوئی نمایاں کامیابی کی امید نہیں دلاتے۔ ایسے افراد کی زندگی تمنائے کمال و شہرت تک ہی محدود رہ جاتی ہے۔

اسی طرح درمیانی انگلی اور چھنگلیا کی خصوصیات پر انگوٹھے کی بڑائی اور چھوٹائی اثر انداز ہوتی ہے۔ چنانچہ نمایاں اور لمبی چھنگلیا کی ڈپلومیسی کو انگوٹھے کی مضبوط اور لمبی حالت چار چاند لگا دیتی ہے۔ ایسے افراد جہاں اعلیٰ ڈپلومیسی کا جوہر رکھتے ہیں، وہاں قوت ارادہ اور اعلیٰ استدلال کے باعث بیحد کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن اگر چھنگلیا چھوٹی اور کمزور نظر آئے تو قوت ارادی اور کامیاب استدلال چھنگلیا کی کمی کو پورا کر دیتے ہیں لیکن کمزور انگوٹھا کمزور چھنگلیا کی خامیوں کو اور بھیانک اور نقصان رساں بنا دیتے ہیں۔ اسی طرح بہت زیادہ طویل لمبی انگلی کی غم نصیبی میں بھی مضبوط انگوٹھا کمی کر دیتا ہے۔ لیکن اس کی کمزور صورت درمیانی انگلی کی غم پسندی کو اور زیادہ تکلیف دہ رنگ میں رنگ دیتی ہے۔

انگوٹھے کی لمبائی کے ساتھ ہی ساتھ اس کی پوروں پر بھی نگاہ رکھنی چاہیے۔ اگر انگوٹھے کی دوسری یعنی زیریں پور پہلی یعنی ناخن والی پور سے پتلی نظر آئے اور "کمردار" صورت پیش کرے جیسے کہ شکل نمبر ۵ سے واضح ہے تو یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس کا حامل موقع شناس ہے اور انسانی جذبات کا احترام کرتا ہے۔ لمبے انگوٹھے کی ایسی کمردار حالت اعلیٰ ڈپلومیسی کی علامت ہے۔ ایسے لوگ ہر موقع اور ہر انسان سے زیادہ سے زیادہ اور بہترین انداز میں استفادہ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ انگوٹھے کی ایسی صورت کے ساتھ ہی ساتھ اگر چھنگلیا بھی نمایاں اور طویل نظر آئے تو عملی زندگی میں ازحد کامیابی کی علامت ہے ایسے لوگ اعلیٰ مراتب اور تنظیمی امور میں بیحد مفید اور کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔

شکل نمبر ۵

انگلیوں اور انگوٹھے کی انفرادی طوالت کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں نوک انگشت کی شکل و صورت کو بھی دیکھنا چاہیے۔ انگلیاں اختتام پر نوکدار، مربع یا چپٹی ہو سکتی ہیں۔

نوکدار انگلیاں نشان ا شکل ۶۔ آرٹ سے دلچسپی کو ظاہر کرتی

رباعیات

جناب منشی عطاء اللہ صاحب عطاؔ کلبھانوی

اے دل نہ ہو گر اُلفتِ ساقی مقصود
یہ بادہ پرستی ہے سراسر بے سود
خوشنودیٔ ساقی جسے منظور نہیں
رندوں کی نگاہوں میں وہی ہے مردود

۲

سب خوبیٔ تقدیر کے ہیں یہ جلوے
میرے لئے میخانے پہ میخانے کھلے
جنت میں ملیگی حور نیکوکاروں کو
دنیا ہی میں ہیں اُس کے اُڑاتا ہوں مزے

۳

کچھ فکر نہ کر گر ہے ترا نامہ سیاہ
اُٹھ اور تو لے جلد خرابات کی راہ
جن پر حرم و دیر کے در بند ہوئے
ایسوں کو بھی میخانے میں ملتی ہے پناہ
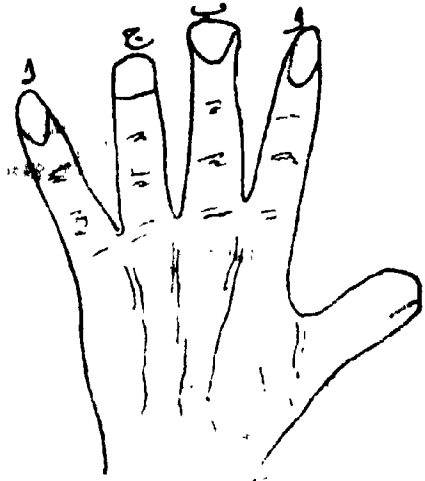
شکل نمبر ۶

ہیں اور طبیعت میں مادی اشیاء کے مقابلہ میں ذہنی امور سے زیادہ دلچسپی کو ظاہر کرتی ہیں۔ ایسی انگلیاں عمل پر خیال کو ترجیح دیتی ہیں اور تساہل پسندی کی طرف راغب کر دیتی ہیں۔

لیکن انگلیاں اگر چپٹی اور پھیلی ہوئی نظر آئیں جیسے کہ نشان ب شکل نمبر ۶ سے ظاہر ہے تو نوکدار انگلیوں کے برعکس نتائج پیش کرتی ہیں ان کے حامل ذہنی امور کے مقابلہ میں جنبش اور عمل سے فزوں تر شغف رکھتے ہیں چپٹی انگلیاں عمل کی طرف نمایاں رجحان طبع کو ظاہر کرتی ہیں۔ ان کے حامل عمل کی ہنگامہ خیز مستیوں سے مدام سرشار رہنا چاہتے ہیں ایسے لوگ تساہل اور ذہنی زندگی سے گریز کرتے ہیں۔

ان دونوں صورتوں کے علاوہ انگلیوں کی نوکیں اگر مربع صورت پیش کریں جیسے کہ نشان ج شکل نمبر ۶ سے واضح ہے تو یہ خوشگوار توازن کی علامت ہے۔ ان کے حامل خیال و عمل کی افراط و تفریط سے پاک ہوتے ہیں۔ فکر و عمل کا خوشگوار اور کارآمد توازن ان کے کردار کی مابہ الامتیاز اور حسین ترین خاصیت ہوتی ہے۔ مضبوط اور طویل انگوٹھے کے ہوتے ہوئے ایسے اشخاص سماج کے مفید ترین افراد ثابت ہوتے ہیں۔

وجدانیات

بورنگ پیٹ کے عظیم الشان مشاعرہ کی صدارتی غزل

عکاس فطرت حضرت علامہ محوی لکھنوی مدظلہ

آہ وہ غم جو رہین آہ بے تاثیر ہے
آہ وہ دل جو سراپا یاس کی تصویر ہے

یا مرا حسن نظر یا عشق عالمگیر ہے
اس چمن کا پتہ پتہ حسن کی تصویر ہے

مقصد غم زندگی کی اک نئی تعمیر ہے
جانتے ہیں ہم جو قصد آسمان پیر ہے

میرے جسم ناتواں میں روح اے تقدیر ہے
یا ترے فتراک میں اک نیم جاں نخچیر ہے

ہو اگر آمادۂ پرخاش چرخ پیر ہے
دست ہمت میں ہمارے دامن تقدیر ہے

خاک برباد چمن کو غور سے دیکھو اگر
ذرے ذرے پر ہماری داستاں تحریر ہے

الحذر یہ سوز دل دیوانگان عشق کا
آگ میں ڈوبا ہوا ہر حلقۂ زنجیر ہے

پھر وہی راتیں وہی آہیں وہی نیندیں اچاٹ
پھر وہی یارب خیال یار دامنگیر ہے

چومنے دے پاؤں آنکھوں، اٹھانے دے نقاب
اے تصور یہ ہمارے دوست کی تصویر ہے

حسن رنگیں نے ازل میں یوں کیا اپنا اسیر
ہر رگ دل خون سے لبریز اک زنجیر ہے

یہ جو ہیں گور غریباں کی زمیں پر منتشر
ہر ورق پر ایک دلکش داستاں تحریر ہے

ہر نظر خنجر بکف ہے ہر ادا نیزہ بدوش
اب حیات جاوداں ملنے میں کیا تاخیر ہے

زندگی کی شان ہے اے سوگوار آشیاں
وہ جو پنہاں تیرے دل میں حسرت تعمیر ہے

اے ملامت گر! خدارا آہستہ بکیں تو ٹر
ایک منزل دل کی ہر ناکامیٔ تدبیر ہے

پھر بہار آئی ہوا دیتی ہے پیغام جنوں
ہوش میں دیکھو تو میرا طوق اور زنجیر ہے

خشک لب آنکھوں میں آنسو زرد رخ صورت بحال
ہم سے جب زنداں میں یہ اس وقت کی تصویر ہے

اس کشاکش سے نہ گھبرا وعدۂ ماضی نہ بھول
تیرے ہی خواب ازل کی زندگی تعبیر ہے

حسن برہم یہ تری چین جبیں نے کیا کیا
دل نہیں اک خون میں ڈوبا ہوا نخچیر ہے

کچھ خبر بھی ہے کہ کیا شے ہے نگاہ جاں نواز
دل کے زخموں کو جو بھر دے یہ وہ نوک تیر ہے

ایک ہی رشتہ میں حسن و عشق دونوں ہیں اسیر
عشق کی دیوانگی ہے زلف کی زنجیر ہے

خونچکاں ہر سانس ہے ہر آہ محوی دلخراش
زندگی کیا ہے ہماری یاس کی تصویر ہے

اقرارِ محبت!

شہرۂ آفاق افسانہ نگار مس میری کوریلی کا ایک رنگین افسانہ

جناب علی احمد صاحب علیؔ فرزند نواب فصاحت جنگ مدظلہ

[مس میری کوریلی یورپ کی مایہ ناز افسانہ نگار اور شاعرہ تھی۔ ۱۸۶۴ء میں یہ ادیب خاتون پیدا ہوئی اور ۱۹۲۴ء میں وفات پائی۔ اس کی زندگی کے یہ ساٹھ سال انگریزی لٹریچر کے لئے بیش بہا گنجینے ہیں۔ انگلستان کے مصنفین میں یہ جادو نگار ناول نویس اپنا پایہ بہت بلند رکھتی ہے۔ اس کے لازوال افسانے ادب کی فضا میں ہمیشہ ہمیشہ گونجتے رہینگے۔ انشاپردازی اور موسیقی کی باقاعدہ تعلیم فرانس اور انگلستان کی درسگاہوں میں حاصل کی۔ اس نے انسانی کریکٹر کا گہری نگاہوں سے مطالعہ کیا تھا اور انگلستان کی گناہ آلود معاشرت کی حقیقت کو سمجھ گئی تھی۔ تقدس اور پاکبازی کا رنگ اس پر غالب آچکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غربا کی حمایت۔ مذہب اور نیکی کی تاکید۔ انصاف پسندی اور ایمانداری کی تائید اس کی تحریر کی خاص خصوصیات ہیں۔

کوریلی جب ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے انگلستان کے سپہر ادب پر طلوع ہوئی تو ہر علمی و ادبی ہستی نے اس کی تصانیف پر بسیط تبصرے کئے۔ سب سے پہلی تصنیف "دی رومینس آف ٹو ورلڈز" ۱۸۸۶ء میں شایع ہوئی۔ بالخصوص "تھلما"۔ "بیرابس"۔ "مرڈر آف دی ولیشا" اور "ٹینگ ڈائنا" جیسے بلندپایہ ناول ہی اس کی ابدی شہرت کا باعث ہیں۔ ذیل کا مضمون اسی جادو بیان خاتون کے ناول اوپن کنفشن Open Confession کا اقتباس ہے۔ علی احمد]

"اگر میں تم سے محبت کرتی ہوں تو اس میں تمہارا کیا نقصان ہے" یہ ایک قدیم مقولہ ہے۔ بہت قدیم لیکن سچا ——— اس لئے کہ میں تم کو محبت سے بھرا ہوا خط لکھ رہی ہوں ——— ظاہر ہے کہ تم کو یہ کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتا ——— فطرتاً یا حقیقتاً میرے جذبات سے تم کو کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح، جس طرح نسیم کے تیز جھونکے میرے جذبات کو مشتعل کردیتے ہیں اور سمندر کی خاموش لہریں ——— میرے دل کو غمگیں بنا دیتی ہیں۔ لیکن دونوں، نسیم سحر اور سمندر اپنے اس اثر سے بیخبر ہیں جو میری روح پر اثرپذیر ہوتے ہیں ——— تم! جس سے میں نے دنیا میں سب سے پہلے محبت کی ہے ——— اسی طرح اپنے ان جذبات سے بیخبر ہو جنھوں نے میرے دل میں گہرے نقوش پیدا کردیئے ہیں ——— اگر میں تم سے محبت کرتی ہوں۔

میں اس نئے جذبہ کے تلخ ذائقہ سے ناخوش نہیں ہوں ——— مجھکو اس وقت بھی خوشی کا احساس ہوتا ہے جب تم میرے پاس ہوتے ہو

اور جب تم نہیں ہوتے تب بھی تمہارا خیال میرے تاریک دل کو روشن کرتا رہتا ہے ـــــ وہ مسئلہ محبت جس پر میری روح کا انحصار ہے تمہاری نظر غلط انداز میں کوئی وقعت نہیں رکھتا ـــــ جس طرح آفتاب عالمتاب کی تیز شعاعیں چمن کے نازک اور شگفتہ پھولوں کا کوئی خیال نہیں کرتیں ـــــ اس سے یہ مطلب نہیں کہ میں تمہارا شکوہ کر رہی ہوں، بلکہ اپنے جذبات پنہاں کو بے پردہ کر رہی ہوں۔

خود میری نظر میں ـــــ اس سے زیادہ تعجب انگیز بات شاید کوئی ہو ـــــ کہ میں تم سے محبت کا اقرار کر رہی ہوں ـــــ جس نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی ـــــ اور وہ صفات جن کو میں تمہاری طرف منسوب کر رہی ہوں ـــــ بہت ممکن ہے کہ وہ تم میں موجود نہ ہوں اور یہ صرف میرا ایک خواب ہی ہو ـــــ شاید تم بعض کی نظر میں محبت کئے جانے کے قابل نہ ہو لیکن ـــــ لیکن میں تم سے محبت کرتی ہوں ـــــ اور اس قدر تمہاری محبت میں کھوئی ہوئی ہوں کہ اس کا احساس بھی نہیں کہ ـــــ تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو یا نہیں؟

لوگ کہتے ہیں کہ محبت کا انجام اور اختتام "شادی" ہے۔ لیکن میری کشتئ محبت ایک نامعلوم سمندر میں رواں ہے ـــــ کشتی کہاں جا رہی ہے میں نہیں جانتی ـــــ البتہ وہ سمندر کی طوفانی موجوں پر سورج کی گرم شعاعوں اور چاند کی سنہری کرنوں میں چلی جا رہی ہے ـــــ میری یہ چھوٹی کشتی کسی طوفان کی نذر ہو جائے یا گرداب کا لقمہ ہو جائے مجھے اس کا خوف نہیں ـــــ مجھے قدرت نے اتنی ہمت دی ہے کہ میں قدرت کی ہر طاقت کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوں کیونکہ قدرت ہی نے میری رگ رگ میں محبت کی لہر دوڑا دی ہے ـــــ میرے لئے دنیا صرف اس لئے دلچسپ ہے کہ تم ہو ـــــ میں خود کو تم سے وابستہ سمجھتی ہوں ـــــ اگر تمہارا وجود دنیا میں نہ ہو تو یقین جانو میرا بھی وجود نہ ہوگا۔ اس لئے کہ میں تم میں اپنا جلوہ دیکھتی ہوں اور مجھ میں تمہارا جلوہ نظر آتا ہے ـــــ یہ میری زندگانی کا راز ہے۔

....

وہ بھی دن تھے کہ سوز الفت کی آگ سے میں بالکل بے بہرہ تھی ـــــ عشق کی داستانوں کو ہنس ہنس کر سنتی تھی ـ میں نہ جانتی تھی کہ ایک دن یہ ہنسی مجھے خون رلوائیگی ـــــ مجھے یہ نہ معلوم تھا کہ محبت کا آزار مجھکو بھی ہوگا۔ اور ـــــ میری دنیا بدل جائیگی۔ کیا تمہیں اب بھی وہ سنہری شام یاد ہے جب ہم اور تم باغ کی سیر کو گئے تھے۔ اور تم نے گلاب کا ایک سرخ پھول توڑ کر مجھے پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔ "ـــــ تمہارے رخسار اس گلاب سے زیادہ خوبصورت ہیں اور ان میں اس پھول سے کہیں زیادہ دوشیزگی ہے ـــــ" اُس وقت تبسم کی خاموش لہریں میرے لبوں کو چوم رہی تھیں۔ رقص کر رہی تھیں اور میری آنکھوں میں ایک منفعل چمک پیدا ہو گئی تھی ـــــ تم نے مسکراتے ہوئے اپنی باہیں میری گردن میں ڈال دیں اور میرے معصوم دھڑکتے ہوئے دل کو سینے سے لگا کر اپنے لب میرے مرتعش لبوں سے ملا دیئے تھے ـــــ اس دن سے پھر تم نہ آئے ـــــ آہ! کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ تم نے مجھے کیا کر دیا ہے؟

اگر میں تم کو کسی طرح خوش کر سکتی ہوں تو ـــــ کیا یہ ممکن ہے کہ میں انکار کر سکوں ـــــ میں نے تم سے خاموش محبت کی ـــــ اس خاموشی میں سوز و ساز کا ایک راز پنہاں تھا ـــــ دل کی بات لبوں تک کبھی نہ لا سکی ـــــ یہ میری فطری کمزوری تھی۔ پھر بھی تم اس قدر ضرور جانتے تھے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں اور تم ـــــ تم نے بھی میری محبت کے جواب میں مجھے یقین دلانا چاہا کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو۔

اگر دنیا مجھ پر ہنستی ہے تو ہنسنے دو، اس لئے کہ میں نے اس سے محبت کی ہے جو مجھ سے محبت نہیں کرتا۔ سچ جانو میری کوئی گھڑی تمہاری یاد سے خالی نہیں جاتی ـــــ میں پہروں صرف تمہارے تصور سے محظوظ ہوتی رہتی ہوں۔ ایسا تصور جو مجھے اس دنیا سے جدا کر کے کسی اور ہی دنیا میں پہنچا دیتا ہے ـــــ اور میں سمجھنے لگتی ہوں کہ میں اس وقت زمین پر نہیں بلکہ آسمان پر فرشتوں میں ہوں۔

گو تم میرے پاس نہیں ہو لیکن میں ہر ایک چیز میں تم کو دیکھ سکتی ہوں۔ چاند کی سنہری کرنوں میں تمہاری ہی ضیاء معلوم ہوتی ہے نیلگوں آسمان کی فضا میں تم اور صرف تم ہی نظر آتے ہو ـــــ خاموش سمندروں میں تمہارا ہی جلوہ جھلکیاں لیتا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ـــــ لیکن اب میں محبت کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔ اور میں چاہتی ہوں

بلکہ دعا کرتی ہوں کہ جلد میری زندگی کی شام آجائے۔ تمہارے لئے یہ ایک معمولہ غیر ثابت ہو گی —— یہی کہ ایک عورت محبت کی خاطر اپنی زندگی برباد کرنے کو تیار ہے۔ بائرن نے ٹھیک کہا ہے —— "مرد کے نزدیک محبت ایک چیز ہے زندگی سے علیحدہ —— محبت اور زندگی علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں —— لیکن عورت کی نظر میں محبت اور زندگی دونوں ایک چیز ہیں۔ ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں —" لیکن غالباً تم اس کو ماننے کیلئے کسی طرح بھی تیار نہیں —— تم مرد ہو اور میں ایک کمزور عورت جس کی روح تمہاری پرستش میں جذب ہو گئی ہے اور اس کو سوائے تم سے محبت کرنے کے اور کچھ نہیں آتا —— اور دنیا کی کوئی طاقت اُس کو اس بات پر مجبور نہیں کر سکتی۔ کہ وہ تم سے محبت کرنا ترک کردے —— "محبت" ایک خوشنما باغ ہے جس میں تم تنہا مصروف گلگشت ہو اور جہاں میں تم سے ملنے کیلئے دوڑتی ہوں —— اس معصوم لڑکے کے مانند جو خوشنما کھلونے کو دیکھ کر اس کے حاصل کرنے کیلئے بھاگتا ہے —— بالکل اسی طرح میں دوڑتی ہوئی آتی ہوں اور خود کو تمہارے آغوش میں گرا دیتی ہوں اور —— یہ میری مسرت کا باعث ہے کہ میری کمزوری تمہاری زبردست قوت کے قبضے میں رہے اور یہی ہر اس عورت کی بھی مسرت ہونا چاہیئے جو کسی سے محبت کرتی ہے —— کمزور عورت کیوں چاہتی ہے کہ وہ مرد کی ہمسری کا دم بھرے۔ جبکہ اس کی فطرت کسی قوت کے زیر اثر رہنے کی متقاضی ہے۔ جس طرح سورج کی شعاعیں فضا کے پردوں میں سے گذرتی ہوئی زمین پر پڑتی ہیں —— اسی طرح روح کی روشنی جذبات کے پردوں میں سے گذرتے ہوئے "محبت" پر پڑتی ہے۔ اور محبت —— محبت خوش ہوتی ہے —— جب دو سرشار محبت محو راز و نیاز ہوں۔ لیکن محبت کا یہ تقاضا ہرگز نہیں کہ وہ دونوں شادی کی مضبوط زنجیروں میں جکڑ دیئے جائیں بلکہ اس طرح رہیں جس طرح فرشتے آسمان پر رہتے ہیں۔

میرا جسم نہایت کمزور ہے اور اس قابل نہیں کہ وہ روح کے تمام جذبات کی ترجمانی کر سکے۔ میرے کمزور ہاتھ اس قابل نہیں کہ کمال اشتیاق سے تم کو پکڑ سکیں —— میرے مضطرب دل میں اتنی گرمی نہیں کہ اس کی تپش تمہارے دل کو بھی گرما سکے۔ میری آنکھوں میں اس قدر جادو نہیں کہ وہ تمہارے دل کی گہرائیوں تک پہنچ سکے —— اور میری آواز اس قدر کمزور و نحیف کہ جب میں کہتی ہوں کہ "میں تم سے محبت کرتی ہوں" تو وہ کانپنے لگتی ہے۔

تم جانتے ہو کہ میں نے کبھی غرور نہیں کیا۔ اور ہمیشہ تم سے محبت کی طالب رہی —— گذشتہ رات اگرچہ میرے پاس کوئی نہ تھا —— میں تنہا تھی اور بالکل تنہا۔ لیکن مجھے ایسا معلوم ہوا کہ تم —— تم آ گئے ہو اور میرا تاریک کاشانہ جگمگا اُٹھا ہے —— اور میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ آخر تم نے اتنی تکلیف کیوں کی؟ اس وقت میرے شہابی لب مسکرا رہے تھے اور میری آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

... ~~~ ... ~~~ ... ~~~ ...

بعض اوقات جب میں اس تاریک اور خاموش زندگی سے گھبرا جاتی ہوں —— جس کو میں بیان نہیں کر سکتی —— تو میں سوچتی ہوں کہ اب دنیا میں میرا کوئی نہیں رہا۔ ایک تمہاری محبت تھی، تم نے وہ بھی چھین لی —— اور اب میں اس دنیا میں تنہا رہ گئی ہوں —— آج تمہاری ایک نظرِ لطف کے لئے میں ترس رہی ہوں —— وہ ہوا جس میں تم سانس لیتے ہو میرے لئے قابل رشک ہے۔ وہ نیلگوں آسمان جس پر تمہاری نظریں پڑتی ہیں میرے لئے باعث حسد ہے۔

کیا تم کو وہ نورانی صبح یاد ہے جب تم مجھ سے ملنے کے لئے آئے تھے اور ہم تم خراماں خراماں مکان کے اس گوشے میں جا پہنچے تھے جہاں انگور کی بیل نے انگوروں کو اپنے دامن میں چھپا رکھا تھا اور وہاں —— وہاں تم نے مجھکو اپنے سینے سے لگا کر میری جبین کو بوسۂ محبت کا اعزاز بخشا تھا۔ اور کیا تمہیں یاد ہے اس وقت تم نے کیا کہا تھا —— تم نے کہا تھا "میں تم سے محبت کرتا ہوں —" یہ سُن کر میرے ہوش و حواس سلب ہو گئے تھے —— اور میں نے وہاں سے واپس ہونے کی کوشش کی تھی۔ مگر تم نے مجھے ٹھہرنے پر مجبور کیا تھا۔

بعض وقت تو تم میرے دل کو اپنے دل کی روشنی سے منوّر کر دیتے ہو اور بعض وقت تاریک —— اس قدر تاریک کہ میں بیان نہیں کر سکتی اور اس وقت میں ایسا محسوس کرتی ہوں کہ تم نے مجھے کسی سرد مقام پر چھوڑ دیا ہے جہاں سورج کی شعاعیں بھی نہیں پہنچ سکتیں ——

اور اس برف سے ڈھکے ہوئے سرد مقام پر بیں تمھارے بوسہ کی گرمی کو محسوس کرتی ہوں ۔ اور میری آنکھ سے آنسو رواں ہوجاتے ہیں۔ لیکن لیکن میں رو نہیں سکتی۔ اس لئے کہ آنسو بھی جم جاتے ہیں ۔ پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سیاہ ابر جو میری دنیا کو تاریک کئے ہوئے تھا چھٹ رہا ہے اور سورج کی زرّیں شعاعیں مجھ تک پہنچ رہی ہیں ـــــ اور میرے دل کو گرمی پہنچا رہی ہیں۔ تب میں سمجھتی ہوں وہ تمھاری "بے رخی" تھی اور یہ تمھارا "کرم" ہے۔ تم کو یاد ہوگا آج سے ایک ماہ قبل جب ہم تم ملے تھے ـــــ عرصہ دراز کی جدائی کے بعد، اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کو خوش آمدید کہا تھا ـــــ پھر تم نے مجھ سے پوچھا تھا ۔ "کیا تم اب بھی ذہین ہو؟" اور تمھاری آنکھیں میرا بغور معاینہ کر رہی تھیں۔ میں نے کچھ نہ کہا ـــــ لیکن میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے ۔ تم سمجھ گئے ۔ تم نے جو چیز دی تھی وہ اب تک میرے کاشانۂ محبت میں محفوظ تھی ـــــ اور پھر تمھارے ہاتھ میری گردن میں حمائل ہوگئے اور ـــــ تم نے اپنے لب میرے مرتعش لبوں پر ثبت کر دیئے۔

~~~ ... ~~~ ... ~~~

وہ رنگین دن اب تک تمھیں یاد ہے؟ ـــــ جب تم نے مجھے پہلا خط لکھا تھا اور اُس میں ـــــ اُس میں اظہار محبت کیا تھا۔ تم نے لکھا تھا "میں تم سے محبت کرتا ہوں" ـــــ اس وقت میں کس قدر خوش تھی ـــــ میں بیان نہیں کر سکتی۔ میری روح میں روشنی آگئی تھی ـــــ میرا دل ایک نئے جذبے سے معمور ہوگیا تھا ـــــ یہ خیال میرے لئے کس قدر مسرت انگیز تھا کہ تم مجھکو اپنا شریک زندگی بنانا چاہتے ہو اور درحقیقت تمھیں میری ضرورت ہے ۔ کہ میں تمھیں ہر طرح کا آرام پہنچا سکوں لیکن ـــــ لیکن وہ فریب تھا۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

ہاں! تمھاری نہیں یہ میری غلطی تھی کہ میں نے یقین کر لیا۔ اور تمھاری بات کو سچ جانا ـــــ اس وقت میں تمھارے متعلق صحیح اندازہ نہ لگا سکتی تھی ۔ میں نے تم سے محبت کی ـــــ گویا اپنے آپ کو دھوکہ دیا۔ لیکن صرف میں ہی نہیں دنیا میں ہزارہا عورتیں ہیں جنھوں نے میری طرح خود کو دھوکا دیا ہے۔ اور کس لئے ـــــ؟ اس لئے کہ آغاز محبت کی بے پایاں خوشی جو کہ جسم میں نئی روح پھونک دیتی ہے ـــــ محبت سے بھرے ہوئے دل میں اتنا شعور باقی نہیں رکھنے دیتی کہ وہ اس کے انجام کا صحیح اندازہ لگا سکے ـــــ اور آخر میں جب رُخ سے حقیقت کی نقاب اٹھتی ہے تب سوائے افسوس کے اور چارہ ہی کیا رہتا ہے ـــــ میں نے بھی محبت کی اور ایسی محبت کہ میں اس کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی ـــــ لیکن تم نے مجھے دھوکہ دیا۔ میں گناہ کو معاف کر سکتی ہوں لیکن "بزدلی" کو نہیں معاف کر سکتی ـــــ کیا یہ "بزدلی" نہیں ہے؟ اب تم لکھتے ہو۔ "میں نے دوسری عورت سے جو شادی کی ہے وہ ـــــ اپنی خواہش اور رضامندی سے نہیں کی بلکہ میں ایسا کرنے پر مجبور کیا گیا۔" ـــــ اب میں سمجھی تم نے مجھے بیوقوف بنایا اور میری زندگی کو تباہ کر دیا۔

تم بزدل ہو ـــــ لیکن میں نہیں ـــــ اب جبکہ تمھاری محبت کے دروازے میرے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے بند ہوگئے ہیں میں "بزدلوں کی طرح رو تی نہیں ـــــ اب میں آزاد ہوں اور چاہتی ہوں کہ ہمیشہ آزاد رہوں، تم پہلے شخص ہو جس سے میں نے محبت کی ہے اور یہ بھی سمجھ لو کہ تمھیں آخری بھی ہو ـــــ ہاں! تم مجھکو تباہ کر کے ہنس سکتے ہو۔ لیکن تمھاری یہ ہنسی بالکل ایسی ہی ہوگی جیسے کسی نے شفاف آئینے کو دُھندلا کر دیا ہو۔

اب مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید میرے مرنے کے بعد تم مجھ سے محبت کر سکو۔ اور میری ان گستاخیوں کو بھی فراموش کر دو جو میں نے تمھارے ساتھ کی ہیں ـــــ اور پھر شاید مجھے بھول بھی جاؤ ـــــ اور میرا خیال بھی حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ جائے۔

رباعی

ہے باعثِ سیرِ [illegible] و زنداں بھی
ہے عشقِ بتاں [illegible] ایماں بھی
[illegible] پائے دردِ الفت
افسانۂ زندگی کا عنواں بھی

[illegible]
~~~

عقیدت کے پھول!

از حضرت فطرت واسطی

ستارے ہوتے ہیں جب صبح گاہ متوالے || افق کے جھولے ہیں کرنوں کی ڈوریاں ڈالے
نسیم پھونکتی ہے اُن پہ نیند کا افسوں || شفق پلانے کو آتی ہے بادۂ گلگوں

ہزار رنگ سی ہے دل میں ذوقِ سیرِ نجوم
ہے میرے ذہن میں کتنی لطافتوں کا ہجوم

فرازِ کوہ سے خورشید جب اُترتا ہے || ضیائے صبح سے کہسار جب سنورتا ہے
ہوائے صبح سے ہوتی ہے شاخِ گل لرزاں || جبینِ باغ سے اُڑتی ہے شبنمی افشاں
زمیں پہ ہنستی ہوئی جب بہار آتی ہے || گھٹا برستی ہوئی بار بار آتی ہے
گلوں کی نبضوں میں جب دوڑتا ہے صاف لہو || ہوا اُڑاتی ہے جب رنگ کی طرح خوشبو
مری ان آنکھوں نے رازِ بہار دیکھا ہے || خزاں کے سوز میں سازِ بہار دیکھا ہے

یہ سب مناظرِ انوار میں نے دیکھے ہیں؟
تماشے حسن کے سو بار میں نے دیکھے ہیں

نگاہ کتنے مناظر سے ہوتی ہے مسرور || مری نظر کو ہے لاکھوں مشاہدوں کا غرور
دماغ و قلب کی بھرلی ہیں حسن سے جیبیں || بجی ہیں گھر میں مرے مہوشوں کی پازیبیں

مگر یقین کرو جانِ ماہ وشے تم ہو!
خدا گواہ کہ سب سے حسین شے تم ہو!

والٹیئر

فرانس کا حریّت نواز بطل

از جناب سیّد ارشاد حسین صاحب بی اے آنرز

ہندوستان اس طرح اور اتنے دنوں سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے کہ اس کے لئے آزادی کا مفہوم ہی مفقود ہو گیا ہے۔ ہندی اسی کو آزادی سمجھتا ہے کہ اس کو مساجد میں نماز پڑھنے اور مندر میں ناقوس پھونکنے کا اختیار حاصل ہے۔ وہ اسی کو آزادی کی جنگ سمجھتا ہے کہ مسجد کے سامنے باجہ بجائے جانے یا نہ بجائے جانے کے حقوق کے لئے اپنا اور اپنی ہمسایہ قوم کا خون بیدردی سے زمین پر بہادے۔ وہ اسی کو آزادی کی لڑائی تصور کرتا ہے کہ گاؤکشی کے حقوق ہندو و مسلم کے درمیان اپنی اپنی قوت کے مظاہرے سے طے کرائے۔ اس کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ گائے ہندوستان کے لئے نعمت ہے اور اس اصول کو دنیا سے منوا لینا ہے۔ کاش کبھی فی الواقع آزاد اقوام کی تاریخ کی ورق گردانی کر کے سبق لیا جائے۔ کاش کبھی اس کا احساس ہو کہ صحیح آزادی کے لئے ایسی ایسی کتنی مختصر سی چیزوں کو جس کے لئے آج ہندوستانی برسرپیکار ہو جاتے ہیں۔ قربان کر دینا پڑتا ہے کتنی جد و جہد کی جاتی ہے جس کے بعد کہیں اتنی مختصر آزادی بھی نصیب ہوتی ہے۔ جسے بالعموم آزادی تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہم ہندیوں کو تو اس کا بھی احساس نہیں کہ ان کی زبانوں پر تو بہرے بیٹھے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ غلامی کی عادت آزادی کی تصویر تو در کنار بھی سامنے نہیں آنے دیتی۔ آزاد کنندۂ فرانس والٹیئر کے سوانح حیات جو اس کی حق کوشیاں اور بہادریاں اہل ہند کے لئے خصوصاً شمع ہدایت ہوں گی۔ اس لئے تاریخ سلطنت کے چند اوراق پیش کرتا ہوں۔

آج کل جو حالت زار ہندوستان کی ہے۔ ویسی ہی کسی نہ کسی وقت ہر ملک کی رہی ہے۔ جب مظالم حد سے تجاوز کر جاتے ہیں تو خود حکومت کی سختیاں شعلہ فگن ہو کر اپنے خرمن میں آگ لگا دیتی ہیں۔ یہی زار کی استبدادیت سے روس میں ہوا۔ یہی انگلستان میں ظاہر ہوا۔ اور یہی فرانس کی حالت ہوئی۔ تمام آزاد اقوام کی آزادیاں خون کے بہتے ہوئے دریا سے گذرنے کے بعد حاصل ہوتی ہیں۔ اٹھارویں صدی میں فرانس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ہر فرانسیسی اپنے ملک میں قیدی تھا۔ حکومت کی سختیاں ناقابل برداشت تھیں یہ وہ زمانہ تھا جب مذہب کے نام پر ہزاروں دار پر چڑھا دئے گئے۔ یہ وہ دور تھا جب آزاد خیالی کی سزا موت تھی۔ فرانسیسی صرف اس جرم میں قید کر لئے جاتے تھے کہ ان کے خیالات شاہی مذہب سے ذرا مختلف ہیں زبان کھولنا دشوار تھا۔ قلم اٹھانا کسی ادیب کو اسیری کی شکل دکھا سکتا تھا فرانس کے ہر باشندے کے لئے قانون میں برائے نام بھی مساوات نہ تھی۔ مذہب اور حیثیت کے لحاظ سے قانون کا اطلاق کیا جاتا تھا۔ دفعتاً ان مظالم کے تازیانوں سے عاجز آکر قوم چیخ اٹھی شہری حقوق حاصل کئے۔ قانون کے سامنے مساوات حاصل کی۔ تقریر و تحریر سے پہرے اٹھوائے گئے۔ وہ شخص جس نے اپنی مسلسل کوششوں سے فرانس کو اس منزل آزادی پر لا کھڑا کیا۔ وہ والٹیئر تھا۔ والٹیئر نے صرف اپنی قوت بازو سے سیکڑوں کی تعداد میں کتابیں لکھ کر اپنے اہل وطن کو انقلاب کے لئے تیار کر دیا۔ اس کی کتابیں نذر آتش ہوئیں۔ خود

اسے سزائیں دی گئیں۔ جلاوطن کیا گیا۔ لیکن اس نے انقلاب کی تخم ریزی کردی۔ اور اپنی زندگی میں اس پودے کو پروان چڑھتے دیکھ لیا۔

فرانس کے اس جوانمرد نے ۱۶۹۴ء میں عروس البلاد پیرس میں دنیا کی فضا میں پہلی سانس لی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ کمزور اور نحیف بچہ فرانس کا باہمت آزاد کنندہ ہوگا۔ والدین کو اس کے جینے ہی کی امید نہ تھی۔ لیکن وہ زندہ رہا اور فرانس کے پایہ تخت کو ہلا کر اپنی مردہ قوم میں تازہ روح پھونک دی۔ چوراسی سال تک متواتر اس فرد کی جسمانی نقاہت اور قلبی قوت میں جنگ ہوتی رہی۔ والٹیئر کے جسم و جان میں باہم یوں نبرد آزمائی رہی اور وہ خود حکومت کی استبدادیت سے پنجہ آزما رہا۔ اس کے والدین متوسط الحال تھے۔ والد کی حال تک کامیاب بیرسٹر تھے۔ انہوں نے اپنے اس نونہال کا نام "اروے" رکھا۔ ابھی زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا کہ ماں کا سایہ سر سے اُٹھ گیا لیکن شفقت مادری کی جھلک آغوش ہمشیر میں ملتی رہی۔ بڑی بہن نے ماں کی طرح پرورش کی۔ اس زمانہ میں فرانس کا مذہب کیتھولک تھا۔ زمانہ واقف ہے کہ مسیحی مذہب کی یہ دو شاخیں یعنی پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک باہم مدتوں دست و گریبان رہے آئے دن خون کی ندیاں بہتیں بادشاہ کا منظور نظر مذہب رومن کیتھولک تھا اس لئے حکومت اپنی گرفت کو مضبوط کرنے اور فرانس کو پروٹسٹنٹ مذہب کی طرف جانے سے عنان گیر ہونے میں تلوار و تفنگ سے کام لے رہی تھی اسکے والد بھی سرکاری مذہب کے خلاف تھے لہذا فرانس کیلئے کافر تھے انکا مذہب انکو سادہ لباس پہننے اور تعیش پسندی سے نفرت کرنے کی تعلیم دیتا تھا اس طریقۂ زندگی نے مزاج کو سخت کر دیا چہرہ کی شکن سخت مزاجی کا ثبوت دیتی رہتی لیکن اس کے بیٹے نے بڑھکر اپنی ہمت کا یہیں سے ثبوت دیا اور گھر ہی سے اختلاف شروع ہوگئے۔

اروے" تعلیم کی غرض سے کالج بھیج دیا گیا اسنے لوئی لے گرینڈ نامی کالج میں رہ کر تاریخ پڑھی ادب کا مطالعہ کیا اور ابھی سکول ہی میں تھا کہ شاعری نے اپنی طرف راغب کر لیا نظمیں لکھنی شروع کیں اور باوجود نو آموزی کے مقبول ہوئیں۔ ہمارے ملک کے شعرا اور ادباء کے لئے والٹیئر کی زندگی فی الواقعہ شمع راہ ہدایت بن سکتی ہے۔ اس شاعر نے اپنے فن سے کام لیکر فرانس کو آزاد کرا دیا۔ کھیل کود۔ لہو و لعب سے نفرت تھی۔ اور شاید یہی ترکۂ پدری رہا ہو۔ لیکن طالب علمی کی زندگی زیادہ مرغوب نہ تھی۔ ادب کا ذوق تھا شعر و شاعری کا شوق تھا۔ والد کی تاکید تھی کہ لڑکا قانون پڑھے۔ لہذا مجبوراً تعلیم جاری رکھی لیکن کہاں تک۔ آخر سلسلہ منقطع ہو گیا اور باپ کی مراد پوری نہ ہوئی۔

زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ ابھی حکومت کی نگاہ نیک "اروے" پر تھی۔ سفارت خانہ سے متعلق کر کے اسے بمقام "ہیگ" بھیج دیا گیا۔ یہاں اسے موقع حاصل تھا جس کے لئے لوگ تمنا کرتے ہیں "اروے" اگر چاہتا تو ملک کا بہترین مدبر ہو سکتا لیکن کاتب قدرت نے کچھ اور لکھا تھا۔ نام ہوا لیکن حکومت کا حمایتی بن کر نہیں بلکہ باغی بن کر۔ یہاں حکومت اس جوانمرد سے اپنے لئے کام لینا چاہتی تھی اور فطرت کاتب تقدیر کے اشاروں پر اپنا رنگ جما رہی تھی۔ بھرپور جوانی۔ شباب کا خون۔ وحشت کے سامان فراواں نتیجہ یہ ہوا کہ اس فتنہ سامانی نے سفارت خانہ سے بہزار رسوائی نکلوا دیا۔ ایک جلاوطن ہیوگناٹ مذہب کی عورت کی کافرانہ اداؤں نے اُسے ذلیل کر دیا۔ وہ محبت ہی نہیں جس میں کہ رسوائی نہ ہو ایسے مذہب والی عورت سے محبت کرنا حکومت کے نزدیک جرم تھا۔ لیکن محبت ان قوانین مردم ساختہ کیطرف نگاہ اعتنا نہیں کرتی "اروے" متہم ہو جانے کے بعد سزا کا مستحق تھا لیکن قانون کی گرفت سے نکل بھاگا۔ سوختہ سامانی کے اسباب مہیا ہو گئے۔ چند احباب نے پناہ دی اور اپنے یہاں مقیم کر لیا یہ تمام احباب آزاد خیال تھے۔ اس فضا نے اس نوجوان کو اور بھی غیر محکم بنا دیا۔ ریجنٹ کے خلاف ایک نظم میں زہر اُگلا۔ حکومت نے قید خانہ میں بند کرا دیا لیکن محمد علی مرحوم اور حسرت موہانی کی طرح جیل میں ادبیات اور شاعری کا سلسلہ جاری رکھا۔ جیل کی چہار دیواری میں محبوس رہ کر ہنری چہارم پر ایک نظم لکھی جس کا نام "ہنریڈ" رکھا جیل سے نکل کر مشہور کتاب "اوڈیپس" لکھی جس نے بہترین اُدباء اور نقاد سے خراج تحسین حاصل کیا۔ ڈرامے لکھنے شروع کئے اور حکومت کے مظالم کی تصویر کھینچنی شروع کیں اس زمانہ میں تھیٹر کا اسی قدر زور تھا جس قدر آج سینما کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی حقیقت نگاری میں وہ جادو تھا کہ پیا۔

خود پولیس کا افسر اعلیٰ تھیٹر ہال میں مناظر اور مکالمہ سے اس قدر متاثر ہوا کہ اشک جاری ہوگئے۔ اس کی تحریر خود مظالم پر تازیانہ لگاتی۔ فرانس اسکے وجود سے متجلی ہوگیا لیکن حکومت نے اس کی یوں قدر کی کہ گو اس کا جسم نہ جل سکے لیکن اس کی کتابیں جلا کر بھڑاس نکال لی۔

اس زمانہ میں حکومت سرمایہ داروں کی بیحد حمایتی تھی۔ ایک خاندانی رئیس جس کا نام "روہن" تھا۔ اس نوتیر کے سامنے آیا اور امارت آمیز طریقہ سے پیش آیا۔ "اروتے سے برداشت نہ ہوسکا اس نے فوراً دندان شکن جواب دیا اور اپنا نام بدل کر والٹیئر رکھ لیا۔ آج دنیا میں بہت کم لوگ ہوں گے جو والٹیئر کے اصلی نام سے واقف ہوں گے"۔ اروئے اس وقت سے والٹیر ہی کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ ممکن ہے آپ اس مختصر اور پوچ واقعہ کو زیادہ اہمیت دینے کے لئے تیار نہ ہوں آپ یہ سمجھتے ہوں کہ کسی بڑے آدمی کو جواب دینا کوئی غیر معمولی بات نہیں لیکن آپ شاہی کا زمانہ تصور میں لائیے۔ جب کسی شاہزادے یا شاہی خاندان والے کو درشتی کے ساتھ جواب دینا کتنا بڑا جرم ہوسکتا تھا۔ آپ اس مختصر سے واقعہ سے خیال کیجئے کہ وہ کیسا زمانہ رہا ہوگا۔ جب ایسا معمولی سا واقعہ بھی مؤرخین کے نزدیک تاریخ کے صفحات کے قابل سمجھا گیا۔ اس سے حکومت کی استبدادیت کا اندازہ کیجئے۔ اکثر ایسے ہی چھوٹے چھوٹے واقعات بعض صاحب دل ہستیوں کے انقلاب کا باعث ہوکر ملک میں انقلاب عظیم کا سبب بن جاتے ہیں۔ ہندوستان میں یورپین حضرات کے لئے مخصوص گاڑیوں کی موجودگی یا ریلوں کے ڈبوں پر "خاص یورپین کے لئے" کی تختی اکثر قلوب پر زخم کاری لگاتی ہے بالکل اسی طرح جیسے مدراس میں اچھوت اقوام کے لئے چند مخصوص راستوں پر چلنے کا حکم برہمن پرست مذہب کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ بہرطور والٹیئر دندان شکن جواب دینے کے بعد آرام سے نہ رہ سکا۔ چند یوم بعد اس رئیس کے خادموں نے والٹیئر کو بے رحمی سے زدوکوب کیا۔ والٹیئر نے پولیس زدہ عدالتوں میں دادخواہی کی لیکن ذی اثر حضرات کے لئے وہاں قانون دوسرا تھا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس نے ملک و زمانہ کے رواج کے مطابق باہمی مبارزت سے تصفیہ چاہا لیکن بزدل رئیس تیار نہ ہوا۔ اس نے والٹیئر کو قید کرا دیا۔ اور ۱۷۲۶ء میں اسے جلاوطن کرا کے انگلستان بھیجدیا۔ وطن پرست روح وطن کی دشمن سمجھی گئی۔ لیکن جس کی زندگی کا مقصد فرانس کی آزادی ہوگیا ہو وہ کہیں بھی رہے آزاد ہے اور آزادی کنندہ بھی

انگلستان کی حالت فرانس سے کسی قدر بہتر تھی اس نقصان والٹیئر کو مزید قوت دی۔ انگلستان نے والٹیئر کو تین سال اپنے یہاں رکھا اس عرصہ میں والٹیئر نے انگریزی زبان میں مہارت حاصل کی۔ نیوٹن کو پڑھا۔ فلسفہ کا مطالعہ کیا۔ اور اپنی تحریر سے توہمات اور استبدادیت کے خلاف جنگ کرتا رہا لیکن اس کی کتابیں صرف خفیہ طریقہ سے خریدی اور پڑھی جاسکتی تھیں۔ ملک میں ان کا داخلہ ممنوع تھا۔ آج ہندوستان میں بھی جیسیوں کتابیں داخل نہیں ہونے پاتیں۔ حالانکہ آزاد اقوام ان کو آزادی کے ساتھ پڑھتی ہیں لیکن بہرحال کتابیں فرانس میں پہنچتی ہی رہیں کتابیں بھی نذر آتش ہونے سے بچتی رہیں۔ اور خود والٹیئر بھی مظالم سے بچتا رہا۔ دفعتاً والٹیئر کو خیال ہوا کہ شاید اس کی آزادی سلب ہونے والی ہے۔ یقین ہے کہ گرفتار ہوجائیگا اس لئے وہ سامنے سے بھاگ گیا۔ لیکن یہاں وہ اپنے شباب کی ولولہ انگیزیاں ساتھ لایا۔ ایک خاتون کے دام محبت میں گرفتار ہوگیا۔ اس خاتون کا نام "ایملی" تھا۔ ایملی کی رعنائیاں والٹیئر کو سولہ سال تک اپنا پجاری بنائے رہیں اور والٹیئر اس کی محبت کی دل آویزیوں میں سرمست رہا اب وہ دولتمند تھا۔ غیر ملکوں کی حالت ہندوستان کی سی کبھی نہیں رہی یہ تو صرف ہندوستان کے شاعر و ادیب کس مپرسی کے عالم میں پڑے رہتے ہیں۔ والٹیئر کی کتابوں نے والٹیئر کو مالدار بنا دیا اور اس کی زندگی خوشحالی سے گذرنے لگی۔ اس نے اپنا روپیہ ٹھیکیداروں کی ایک فرم میں لگا دیا۔ مُن برسنے لگا۔ دولت کی فراوانی ہوگئی۔ یہاں تک کہ جرمن شاہزادوں اور رئیسوں کو قرض دینے لگا۔ باوجود زر و جواہر کی بارش کے اپنا ادبی مشغلہ جاری رکھا اسی زمانہ میں لوئی چہاردہم کی صدی کے نام سے وہ تاریخ لکھی جو آج تک معیاری کتاب سمجھی جاتی ہے:

ان ادبی خدمات کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ۱۷۴۶ء میں اکیڈمی کا ممبر منتخب ہوگیا لیکن انقلاب پسند مزاج نے فرانس میں بہت دنوں نہ رہنے دیا قلمی جہاد نے ملک بدر کر دیا۔ مگر والٹیئر نے اس وقت تک وہ ذاتی اقتدار حاصل کر لیا تھا کہ کسی کو اس کی دوستی میں کسر شان نہ محسوس ہوتی۔ پروشیا کا بادشاہ فریڈرک اس کا ذاتی دوست تھا اور برابر تبادلہ خطوط ہوتا رہتا تھا والٹیئر

اپنے ملک سے نکل کر چار ماہ تک فریڈرک کا شاہی مہمان رہا۔ اپنے ملک کا باغی دوسرے ملک کے بادشاہ کا دوست تھا۔ ہر چند کہ والٹیئر کے ڈرامے واشعار اور تصنیفات مقبول عام تھیں۔ لیکن پولیٹکل دنیا میں والٹیئر ہمیشہ ناکام رہا۔ اور کسی سلطنت کی مدد نہ کر سکا۔ اس نے دنیا پر روشن کر دیا کہ اس کے سے مزاج کے لئے پالیٹکس میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ دماغ صداقت پسند تھا اور پالیٹکس کی جعل سازیاں اور گندگیاں مزاج کے موافق نہ تھیں اس لئے اس نے مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے کو خدمت قوم و خلق کے لئے مخصوص رکھا اس کے استقلال عزم کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ اس زمانہ میں "مرکز محبت" ایملی کی نگاہیں اس کی طرف سے پھر گئیں اور اس نے اپنی توجہ کا مستحق ایک دوسرے شخص کو قرار دیا۔ اس تعلق نے ایملی کو مادریت کی منزل تک پہنچا دیا۔ لیکن والٹیئر کے دل میں وہی محبت باقی تھی۔ ایملی نے ۱۷۴۹ء میں زچہ خانہ کے صدمات سے انتقال کیا۔ لیکن والٹیئر پروانہ کی طرح شمع کشتہ کے سرہانے آنسو بہا رہا تھا۔ اور اپنی غیر فانی محبت کا ثبوت دے رہا تھا اس "مایۂ محبت" کے فنا ہو جانے کے بعد ۱۷۵۰ء میں والٹیئر فریڈرک کے دربار میں رہنے لگا۔

عمر زیادہ تجاوز کر چکی تھی۔ اسے خواہش ہوئی کہ کہیں سکون کے ساتھ عمر کا آخری حصہ گذارنے کے لئے کوئی مکان خرید لیا جائے۔ وطن میں سکون نصیب نہ ہونا۔ جنیوا کی فضا نے اپنی طرف کھینچا کوٹھی خرید لی۔ اور اہل جنیوا میں گھل مل گیا۔ بڈھوں اور بچوں سے اخلاق و محبت سے پیش آیا۔ فراخدلی کے ساتھ سلوک اور ہمدردی کی اپنے حسن اخلاق سے ہر ایک کو اپنا گرویدہ کر لیا۔ یہاں تک کہ اہل جنیوا اُسے بزرگ سمجھنے لگے۔ اس زمانہ میں فرانس میں مذہبی مظالم انتہائی نقطہ پر پہونچ چلے تھے رومن کیتھولک فرقہ اپنی تنگ خیالی اور ستم رانیوں کی وجہ سے حجاج بن یوسف ہو رہا تھا۔ ۱۷۶۲ء ایک ایسے واقعہ کے لئے فرانس کے طول و عرض میں یادگار ہے جس نے والٹیئر کے قلمی جہاد کی وجہ سے رومن کیتھولک مذہب کی بنیادیں کھوکھلی کر دیں۔ فرانس میں پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے لئے باوجود پیرایۂ تعلیم سے آراستہ ہونے کے کسب معاش کے لئے کوئی راستہ نہ تھا۔ چنانچہ "کیلاس" ایک پروٹسٹنٹ کے ایک نور نظر نے بے روزگاری سے عاجز آ کر اپنے کو پھانسی لگا دی اور ہلاک کر ڈالا۔

بیٹا سمجھا تھا کہ جان دیکر خاندان کے سر سے عذاب کم کر دیگا لیکن سرکاری عمال کچھ اور سمجھے۔ باپ پر عزیز بیٹے کے قتل کا الزام لگا دیا گیا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ لڑکا مذہب تبدیل کرنا چاہتا تھا لیکن پروٹسٹنٹ باپ نے پسند نہ کیا۔ اور قصہ تمام کر دیا کیس گرفتار کر لیا گیا مقدمہ چلا۔ ثبوت گذرا ایسا ہی ثبوت جیسا ہندوستان میں تلاش کر کے پولیس مہیا کر لیتی ہے اور سزایاب کرا دیتی ہے۔ عدالت نے مجرم قرار دیا۔ حکم ہوا کہ مجرم بڑے گرجے کے سامنے منظر عام پر عبرت کے لئے دو گھنٹہ کھڑا رکھا جائے۔ اس کے بعد اس کے جسم کو پہیہ پر لپیٹ کر کھینچا جائے اور ہڈیوں کے جوڑ جوڑ کو علیحدہ کیا جائے۔ اگر اس کافر کی جان اب بھی نہ نکلے تو اس کو پھانسی دیدی جائے اور نجس لاش کو لپکتے ہوئے شعلوں میں پھینک دیا جائے یہ اس عیسائی مذہب کی کارگزاریاں ہیں جس کے پیغمبر نے ان کو حکم دیا تھا کہ اگر کوئی ایک طمانچہ ایک رخسار پر رسید کرے تو تم اپنا دوسرا رخسار اس کے سامنے کر دو یہ اس کے پیرووں کے افعال تھے۔ جو رحم کی تعلیم دے گیا تھا۔ جو آج بڑے رحمدل اور آزاد خیال بنتے ہیں۔ جس کے مشن اسلام کے مقولہ "لا اکراہ فی الدین" کو بھول کر اسلام کے خلاف آتش فشانیاں کرتے ہیں۔

والٹیئر ان واقعات سے جنیوا ہی رہ کر آشنا نہ تھا۔ حکومت کے ان مظالم سے دل کانپ گیا۔ وطن کے درد نے بیچین کر دیا۔ مجاہدہ شروع ہوا۔ موقع شناس والٹیئر جانتا تھا کہ آج فتح اس کی ہے۔ ورنہ کبھی نہ ہوگی۔ نہ صرف قلمی جہاد کیا بلکہ ہر ممکن کوشش کی یہاں تک کہ پبلک کے خیالات میں ہیجان ہوا۔ لوگ حکومت سے بدظن ہو گئے اور یہ ایک چھوٹا سا واقعہ جو کم و بیش ہر ملک میں برابر ہوا کرتا ہے۔ پادریوں کے وقار کو پامال کرنے کا باعث ہو گیا کیلاس اپیل سے بری ہو گیا اور والٹیئر اپنی قوم کا ہر دلعزیز رہنما قرار دیدیا گیا۔ قوم نے قدر کی۔ بچہ بچہ کی زبان پر والٹیئر کا نام تھا۔ والٹیئر نے موقع شناسی سے کام لیتے ہوئے اپنے تازیانوں کو اور تیز لگایا۔ متعدد کتابیں پادریوں اور مذہب کو بدنام کرنے والوں کے خلاف لکھ ڈالیں اور کیلاس کی طرح متعدد دیگر افراد کو موت کے پنجے سے چھڑا لیا۔ جیسے جیسے موت کی سزا پائے ہوئے مجرم بیگناہی کی سند پا کر عدالتوں سے رہا ہوتے رہے۔ والٹیئر کا نام

روشن تر ہوتا گیا اور نتیجہ تو صرف اس جرم پر گردن زدنی اور لقمۂ آتش بننے کی سزا پا چکے تھے۔ کہ اتفاقاً صلیب کے نشان کو ان کے ہاتھوں صدمہ پہونچ گیا تھا۔

غرض والٹیئر نے مذہب کی ناروا تنگ نظری کے خلاف جہاد جاری رکھا۔ اوہام پرستی کے خلاف آواز بلند کی۔ اس کا ایمان تھا کہ خدا نے خود انسانی جسام کے اندر ایک آواز رکھی ہے جو بد اعمالیوں اور اخلاق سوزیوں کے وقت ہدایت کرتی ہے اس آواز کو فی زمانہ ضمیر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور یہی ضمیر خود ایک شے ہے جو اسلام پر حکمران ہو کر انسان کو نیکی کی طرف راغب رکھتی ہے لیکن بعد ازاں اس کے خیالات میں قدرے تبدیلی ہوئی وجود ایزدی کو مانتے ہوئے اسکو یقین ہو گیا کہ ضمیر کی تنہا آواز کچھ نہیں کر سکتی۔ خدا کا بھی ہاتھ کہیں نہ کہیں ضرور نظر آجاتا ہے اور وہ انسان کو اس کے افعال کی سزا دیتا رہتا ہے۔ چنانچہ زلزلہ یا دیگر آفات ارضی وسماوی کی یہی وجہ ہے۔

غرض والٹیئر اسی طرح تلاش حق میں سرگرداں رہا اور اپنے قلم سے تیشۂ فرہاد کا کام لے کر جلا وطنی کی حالت میں زندگی کی گھڑیاں کاٹتا رہا ۱۷۷۸ء میں فضا قدرے موافق پائی اور وطن کی خدمت کے لئے پیرس گیا۔ لیکن والٹیئر اب گمنام نہ تھا۔ واپسی ایک شاندار جلوس کی شکل میں ہوئی۔ اہل وطن نے مادر وطن سے بچھڑے ہوئے سپوت کی قدر کی۔ خلایق کا ہجوم لگ گیا۔ ہر ایک نے عقیدتمندی کا اظہار کیا۔ مسلسل مجمع نے فلک بوس نعروں سے استقبال کیا۔ اکیڈمی نے والٹیئر کو اپنا صدر منتخب کیا۔ لیکن یہ تمام شادمانیاں اس کمزور جثہ کے لئے بہت تھوڑی ثابت ہوئیں۔ اکیڈمی اور ملک کی خدمت میں مصروف تھا کہ داعی اجل کو لبیک کہنا پڑا۔ ملک کا سچا خادم۔ قوم کا حقیقی رہنما۔ فرانس کا آزاد کنندہ وطن پر جان نثار کر چکا۔ اب مذہبی پادریوں کی باری تھی۔ والٹیئر کو خوف تھا کہ اس کی لاش کے لئے آگ کی سزا تجویز کی جائے گی۔ اور یقیناً ایسا ہی ہوتا۔ لیکن چند ہمدردوں نے خفیہ طریقہ سے اس معروف ہستی کو ایک غیر معروف مقام پر پہونچا دیا۔ اور وہیں لحد کی آغوش میں دے دیا۔ قومی وقار کو بلند کرنے والا والٹیئر بغیر کسی قومی اعتراف خدمت کے تنگ گور میں سلا دیا گیا۔ لیکن بہرحال اس جسم مردہ کی تذلیل کرنے کا موقع حکومت کو نہ مل سکا اور والٹیئر کی روح اس ابدی تکلیف سے بچ گئی۔

تیرہ سال گذر گئے جن بیجوں کو والٹیئر نے بویا تھا ان سے کلے پھوٹے۔ پودے نکلے۔ سرسبز درخت ہوا۔ گل مراد کھلا۔ ثمر انقلاب پیدا ہوا۔ حکومت تہس نہس ہو گئی۔ انقلاب پسند جماعتوں نے اپنے رہنما کی عزت کی۔ والٹیئر کی میت کو باحترام تمام گمنام قبر سے نکالا۔ پیرس لائے۔ لاش اٹھی جلوس نکلا۔ کیلس اب زندہ نہ تھا۔ لیکن اس کی دو لڑکیاں سیاہ لباس میں ملبوس جلوس کے آگے آگے اپنے مرحوم باپ کو حیات تازہ دینے والے کی یاد تازہ کرنے کی غرض سے رواں تھیں۔ اور سوگوار مجمع تابوت لئے جا رہا تھا۔ راستہ میں وہ قید خانہ جہاں والٹیئر قید کیا گیا تھا۔ قید خانہ مسمار ہو چکا تھا۔ لیکن جب اس عمارت کا پرانا قیدی پاس سے گذرا جلوس رکا منظم و خاموش مجمع نے توقف کیا۔ تابوت نیچا کر دیا گیا تاکہ اس عمارت کے دیرینہ باشندہ کو اس کا منظر دکھا دیا جائے نہ قیدی رہا نہ قید خانہ۔ لیکن اسیری کا افسانہ تاریخ کے صفحات پر تحریر ہے۔ والٹیئر بالآخر اپنی نئی قبر میں آخری بار اتارا گیا۔ قید خانہ "بیسٹیل" کے ملبہ میں ایک کتبہ تحریر ہے

"اس کے قیدی نے ہم کو آزادی کے لئے تیار کر دیا"۔

والٹیئر کی خدمات نہ صرف فرانس کے لئے قابل قدر ہیں۔ بلکہ اس نے اپنے کار ہائے نمایاں سے دنیا کی زریں خدمات کی ہیں۔ دنیا نے بہت سے اوراق پلٹے اور بہتیرے افراد پیدا کئے لیکن والٹیئر نے اس زمانہ میں آواز بلند کی جب کسی میں ہمت نہ تھی کہ زبان کھولے والٹیئر کا جسم خاکی عناصر میں مل چکا ہے۔ لیکن اس کی روح دنیا میں نگراں ہے اور اب بھی صدائے حریت بلند کرتی ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

شمع بدست

..... کو باغ میں دیکھ کر

ایک بیحد کیف آور و رنگین نظم

(از حضرت الطاف مشہدی)

ہو رہا تھا گم شفق زاروں میں مہرِ آبدار
آ رہا تھا شام کی دیوی کے جوبن پر نکھار

مسکراتے تھے ستارے آسماں پر اِس طرح
رات کو ترسی ہوئی آنکھوں میں آنسو جس طرح

نزہتوں پر بانکپن تھا، مست جھونکوں پر شباب
ذرّہ ذرّہ پی رہا تھا دید کی میٹھی شراب

مسکراہٹ تھی لبِ فطرت پہ آنکھوں میں خمار
پھر رہی تھی نیند کی دیوی ہواؤں پر سوار

غنچہ غنچہ باغِ ہستی کا تبسّم ریز تھا
گلشنِ اُمّید کا ہر پھول عنبر بیز تھا

ایسے عالم میں روش پر دفعتاً کچھ بجلیاں
آکے میرے سامنے لینے لگیں انگڑائیاں

اُن میں اک کافر ادا عذرا جسے کہتی تھیں وہ
جس کے پیچھے خادماؤں کیطرح رہتی تھیں وہ

مسکرائی دیکھ کر میری طرف کچھ اِس طرح
آسماں پر برقِ بے آواز کوندے جس طرح

دیکھکر میری تمنّائیں جواں ہونے لگیں
حُسن کے مخمور جلووں میں مجھے کھونے لگیں

دل نے دی آواز الطاف حزیں جاتا ہوں میں
اب ترے سینے کو اس قابل نہیں پاتا ہوں میں

تھر تھرائے ہونٹ، آنسو آنکھ سے بہنے لگے
درد کے خنجر جگر کے کان میں کہنے لگے

آج سے کرتے ہیں ہم ایوانِ حسرت میں قیام
سونپتے ہیں سوزشِ پیہم کو تیرا انتظام

کامیاب وکیل

ایک بالکل سچّی المناک داستان

از محترمہ اے۔ ایس بیگم صاحبہ

(۱)

جب میں پہلی مرتبہ اپنی سسرال جانے لگی تو شدت تاثر سے بے حال تھی۔ حالانکہ مجھے مہینوں پہلے سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ میں عنقریب ان چاہنے والے ماں باپ محبت کرنے بھائی بہن اور عزیز رکھنے والے کنبے سے رخصت ہو جاؤں گی۔ پھر بھی آج مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا مجھے اِس کا کبھی علم ہی نہ تھا والدہ صاحبہ نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا "بیٹی یہ کوئی نئی بات تمہارے ساتھ نہیں ہوئی، بلکہ دنیا میں سبھی لڑکیاں ایک دن، اسی طرح رخصت ہوتی رہی ہیں اور رہیں گی، تم ہم لوگوں سے جدا ہو کر اُس کے ساتھ جا رہی ہو۔ جو اب تمہارا ہو چکا ہے۔ اس نے زندگی بھر تمہارا ساتھ دینے کا اقرار کر لیا ہے۔ جسطرح وہ خود ایک "کامیاب وکیل" ہے اسی طرح ہم کو قوی امید ہے۔ کہ اس کا اقرار بھی ضرور کامیاب اقرار ہوگا"۔

غرضیکہ میں زار و نالاں اسٹیشن پہونچی بمبئی جانا تھا، سیکنڈ کلاس کے درجے میں ایک طرف بٹھا دی گئی جب گاڑی نے آخری سیٹی دی اور اس میں جنبش ہوئی تو میں نے اپنے پیارے وطن کو جس کی خاک کا ذرہ ذرہ اس وقت مجھے از حد عزیز معلوم ہو رہا تھا۔ دیکھنے کے لئے کھڑکی سے جھانکا۔ پلیٹ فارم پر میرے باپ۔ بھائی اور دوسرے رشتہ دار جو مجھے رخصت کرنے آئے تھے کھڑے ہوئے تھے، ملول، محزون، سب کی آنکھیں میری کھڑکی کی طرف اُٹھی ہوئی مجھے ڈھونڈھ رہی تھیں۔ جب میں نے ان کو دیکھا تو دل بے اختیار ہو گیا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ اور جب تک میں انکو دوبارہ دیکھنے کی کوشش کی۔ گاڑی کی رفتار تیز ہو چکی تھی اور پلیٹ فارم نظر سے اوجھل۔ میں چند سکنڈ تک بے معنی انداز سے کھڑکی کے باہر آسمان کو تاکتی رہی، پھر ایک ٹھنڈی سانس میرے دل کی گہرائیوں سے نکلی اور آنسو کے چند موٹے موٹے قطرے آنکھوں سے ٹپک پڑے۔ جب میں گھر سے چلی تھی تب بھی بیقرار تھی اس بیقراری میں بھی اپنایت تھی۔ اپنے جذبات کے اظہار میں ایک ایک سے ملکر بے تکلف رو رہی تھی۔ اب بھی بیقراری تھی۔ مگر اب میں تبدیل ہو چکی تھی اپنایت کی جگہ اجنبیت نے لے لی تھی۔

دیر تک میں کھوئی ہوئی سی دم بخود بیٹھی رہی۔ میں ایسی جگہ جا رہی تھی جہاں میرا کوئی نہ تھا، وہاں میرا کوئی نہیں میں نے سوچا۔ مگر اماں کے وہ الفاظ یاد آگئے "جو اب تمہارا ہو چکا ہے، جس طرح وہ ایک کامیاب وکیل ہے۔ اس کا اقرار بھی کامیاب ہوگا" یہ جملہ کانوں میں گونج گیا، "کامیاب وکیل" اور اُس کے "کامیاب اقرار" کے تصور سے عجیب فرحت اور سکون میرے اضطراب پر چھا گیا۔ خیال نے اس کو میرے سامنے کھڑا کر دیا۔ مجھے محسوس ہونے لگا، جیسے کوئی اپنے معطر رومال سے میری آنکھیں پونچھ رہا ہے میرے رونے کا مذاق اُڑا رہا ہے، جیسے کسی کی مقناطیسی انگلیاں میرے منتشر اور بے ترتیب بالوں کو درست کر رہی ہیں۔ میرے سر کا درد اور دماغ کی تھکن مٹا رہی ہیں مترنم اور نامعلوم نغمے میرے کانوں میں گونجنے لگے اور میں انہی احساسات میں جذب ہو کر رہ گئی۔

بوا نے دوشالہ میرے اوپر ڈالتے ہوئے کہا "شاید دولہا میاں آگئے ہیں"۔ یکدم میں اپنے مسرور کن تخیل سے چونک پڑی۔ گاڑی کی رفتار سست ہو کر اسٹیشن کے آنے کی اطلاع دے رہی تھی۔ "وہ آتے ہونگے" اِس خیال سے میرا دل سینے کے اندر دھک دھک کرنے لگا۔ گاڑی رُک گئی

نئی تو آتے ہی چلتے آئی کھانا آیا، کھلانے پلانے کی تاکید کرنے والے آئے مگر وہ نہ آئے جن کا انتظار تھا۔ نہ معلوم کیوں میرا دل ڈوب سا گیا۔ کئی اسٹیشن آئے اور گذر گئے وہ کسی پر بھی نہ آئے۔ ہر مرتبہ جب گاڑی ٹھہرتی تو میرا دل بلیوں اچھلنے لگتا۔ اور جب گاڑی چلتی تو مایوسی کی ایک نہایت سرد لہر میرے سارے جسم میں دوڑ جاتی۔ میں خواہ مخواہ تھک سی جاتی۔ خود بخود مضمحل ہو جاتی۔

(۲)

اسی اُمید و بیم میں وہ پہاڑی راستہ جو گھنٹوں پر مشتمل تھا دنوں میں تبدیل ہو کر کٹا مگر پر خدا جانے کیا کیا ہوا۔ سمجھ میں نہ آیا۔ مردہ بدست زندہ کا حال تھا، دوسرے دل تھا کہ آپ ہی آپ اُڑا جا رہا تھا۔ آخر کار رات آئی اور اپنے ساتھ میری قسمت کی تاریکیوں اور سیاہیوں کو بھی لے آئی خدا جانے کب اور کس طرح مجھے کمرہ میں پہونچایا گیا۔ اور وہاں میں نے کیا دیکھا۔ میرے معبود شاید کبھی یہ میرے وہم و تصور میں بھی نہ آیا تھا۔ سر پہ رومال باندھے بے حد اضمحلال و اضطراب کے ساتھ کوئی کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اس کا ایک ایک قدم جو اٹھتا تھا اس کی اُداسی اور افسردگی کا شاہد، اس کے رفتار کی ہر ہر جنبش، اس کے دلی انتشار اور بے چینی کی چغلی کھا رہی تھی وہ زبانِ حال سے صاف کہہ رہا تھا کہ اس ناگوار فرض کا بوجھ جبراً اس کے کاندھوں پر لاد دیا گیا ہے جو اس کے لئے ناقابل برداشت ہے میں دیکھ رہی تھی۔ مگر مجبور تھی، میں کر ہی کیا سکتی تھی۔

میرے سامنے ایک بالکل اجنبی تھا جو حد درجہ عزیز بنا دیا گیا۔ سینکڑوں زرین توقعات آناً فاناً اس کے ساتھ وابستہ ہو گئیں لاتعداد رنگین تصورات نے اس سے ملنے کا مشتاق بنا دیا۔ وہ ابتدا ہی اس ناگوار انداز سے کرتا ہے؟ جو زندگی کی تمام لطافتوں کا مرکز ہو وہ ملتے ہی اس طرح ٹھکرا دے؟ اس طرح پائمال کر دے؟ اے منصف خدا، یہ کس جرم کی تنبیہ ہے! اے رحیم و کریم مالک! کیا دل اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے لئے سینے میں رکھا گیا! کیا امنگیں اور خواہشیں مٹنے اور مٹانے کے لئے پیدا کی گئیں۔ خوشی اور مسرت شاید ان بے معنی الفاظ کا نام ہے جو میرے مقدر سے حرف غلط کی طرح مٹا دیئے گئے، اے بے نیاز پروردگار تو ہی بتا کہ آخر تو نے یہ کیسا فیصلہ کر دیا؟.....

سوچتے سوچتے میں بالکل بے جان ہو گئی۔ ذرا بھی سکت اور جنبش مجھ میں باقی نہ رہی، گویا جسم کی رگ رگ سے دم کھچ کھچ کر نکل گیا، اے کاش ایسا ہی ہو جاتا، اس زندگی سے موت بدرجہا بہتر ہوتی۔ میں خاموش تھی لیکن دل کے اندر شور محشر بپا تھا۔ آنکھیں بالکل خشک تھیں اور جسم کا رواں رواں خون کے آنسو رو رہا تھا۔

جب میں گھر سے چلی تب بھی بہت متاثر تھی بے تحاشہ رو رہی تھی جب گاڑی اسٹیشن سے چلی اس وقت پہلے سے زیادہ تاثر تھا۔ ایک ٹھنڈی سانس دل کی گہرائیوں سے نکلی تھی اور آنسو کے چند موٹے موٹے قطرے آنکھوں سے ٹپک پڑے تھے۔ اور اب جب میں شدید طور پر متاثر تھی، تو نہ میری آنکھوں میں ایک آنسو کا قطرہ تھا اور نہ سینے میں ہلکی سی آہ۔ مایوسی کی آگ نے میرا سب کچھ جلا کر بھسم کر دیا تھا، بدنصیبی کا سیلاب سب کچھ اپنے طوفانی تھپیڑوں میں بہا لے گیا تھا۔ میں ایک لاش تھی۔ جس کا تنفس جاری تھا۔ جس کی پتلیاں اپنے حلقوں میں بے چینی سے سرگرداں تھیں، اور کچھ بھی باقی نہ تھا چند گھنٹوں کے اندر مجھ میں کسی قدر تبدیلی ہو گئی۔ تاثر کے کتنے مرحلے میں نے طے کر لئے۔ میں سوچ رہی تھی، اس معاہدہ کو، زندگی کے اس اہم ترین اقرار کو دیکھ رہی تھی، اپنے جان و دل کے مالک کو، مہذب، تعلیم یافتہ، سوسائٹی کا قابل اور کامیاب وکیل، اس اہم اقرار کا کرنے والا، میٹھی نیند سو رہا تھا اور میں انگاروں پر لوٹ رہی تھی، خدایا! حوّا کے گناہ کی پاداش تو نے سب سے زیادہ حوّا کی "ہندوستانی بیٹیوں" کے لئے مقدر کی ہے؟ ان کو کس قدر بے بس بنا دیا ہے، آدم کے مایہ ناز فرزند! ایک طرف تو عورتوں کے حقوق دلانے کے ٹھیکہ دار بنتے ہیں۔ آزادیٔ نسواں کے دل سے حامی مانے جاتے ہیں، پھر بھی جب اپنا داؤں پڑتا ہے تو اس طرح ان کو اپنے اغراض کی خاطر برباد کر دینا بھی ان کے لئے موجب فخر ہوتا ہے؟

خدا معلوم کب تک میں اس حالت جانکنی میں مبتلا رہی۔

جب بتدریج حواس مجتمع ہونے لگے تو میں نے سوچا کہ شاید سویرا ہو گیا ہو۔ گھڑی دیکھتی ہوں تو ایک میں پانچ منٹ باقی تھے! اُفوہ! میرے خدا۔ اتنی دیر میں میرے اُوپر یہ قیامت گذر گئی۔ اس داستان کے پڑھنے والے میری تفصیلات سے اکتا گئے ہوں گے، کیا کروں، جذبات کی روانی قابو میں نہیں آتی۔ دل چاہتا ہے سینہ چیر کر صفحۂ قرطاس پر پھیلا

دوں اور اس میں جو زخم ہو گئے ہیں جو ناسور ہیں وہ ایک ایک کو دکھاؤں اور فریاد کروں کہ "آہ شوہرو" دیکھو! تمہاری لاپرواہی، تمہاری بے توجہی، تمہاری گمراہی بیویوں کے لئے کس قدر تباہ کن ہوتی ہے، اور اسی کے کارن اس طرح "زخموں سے پاش پاش کلیجہ لئے ہوئے" زندگی کے دن پورے کر رہی ہیں۔

(۳)

میری سسرال والے نہایت مہذب تعلیمیافتہ اور خوش حال تھے وطن میں کافی جائداد تھی بمبئی میں علاوہ رہائشی بنگلہ کے اور بھی کئی دکانات وغیرہ کرایہ پر اٹھی ہوئی تھیں جنکا معقول کرایہ ملتا تھا۔ ابا جان اخسر ٹھیکہ داری میں خوب کما چکے تھے۔ اور اب اُن کے بڑے صاحبزادے وکالت میں کما رہے تھے۔ اصغر نے اس سال ڈاکٹری کا امتحان پاس کر کے ایک سرکاری ہسپتال میں اپنی خدمات پیش کر دی تھیں جُنا ابھی پڑھ ہی رہی تھی۔ اور سچ پوچھئے تو یہ میرے لئے ایک دُرِ بے بہا تھی۔ اس کو نند کہنا تو کفران نعمت ہے۔ یہ تو میری مخلص سہیلی، میری اچھی بہن، میری ہمراز و دمساز تھی۔ عمر میں تقریباً ہم دونوں برابر تھے۔ اس لئے جلد آپس میں بے تکلف ہو گئے جُنا سے مجھے تھوڑے ہی روز میں معلوم ہو گیا کہ ان لوگوں کی خوشحالی دماجنوں کی رہین منت ہے۔ اس ظاہری چمک کے اندر گہری تاریکی اور اس مخمل کے غلاف کے نیچے تباہ کن قرضہ۔ ابا جان اور وکیل صاحب دونوں شہرت پرشیدا تھے۔ آمدنی کا بڑا حصہ اسی دیوی کی بھینٹ چڑھ جانا۔ سواری، مکان، فرنیچر، لباس کے علاوہ آئے دن کے قومی چندے، روز روز کی دعوتیں اور سب سے بڑھ کر الیکشن کے مقابلے نتیجہ خیز رہتا۔ امی کو ایک مقررہ رقم خانہ داری کے نام سے دیدی جاتی تھی لیکن ان کا یہ حال تھا کہ بعض مرتبہ دو، دو - تین تین مہینے تک یہ رقم بھی نہیں مل سکتی تھی یا تھوڑی بہت بمشکل ملجاتی پھر علاوہ خانہ داری کے اس میں جنا کی تعلیم، نوکر چاکر رکھ رکھاؤ، عزیز و اقارب کے تعلقات وغیرہ تمام خانگی اخراجات بھی شامل تھے پھر پوزیشن اور حیثیت کا سوال سب سے زیادہ مشکل تھا۔ امی بیچاری کسی نہ کسی طرح یہ بھرم نباہ تو رہی تھیں، مگر اخراجات کی کمی اور ضرورتوں کی زیادتی نے ان کو چڑچڑا اور کنجوس بنا دیا تھا۔ ان کے خیالات بھی پرانے تھے، ان کو طلق پسند نہ تھا۔ کہ لڑکے لڑکے اپنی پسند سے شادیاں کریں۔ ان کی اسی ذہنیت نے مجھے برباد کر ڈالا۔ کیونکہ وکیل صاحب جو بڑی حد تک آزاد تھے کسی ایکٹرس سے شادی کا وعدہ کر چکے تھے امی نے اس کی سخت مخالفت کرتے ہوئے بطور سد باب ان کی شادی کر دینا مناسب سمجھا۔ یہاں تک غنیمت تھا مگر انہوں نے تو غضب کر دیا جب وکیل صاحب نے صاف صاف کہدیا تھا کہ میں ہرگز اس عورت سے محبت نہیں کر سکتا جو میری مرضی یا پسند کی نہ ہو تب بھی انہوں نے نہ مانا۔ اپنے حقوق کا ناجائز دباؤ ڈال کر انہیں میرے ساتھ شادی پر آمادہ کیا۔ کس قدر ظلم ہے: ماں باپ کا اولاد کو اس طرح اس کی مرضی کے سراسر خلاف مجبور کرنا کتنی بڑی زیادتی ہے۔ ایک ایسے معاملہ اہم معاملہ کو اپنے اصرار سے غارت کر دینا۔ افسوس اور صد ہزار افسوس ہے ان ماں باپ پر جو ایسے معاملات میں زبردستی سے کام لیتے ہیں جو دوسروں کی ہلاکت کا باعث ہوا۔

لیکن وہ سعادتمند اولاد جو ایسے زبردستی کے احکام پر اپنا سر تسلیم خم کر کے خود تکلیف اٹھانے کی بجائے دوسروں کو مبتلائے مصیبت کر دے، کیا بے قصور ہو سکتی ہے؟ جو بات خود نہ کر سکے اس پر دباؤ سے راضی ہو کر دوسرے کو تباہ کرنا، کیا انصاف کہلائے گا۔ ایک چیز کو قطعی ناممکن جانتے ہوئے بھی اس کے قبول کرنے کا اقرار قتل عمد نہیں تو کیا ہے؛ وکیل صاحب کیا یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس پر عمل نہیں کر سکتے کیا ان کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ مجھے اپنے اغراض کی بھینٹ چڑھا دیں؟ کوئی جاہل مرد اس حرکت کا مرتکب ہوتا تو تعلیمیافتہ طبقہ اس پر دھاوا بول دیتا، اس کی یہ حماقت کرشمہ جہالت کے نام سے تعبیر کی جاتی، مگر کون کہہ سکتا ہے ایک نامور قابل اور معزز شخص کے خلاف، جو مظلوم ہے اس کی ماں نے اس پر ظلم کیا۔ جو مجبور ہے، اس لئے کہ اس کی مرضی کے خلاف شادی ہوئی، بے بس ہے اس وجہ سے کہ قبول کیا " کہہ کر ایک عورت کی قربانی دے چکا خطاوار ہوئی تو میں، قابل لعنت ہوئی تو میں، بدقسمت ہوئی تو میں کیونکہ میں عورت ہوں۔ میرا عورت ہونا ہی کیا کم ہے، میرے لئے یہ بھی فخر کی بات ہے کہ میں مہذب قدردان پڑی ہوئی وہ کلی ہوں جو کھلنے سے پہلے مرجھا گئی، میرا دیوتا! میری حق تلفیوں کی انتہا کرنے والا ایک کامیاب وکیل ہے جو اپنے زور قابلیت سے عدالت میں کھڑا ہو کر سینکڑوں کے حقوق دلاتا ہے، مجھے تباہ و برباد کرنے والا وہ ہے، جو ہزاروں کو اپنی ذہانت اور ہوشیاری سے تباہی و بربادی سے بچاتا ہے، اسی کا نام مقدر ہے!

(۴)

میری شادی کے تھوڑے عرصہ بعد اصغر کی شادی کا تقاضا ہوا۔ اس کی منگنی بچپن سے خالہ کی بیٹی سے ہوئی تھی اصغر کو اس رشتہ سے تامل تھا۔ لڑکی کی تعلیم و تربیت دیہات میں رہنے کے باعث بالکل نکمی تھی۔ صورتاً بھی اصغر کے لئے زیادہ موزوں نہ تھی لیکن ماں کا اصرار، خالہ کی مروت آخر اس کے تامل پر غالب آئی اور شادی طے ہوگئی۔ اصغر امی کی طبیعت سے خوب واقف تھا اور اچھی طرح جانتا تھا جس طرح وہ سب کام کیا کرتی تھیں، پھر میری زندہ مثال اس کی آنکھوں کے سامنے موجود تھی۔ وکیل صاحب کی بے نیازی کو وہ خوب سمجھ چکا تھا، اس لئے اس نے پہلے ہی طے کر لی کہ شادی خوب دھوم سے ہماری حیثیت کے مطابق ہو اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ شادی بھائی جان کی شادی کی طرح "ناگوار فرض" نہ ہوگی۔ اس کی اس پیش بندی اور مداخلت کی وجہ سے سب کچھ نہایت معقول ہوا جیسا کہ ہونا چاہئے تھا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے خدا گواہ ہے میں سچے دل سے خوش تھی، اصغر کی خوشی میری عین خوشی تھی۔ ذرا بھی حسد نہ تھا میری بدقسمتی سے میری شادی بالکل معمولی طرح ہوئی تھی، کوئی زیور میرے لئے نہ بنا تھا، کسی کا زیور بطور نمائش رکھ دیا گیا تھا۔ اور اس نامعقولیت سے مجھے اور میرے گھر والوں کو بے حد کوفت ہوئی تھی، میں اچھی طرح جانتی تھی اگر اس موقع پر حوصلہ سے کام نہ لیا گیا تو وہی حال ہوگا میں دل سے چاہتی تھی کہ اصغر کی شادی میں کوئی قابل اعتراض اور دل دکھانے والی بات نہ ہو

یہ بات ضرور ہوئی کہ اکثر مجھے خیال آیا اگر وکیل صاحب بھی دلچسپی لیتے اور اسی حوصلہ سے کام لیا جاتا تو میری شادی "ناگوار فرض" نہ ہوتی۔ اس وقت میرے گھر والے کتنے خوش ہوتے! پھر بھی خدا شاہد ہے مجھے اصغر کی دلہن سے ذرا بھی حسد نہ تھا۔

حسنا اس رشتہ کو بہت ناپسند کرتی تھی۔ دلہن کی فطری کمزوریوں کو جانتے ہوئے اس کے خیال میں یہ شادی بہت ہی واہیات تھی، تاہم یہ نہ معلوم تھا کہ میری داستان بربادی کا آخری باب یہی ہے۔

شادی ہونے کے بعد جلد ہی حسنا کے خیالات کی تصدیق ہونے لگی۔ دلہن کو اور ان کی ماں کو یہاں کی ہر چیز ناپسند تھی ہر بات پر اعتراض تھا خود دلہن بھی ہر وقت تیوری چڑھائے ہر بات سے ناخوش تھی، نہ کھانا اس کو پسند نہ کپڑا اس کو مرغوب، بات بات پر امی سے جھک جھک، ان کی کنجوسی اور سخت مزاجی کی ہر وقت شکایت، دراصل وہ امی کی دست نگر رہنا بالکل نہ چاہتی تھی۔ اس کو خود مختاری کی بے حد خواہش تھی۔ امی بھلا اس کو کیسے جائز رکھتیں۔ ان کے ہوتے ہوئے کوئی کام ان کے توسط یا حکم کے بغیر کرنا ان کو مطلق گوارا نہ تھا۔ اور یہی چیز فساد کی بنا ہوگئی، ادھر امی نے ہر ہر بات میں میری مثال تعریضاً دینا شروع کر دی۔ "بیچاری بڑی دلہن ایسی نیک ہے کہ کبھی کسی بات سے مطلب نہیں، جو پکا بیٹھ کے کھا لیا۔ جو کپڑا بنا دیا خوش ہو کے پہن لیا، ایک یہ کمبخت بلا ہے جو میری جان کی دشمن بن کے آئی ہے"۔ اس پر طرہ یہ تھا کہ بعض وقت ابا جان بھی اکثر ہاں میں ہاں ملا دیتے، کہہ اٹھتے اس کا نام کیوں لیتی ہو، وہ بہو تھوڑی ہے، وہ تو ہماری بڑی بیٹی ہے بس غضب ہوگیا، کیونکہ یہ واقعہ تھا کہ گھر میں سب مجھ سے خوش تھے، امی کی مجبوریاں مجھے دل سے تسلیم تھیں اور ان کے برتاؤ پر میں خاموشی سے قانع، نتیجہ کے طور پر بہت جلد امی ساس سے ماں بن چکی تھیں وہ سچے دل سے میرا خیال کرنے لگیں، اور بالکل حسنا کی طرح مجھ سے بے تکلف ہو کر سچ مچ بیٹی ہی بنا لیا، شکایت تو شاید وکیل صاحب کو بھی مجھ سے نہ تھی۔ پھر بھی میرے ساتھ وہی تال لا انداز تھا اور اب بھی ہے جو پہلے روز تھا جب بھی میرے پاس آتے اسی طرح مضمحل اور افسردہ، کبھی کھل کر بات کی نہ کوئی خواہش ظاہر کی نہ مجھے کسی خواہش کے بیان کا موقعہ دیا، مختصر سے مختصر جملے میرے ساتھ گفتگو میں استعمال کرتے ہیں، کبھی غیر معمولی بات چیت ہمارے درمیان نہیں ہوتی، ایک لاانتہا غیریت کبھی نہ ختم ہونے والی اجنبیت، جس نے تباہ و برباد کر رکھا ہے۔ کاش وہ ظالم ہوتے مجھے مارتے، گالیاں دیتے، مگر اپنا تو سمجھتے، کبھی تو یہ سوچتے کہ میں بہو ہوں اور شریف بیوی، میری متاع زندگی شوہر اور صرف شوہر ہے۔ میری دنیا انہی تک محدود تھی،

بہرحال اس تعریض کا نتیجہ جلد ظاہر ہوگیا، چھوٹی دلہن میری دلی دشمن بن گئی اور میری مخالفت پر تل گئی۔ ان میں منافقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، بظاہر وہ میری ہمدرد اور مخلص تھی لیکن باطن میں قاتل۔ اس کی زبان میری موافقت میں اور دل میری مخالفت میں سرگرم تھا وہ گھنٹوں میرے پاس بیٹھی رہتی مجھ سے دنیا بھر کی باتیں کرتی اکثر وکیل صاحب کی آوارگی اور عیاشی کی تفصیلات سناتی جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی

تھا۔ گو تفصیلات سے واقف نہ سہی تاہم ٹھوس حقیقت مجھ پر پوری طرح روشن ہو گئی تھی۔ اتنی بھی میرے سامنے اپنا دکھڑا اپنے حیثیتیں ہو رہیں ان کو بھی سمجھنا چاہتی۔ ان سے بارہا میں نے چھوٹی دلہن کی صفائی کرا دی ہیں ان سے کبھی دلہن کی کوئی شکایت نہ کرتی تھی محض اس کے اشتعال کے خوف سے میں دل سے اتنی اور دلہن کے تعلقات خوشگوار ہو جانے کی متمنی تھی اور دلہن دل سے مجھے مٹانے کی آرزومند۔ وہ شطرنج کی ایسی چالیں چلنا خوب جانتی تھی اور ایسی ایسی حرکتیں میرے ساتھ منسوب کر دیتی جن کو مجھ سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا اور ایسی ہوشیاری سے کہ مجھے جھٹلانے کا موقع ہی نہ رہتا۔ اس کا وار پوری قوت سے اپنا کام کر جاتا۔ اور میں نیم بسمل ہو کے رہ جاتی میں دیکھ رہی تھی اور بے بس تھی۔ سمجھ رہی تھی اور مجبور تھی۔ میرے ایثار، میری وقعت کا قلعہ مسمار ہو رہا تھا۔ میرے ضبط و برداشت کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔

حسنا میری بچی ہمدرد تھی وہ ہر وقت اور ہر موقع پر میرا ساتھ دیتی۔ میری ہر ممکن تسلی و تشفی کرتی۔ اور وہ غریب اس کے سوا کر ہی کیا سکتی تھی اب تک سچ پوچھئے تو کوئی میرا مخالف نہ تھا۔ اس لئے سکون کے ساتھ میری زندگی کی رفتار جاری رہی، روحانی اذیت خاموشی سے برداشت ہو سکتی تھی اور اب صورت حال بالکل مختلف تھی، دلہن کا پلہ بھاری تھا اصغر اس کی کمزوریوں سے واقف ہوتے ہوئے بھی اس کی حرکتوں کو جانتے ہوئے بھی، انجان بنا ہوا تھا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ اس نے اگر بیوی کی مخالفت میں ایک لفظ بھی کہا تو دلہن کا سارا بھرم نکل جائیگا، وہ بالکل خاموش تھا اور میں بالکل اکیلی۔ میرا عزیز وہ بھی بنا ہوا تھا۔ اور میں بالکل نہتی، حسنا اکثر دلہن کی باتوں اور حرکتوں سے چڑ کر، خود بورڈنگ میں رہنے کی تجویز کرتی اور مجھے میکے چلے جانے کا مشورہ دیتی وہ بارہا کہہ چکی تھی "یہ آپ کی سسرال ہے، یہاں آپ کے ذاتی اوصاف کا دیکھنے والا کوئی نہیں۔ یہاں تو بس بھائی جان کی عنایت کا کام ہے۔ جب وہی آپ کے نہیں ہیں تو سسرال آپ کی کہاں سے آئی"؟ دیکھئے نا چھوٹی بھابی کو، وہ ثبوت کے طور پر کہتی "سب ان سے ناخوش ہیں۔ پھر بھی ہر ایک کو ان کا خیال کرنا پڑتا ہے محض اصغر بھائی کی خاطر، ہر شخص ان کے مکر و فریب کو جانتا ہے اور پھر بھی ان کی ہر بات سچ مانی جاتی ہے۔ صرف اصغر بھائی کی مروت میں"۔

شوہر کے بغیر کسی عورت کو سسرال میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہیں بھی اس کی رائے پر عمل کرنے کا بارہا تہیہ کر چکی تھی کئی بار ایسی ارادے سے میکے گئی، مگر جب امی کا بلاوا آجاتا تو پھر مجھے آتے ہی بن پڑتی میرے سارے ارادے تار عنکبوت سے بھی زیادہ بودے ثابت ہوتے۔ مجھے یہیں اپنے دن ختم کرنا تھے، یہ میری سسرال تھی۔ میرے شوہر کا گھر، یہاں میں دلہن بنکر میکے سے آئی تھی اور میت ہو کر ڈولے میں، یہیں سے قبر تک جانا میری دلی تمنا تھی۔

(۵)

دلہن نے ابتک کئی وار مجھ پر بھرپور کئے تھے مگر میں ان سے بچ گئی تھی کوئی بھی میرے لئے مہلک ثابت نہ ہو سکا تھا کہ انہوں نے آخری وار پوری قوت کے ساتھ کر کے میرا کام ہی تمام کر دیا۔ حسنا کی شادی ہو چکی تھی اور وہ سسرال میں تھی۔ تنہائی میں میرا دل اُچاٹ ہو رہا تھا۔ میں نے امی سے اجازت لے کر گھر خط لکھ دیا کہ مجھے لے جاؤ۔ بھائی نے ایسٹر کی چھٹیوں میں آنے کا وعدہ کر لیا۔ اسی کے دو چار روز بعد کا ذکر ہے، وکیل صاحب میرے پاس آئے "تم نے کوئی ساری منگوائی ہے"؟ انہوں نے خلاف عادت پوچھا میں نے ساری لا کر انہیں دکھا دی اسی روز یہ ساری میں نے اصغر سے منگوائی تھی۔ انہوں نے ساری کو دیکھتے ہوئے کسی قدر تامل سے پوچھا "دام کہاں سے لئے" میری زندگی میں اس نوعیت کا یہ پہلا سوال تھا۔ تعجب سے میں نے ان کو دیکھا اور پھر بھائی کا خط ان کے ہاتھ میں دیدیا۔ جس میں انہوں نے مجھے پچاس روپے بھیجنے کی اطلاع دی تھی۔ وکیل صاحب نے خط پڑھ کر مجھے واپس کر دیا اور چلے گئے۔ مگر مجھے بڑی خلش ہوئی دیر تک میں سوچتی رہی۔ کسی طرح کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ دل بے طرح اُلجھنے لگا۔ اتنے میں شوکت آ نکلا یہ حسنا کی اتا کا لڑکا تھا۔ اور اسی خصوصیت کی بنا پر میں بھی اس سے بے تکلف تھی۔ اس نے مجھے اداس دیکھ کر پوچھا "کیا بات ہے آپ کی طبیعت کچھ ناساز ہے؟" میں نے اپنی اُلجھن صاف کر دی شوکت گو اتا کا لڑکا تھا۔ لیکن بہت ہی سمجھ دار اور شریف طبع، وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ مجھے ایسا شبہ ہوا گویا وہ سب کچھ جانتا ہے۔ تھوڑے اصرار کے بعد اس نے کہا۔ پوری بات تو مجھے نہیں معلوم، البتہ بڑے صاحب جب دفتر سے آئے تو چھوٹے صاحب باتیں کرتے کرتے ان سے کہہ رہے تھے آپ

کے روپے غائب ہونے اور بھابی جان نے بچاس روپے کی ساری منگوائی معاملہ تو آپ خود سمجھ لیجئے۔"

مجھ پر بجلی گر پڑی۔ غضب خدا کا! مجھ پر چوری کا الزام میرے مالک زمین پھٹ جائے اس میں سما جاؤں، پروردگار مجھے موت دیدے میرے اوپر آسمان پھٹ جائے۔ میرے خدا، آخر مجھے کہاں تک ذلیل کرے گا۔ میں نے چوری کی، عالم الغیب تو بہتر جاننے والا ہے، میں کیا کروں؟ میرے سارے قویٰ مفلوج ہو کر رہ گئے سوچنے اور سمجھنے کا احساس تک باقی نہ رہا۔ میں بے دم ہو کر رہ گئی۔ دیر تک ناقابل بیان کیفیت مجھ پر طاری رہی۔ پھر رفتہ رفتہ میری قوت عود کرنے لگی۔ مجھے اس وقت قطعی رنج نہ تھا۔ بلکہ غصہ تھا۔ میں یہاں ہرگز نہ رہوں گی یہ میرا مصمم ارادہ ہو چکا تھا۔ میں چور ہوں تو چوروں کے پاس رہنا چاہئے۔ یہاں میرا کیا کام!

خود بخود پردہ میرے سامنے سے ہٹنے لگا پیشتر ازیں دو دفعہ تایا جان اور امی جان کے کئی سو روپے غائب ہو چکے تھے اس وقت نہ کوئی نوکر نکالا گیا نہ کوئی اہم کارروائی کی گئی تھی، حسنا نے مجھے مغالطہ دینے کے لئے شوکت کا نام لے دیا گویا حسنا کی خاطر شوکت کو تنبیہ نہیں کی گئی۔ یقیناً گذشتہ الزامات بھی میرے اوپر عائد تھے اور اخلاقاً امی وغیرہ نے اس کو رفت گذشت کر دیا تھا۔ سب کچھ خود بخود مجھے معلوم ہو گیا۔

حسنا کے وہ الفاظ ایک ایک کر کے میرے دماغ میں گونجنے لگے۔ جو اس نے میکے چلے جانے کے سلسلے میں لکھے تھے افسوس میں نے دل میں کہا، کاش حسنا مجھے سچ سچ بتا دیتی۔

وکیل صاحب اوپر کی منزل میں رہتے تھے۔ وہیں ان کا ڈرائنگ روم بیڈ روم آفس روم سب تھے۔ میں اوپر بہت کم جایا کرتی تھی۔ اوّل تو بچوں کی وجہ سے جنگی گڑبڑ وکیل صاحب کو سخت ناگوار گزرتی دوسرے خود میرا بھی جی نہ چاہتا تھا، جب وہ مجھ سے بیزار رہتے تھے۔ تو میں کیوں اندر جاتی؟ کمبختی دیکھئے اس چوری والے واقعہ کی رات کو وکیل صاحب کے سر میں درد تھا، میں بطور مزاج پرسی اوپر گئی۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ قسمت اس موقع کے انتظار میں ہے تو میں کبھی ادھر کا رخ بھی نہ کرتی۔ مقدرات معلوم ہو جائیں تو مصیبت ہی کیوں ہو۔ یہ آفت مزید برآں کہ اسی روز ساڑی منگوائی تھی۔ ان باتوں نے مجھ پر خود بخود جرم ثابت کر دیا۔ جب مقدر بگڑتے ہیں تو انسان خود بخود اپنے لئے سولی تیار کرتا ہے خود ہی آگ میں گر کر جلتا ہے۔

آخری مرتبہ وکیل صاحب سے مل کر ان کے مخصوص فلسفیانہ انداز میں اپنا الزام سننے کی خواہش نے مجھے اوپر پہونچایا۔ وہ میرے سامنے بیٹھے ہوئے ایک فوٹو دیکھنے میں منہمک تھے۔ میری آہٹ پاکر انہوں نے فوٹو دراز میں رکھ دی پھر قدرے بے تکلفی سے بولے بیٹھو اور پھر میری طرف اس طرح دیکھنے لگے گویا میرے آنے کی وجہ پوچھ رہے ہیں۔ میں نے رکتے رکتے پوچھا: "آپ کے کچھ روپے چوری گئے ہیں" بمشکل یہ الفاظ میرے منہ سے نکلے۔ میری سانس پھول رہی تھی اور خود چور بنی ہوئی شرم سے گڑی جا رہی تھی۔ کچھ سکوت کے بعد کہنے لگے "ہاں بھئی کل شام کو پانچسو کے نوٹ اسی دراز میں رکھ دیئے تھے۔ صبح دیکھتا ہوں تو غائب پھر آپ ہی بولے "تم کو کیسے معلوم ہوا؟" "جس سے آپ کو میری ساڑی منگوانا معلوم ہو گیا" میں نے ذرا ترش لہجے میں جواب دیا۔ "ہوں" انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا "تو گویا آپ کے ساڑی منگوانے کا علم مجھے نہ ہونا چاہئے تھا" میں نے اسی طرح بے جھجک کہا "شاید آپ کے روپے کھونے کا علم مجھے نہ ہونا چاہئے تھا" وہ مسکرائے جب کچھ نہ بولے تو مجبوراً میں نے خود ہی پوچھا "کیا خیال ہے آپ کا، کس نے لئے ہوں گے؟" "خدا بہتر جانتا ہے۔" انہوں نے ٹالنے کے انداز میں جواب دیا "غلط" میں نے غصے سے تھراتے ہوئے کہا "خدا سے زیادہ آپ کے بھائی بھاوج کو معلوم ہے۔ آخر میری ساڑھی اسی چوری کی رقم سے تو آئی ہے"! "کیا واہیات ہے" انہوں نے بیزاری سے کہا "یہ تم کو کسی نے ورغلا دیا ہے" میں نے زور دے کر کہا "بناوٹ کو رہنے دیجئے، آپ کو بتانا ہو گا کہ آپ کا میرے متعلق کیا خیال ہے ورنہ" انہوں نے جملہ ختم کر کے میری طرف دیکھا، میں بہت لجاجت سے بولی "بتا دیجئے آپ کو اپنے ایمان کی قسم ہے۔ دنیا میں آپ کو جو سب سے زیادہ عزیز ہو اسی کی قسم ہے۔ سچ سچ بتا دیجئے" مجبور ہو کر بولے "کیا بتاؤں! تمہارے متعلق میرا کیا خیال ہو سکتا ہے؟ میرا روپیہ خود تمہارا ہے چوری سے اس کا کیا تعلق؟ خدا جانے کون اٹھا کر لے گیا؟ تمہارے متعلق شبہ ضرور کیا گیا، اسی وجہ سے میں نے پھر اس کا نام بھی نہ لیا، اسی چیز کی تحقیق کرنا جو تمہارے لئے تکلیف دہ ہو مجھے کسی طرح مناسب معلوم نہ ہوا۔"

"کیا غضب کرتے ہیں آپ؟ اس طرح ٹال دینے کا تو یہ نتیجہ ہے۔ اگر پہلی ہی مرتبہ تحقیق کر لی جاتی تو کب کا یہ فیصلہ ختم ہو جاتا" میں نے بہت جوش سے کہا۔ "آپ ضرور تحقیق کیجئے، جس نے بھی یہ بات کہی ہے یا تو وہ ثابت کرے، نہیں تو اسے تنبیہہ کی جائے جس وقت کہئے میں قرآن ہاتھ میں لیکر قسم کھانے کو تیار ہوں۔ پانچ دس تو کیا کبھی پانچ پیسے بھی میں نے آپ کے نہیں لئے" "استغفر اللہ!" انہوں نے کہا "میں کب کہتا ہوں" "تو پھر تحقیق کیجئے" "کیسے کروں؟" وہ بڑی مجبوری سے بولے۔ "اصغر کا معاملہ ہے اسکو سخت ندامت ہوگی دلی صدمہ ہوگا" پھر مجھے سمجھانے لگے "جانے بھی دو۔ اتنے روپوں کیلئے ہنگامہ کرنا کتنا ناموزوں ہے۔ کھو گئے تو کھو گئے اور بہت مل جائیں گے" میں نے ٹھنڈی سانس لی "بے شک آپ کو روپے بہت ملیں گے مگر میری گئی ہوئی وقعت کبھی نہیں مل سکتی"۔ انتہائے یاس سے بمشکل یہ الفاظ میری زبان سے نکلے "لاحول ولا قوۃ" اس میں تمہاری وقعت کا کیا سوال ہے؟ روپے میرے تھے کھو گئے۔ مجھے کوئی فکر نہیں کوئی بکتا ہے تو بکنے دو اس بات کا چرچا ہی میرے دلی اذیت کا باعث ہوگا" انہوں نے مجھے مجبور کرتے ہوئے کہا "خدا کے لئے اس قصہ کو ختم کر دو میں نے تم سے کبھی کوئی خواہش نہیں کی یہ میری پہلی اور آخری خواہش ہے' بولو" انہوں نے میرے شانے پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا "کیا میری یہ خواہش نہ پوری کرو گی؟" میں مجبور ہو چکی تھی گلوگیر آواز میں بولی "کوشش کروں گی" دو چار روز کے بعد بھائی مجھے لینے آ گئے، وکیل صاحب چھٹیاں منانے باہر گئے ہوئے تھے میں نے ان کے منشی کو خط لکھ کر دیدیا کہ جب وہ آئیں تو دیدینا۔

اس میں صاف صاف میں نے لکھ دیا کہ جس طرح بنی زندگی کے تلخ ترین لمحات کو گذارنے کی کوشش میں اپنی عمر کے دس سال ختم کر دئے وہ اب میرے لئے ناقابل برداشت ہے، جسمانی روحانی دلی ہر طرح کی قربانی میں نے کی اور آئندہ بھی کر سکتی ہوں، تاہم اپنی وقعت کو میں کسی قیمت پر قربان نہیں کر سکتی۔ میں نے بھی آپ سے کوئی خواہش نہیں کی یہ میری پہلی اور آخری خواہش ہے۔ آپ مجھے اصغر کی دلہن کے ساتھ رہنے پر مجبور نہ کریں یہ قطعی ناممکن ہے۔ آپ کی خواہش تو میں نے کسی نہ کسی طرح پوری کر دی، رہی میری خواہش اس کے پورا کرنے کے لئے آپ کو مجبور نہیں کر سکتی، آپ پر مجھے کوئی اختیار نہ سہی اپنے دل پر پورا پورا اختیار ہے۔ میں آپکے پاس اسی وقت ہونگی جب آپ میری خواہش پوری کر سکیں یا آپ کو میری ضرورت ہو اور مجھے صحیح معنوں میں اپنے ساتھ رکھ سکیں"۔

آٹھ نو سال سے میں میکے میں ہوں، اُمّی کئی بار بلا چکی ہیں، لوگ کہتے ہیں چلی جاؤ سسرال ہے۔ وہیں مرنا کھپنا ہے بعض لوگ سمجھتے ہیں میں وہاں کی تکلیفوں سے اُکتا کر بھاگ آئی ہوں وہ مجھے سمجھانا چاہتے ہیں کہ وہاں کی تکلیف بھی میرے لئے راحت ہے۔ ایک بیوہ ہیں، جو شوہر کے مرنے پر اس کی جائداد پر بلا شرکتِ غیرے قابض ہے۔ وہ اپنے ٹھکوکہ مکان میں رہے۔ اکثر مجھے نصیحت کرنے میں اپنی مثال پیش کرتی ہے، کہتی ہے دیکھو میں مرنے پر بھی میں اسی دیوتا کی پوجا میں لگی ہوئی ہوں، تم زندگی میں چھوڑے بیٹھی ہو۔ میں سب سنتی ہوں اور برداشت کرتی ہوں۔ میرے دل کا حال کوئی نہیں جانتا۔ کسی کو وہ آگ دکھائی نہیں دیتی جو مجھے جلا کر راکھ کر چکی ہے کوئی اندازہ نہیں کر سکتا میری روحانی اذیتوں اور دلی کلفتوں کا، لوگ مجھ کو خوش سمجھتے ہیں کیونکہ میں ہنستی ہوں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ اس ہنسی میں میرے دل کے آنسو جھلکتے ہیں۔ میں زندہ ہوں مگر میری زندگی مر چکی ہے، مگر انتظار کر رہی ہوں، طویل انتظار اس وقت کا جب وکیل صاحب مجھے بلائیں یا خدا، دیکھیں ان میں سے کون پہلے بلاتا ہے ◆

ایک غریب طبقہ سے گذرتے ہوئے

ایک دردناک نظم

از جناب محمود جالندھری

افلاس ہے حاکم یہاں اور غم سپہ سالار ہے
خاموشیوں کی گود میں ہیں شورشیں سوئی ہوئی
چاروں طرف ہے خامشی اور زندگی نابود ہے
عزلت نشیں ہے زندگی اک جھونپڑی میں گھاس کی
فاقہ کشی بیچارگی مہلک سوا ہیں موت سے
پاکیزگی آلائش مکروہ میں روپوش ہے
اخلاق کی تخریب کے درپے یہاں اوہام ہیں
غمگین چہروں پر ہے زلف بیکسی بکھری ہوئی
کافر جوانی پیرہن کی قید سے آزاد ہے
مہر جہاں افروز دوزخ کی لپٹ سے کم نہیں
خاموش ہیں چولھے اور آتش پیٹ کی دہکی ہوئی
ہے اس طرح ماں کی تمنا گود میں سمٹی ہوئی
نادار بچے ہیں مرا یوں راستہ روکے ہوئے
میرے لباس فاخرہ کو دیکھ کر مرعوب ہیں
یوں دیکھتے ہیں مجکو جیسے ہیں خدائے دہر ہوں
انسان ہیں تو کس لئے دنیا میں یہ مجبور ہیں

اس سلطنت میں عیش سامانی ذلیل و خوار ہے
تابانیاں ہیں ظلمتوں کے غار میں کھوئی ہوئی
غمگینیاں پیدا ہیں امکان خوشی مفقود ہے
پھیلی ہوئی ہیں دو وبائیں بھوک کی اور پیاس کی
آزار و ناداری یہاں جنگ آزما ہیں موت سے
گرد کثافت سے یہ دنیا موت در آغوش ہے
جہل اور ناشائستگی کی لعنتیں بھی عام ہیں
آلودۂ آلام ہیں کچھ صورتیں نکھری ہوئی
حسن تکلف دوست کتنا اس جگہ برباد ہے
کیا سرد مہری موسم سرما کی وجہ غم نہیں
لیکن فضا ہے موج بوئے بادہ سے مہکی ہوئی
اک چھپکلی دیوار سے ہو جس طرح چمٹی ہوئی
رہگیر کو جیسے لٹیرے دشت میں گھیرے ہوئے
پھیلے ہوئے ہیں ہاتھ کچھ پیسے انہیں مطلوب ہیں
اور میں کہ دل ہی دل میں شائق ہوائے دہر ہوں
کیوں اُن کے دل ہر وقت درد و کرب سے معمور ہیں

اُن کے لئے روزی نہیں اُن کیلئے دھندے نہیں
اے خالق کون و مکاں کیا یہ ترے بندے نہیں؟

رُستم

دُنیا کے جرّی ترین پہلوان کے حیران کُن کارنامے!

(از جناب کوثر چاند پوری)

رستم کا نام شجاعت و بہادری کے سلسلہ میں اتنا ہی مشہور ہے جتنا سخاوت و ایثار میں حاتم کا، لیکن ان دونوں کی تاریخ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ حاتم عہد نبوّت سے ذرا ہی پہلے گزرا ہے۔ اس لئے اس کے صحیح تاریخی حالات کا بہم پہنچا لینا کچھ مشکل نہیں۔ مگر رستم کا تعلق عہدِ عتیق سے ہے۔ اور کوئی واقعہ جتنا پُرانا ہوتا جاتا ہے اُتنا ہی وہ ماضی کے دھندلکے میں پوشیدہ ہوتا رہتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ اُس کی صحت و عدم صحت پر کوئی قابلِ اعتبار رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ یہی کیفیت ایرانِ قدیم کی اُن روایات کی ہے جو رستم اور ایسی ہی دوسری ہستیوں سے تعلق رکھتی ہیں چنانچہ فردوسی کا شاہنامہ جو عجم کی بہترین تاریخ اور وہاں کے تمدّن و معاشرت کا نہایت صحیح نقشہ پیش کرتا ہے۔ آج تک تاریخ نگاری کے میدان میں وہ ممتاز جگہ حاصل نہ کر سکا جو ایک تاریخ کو بحیثیت تاریخ ملنی چاہئیے۔ اکثر مورّخین شاہنامہ کو تاریخی حیثیت دینے ہی کے لئے تیار نہیں۔ بہت سے اس کی بے شمار روایات کو خلافِ عقل و قیاس قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ فردوسی نے جو واقعات اپنی رزمیہ کتاب شاہنامہ میں بیان کئے ہیں وہ ایران کی اکثر پُرانی کتابوں میں تواتر کے ساتھ ذکر ہوتے چلے آتے ہیں اور یہی وہ سندِ صداقت ہے جو آج فردوسی کو دی جا سکتی ہے۔ ایران کے متعلق عرب مورّخین نے جو کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں بھی یہ واقعات ملتے ہیں۔ بلکہ اکثر اربابِ رائے کا خیال ہے کہ فردوسی کا ماخذ یہی عربی تاریخیں ہیں۔ لیکن فردوسی مورّخینِ عرب کے سامنے سر جھکانے کو تیار نہیں۔ وہ اپنی کتاب کا تعلق براہِ راست ایران کی پُرانی تاریخوں سے ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اُس کی ضد کو قومی و ملکی تعصّب سے زیادہ وقیع نہیں سمجھا جا سکتا۔ تاہم ایران کی ان تاریخی کتابوں کو صحیح سمجھ لیا جائے تو پھر شاہنامہ کو غلط اور غیر تاریخی کتاب کہنے کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ وہ لفظ بہ لفظ ان کتابوں کے مطابق ہے۔

فردوسی کے شاہنامہ کے علاوہ اکثر عرب مورّخین نے بھی ایران کی تاریخ لکھی ہے۔ اور وہ شاہنامہ سے زیادہ مختلف نہیں ہے جو لوگ مسلمانوں کے متعلق یہ رائے رکھتے ہیں کہ اُنھوں نے ایران کا تمام علمی ذخیرہ جس میں اس کی تاریخ بھی شامل ہے نذرِ آتش کر دیا تھا۔ انہیں معلوم ہونا چاہئیے کہ اگر آج ایران کے متعلق صحیح واقعات کا حال معلوم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تو اس ضرورت کو وہی کتابیں پورا کر سکتی ہیں جو مسلمان مصنّفین نے لکھی ہیں۔ شروع شروع میں ایران کی تاریخوں کا ترجمہ اسلامی حکومت کی سرپرستی میں کیا گیا اور اکثر کتابیں ترجمہ کی گئیں۔ اس کے بعد مستقل تصانیف کا سلسلہ شروع ہوا چنانچہ فردوسی سے پہلے ہی طبری، علامہ مسعودی وغیرہ کی تاریخیں مرتب ہو چکی تھیں۔ ان کتابوں سے شاہنامہ کے بیشتر واقعات کی تائید ہوتی ہے۔ البتہ بعض مقامات کی تکذیب بھی ہوتی ہے۔ اور یہ وُہی مبالغہ آمیز اور خلافِ قیاس قصّے ہیں جن کو ہر صاحبِ عقل صحیح سمجھنے سے انکار کر دے گا۔ مثلاً "سیمرغ کا واقعہ" یا منزلِ ہفت خوان کی داستان، لیکن باوجود اس کے اِسی کتاب میں بہت سے سچے حالات بھی موجود ہیں جن کی صحت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ صورت میں رستم کے واقعاتِ زندگی کی جستجو بے نتیجہ نہیں کہی جا سکتی

اگرچہ جو روایتیں عام طور پر زبان زد ہیں وہ سب کی سب صحیح نہ ہوں تاہم رستم کے متعلق بہت سے ایسے حالات کا علم بھی ہم لوگوں کو ہے جنھیں غلط نہیں کہا جاسکتا۔ اور یہ رستم کی خوش قسمتی ہے کہ دو ہزار سال کے بعد بھی اب تک زندہ ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے ایران کی چند تاریخیں ہیں شاہنامہ بھی ہے۔ لیکن میری رائے میں شاعری اور تاریخ میں کوئی خود کا علاقہ نہیں ہے۔ اس لئے میں کلیۃً شاہنامہ پر بھروسہ نہ کروں گا اور اس کی جن روایات کی دوسری تاریخی کتابوں کے بیانات سے تصدیق نہ ہوگی۔ انھیں نظرانداز کر دوں گا۔ اس وقت میرے سامنے سب سے اچھی اور مختصر کتاب جس کے لب و لہجہ کی متانت اور بیان کی سنجیدگی مجھے بہت زیادہ پسند ہے، جامع التواریخ ہے۔ اس میں ایران کے تمام بادشاہوں کی تاریخ موجود ہے اور خصوصاً رستم کے حالات، اس کے کارنامے بھی ہیں۔ میں نے اس مضمون کی ترتیب میں زیادہ تر اسی سے امداد لی ہے گرچہ شاہنامہ بھی میرے پاس موجود ہے اور اکثر میں نے اس کتاب کی روایات کو شاہنامہ کے اشعار سے مطابق کیا ہے۔ مگر شاہنامہ کے بیان کئے ہوئے بہت سے کمزور واقعات کو میں نے نظرانداز ہی کر دیا ہے۔

نسب اور خاندانی حالات

منوچہر کے زمانۂ حکومت میں ایک مشہور پہلوان سام بن نریمان تھا جو شجاعت و بہادری میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا۔ نیمروز (سیستان) زابل اور کابل نیز ہندوستان کے اکثر شہروں کی حکومت اس کے سپرد تھی، ان تمام ملک کا نظم و نسق سام ہی کے مشورے اور رائے پر موقوف تھا۔ سام کے یہاں ایک بیٹا ہوا جس کے سر، ابرو اور پلکوں کے بال بالکل سفید تھے۔ سام بیٹے کی صورت اور ہیئت دیکھ کر بہت خوف زدہ ہوا۔ اس نے اپنے بیٹے کو پرورش کی غرض سے ایک زاہد کے سپرد کر دیا جس کا نام سیمرغ تھا اور وہ ایک پہاڑ کی کھوہ میں رہا کرتا تھا۔ پرورش کے مصارف سام خود برداشت کرتا رہا۔ بچہ کی عمر سات سال کی ہوگئی تو اسے اپنے گھر لے آیا۔ اور زال نام رکھا کیونکہ زال کے معنی بوڑھے کے ہیں اور سام کا بیٹا چونکہ پیدائشی طور پر پیری کے آثار یعنی بالوں کی سفیدی ساتھ لایا تھا اس لئے اس کا نام اس اعتبار سے زال ہی مناسب ہوسکتا تھا۔

عجمیوں نے اس سلسلہ میں بہت سی باتیں لکھی ہیں جن میں سے بعض کا تذکرہ فردوسی نے بھی کیا ہے مگر یہاں ان کا لکھنا کچھ مفید نہیں معلوم ہوتا۔ سیمرغ سے فردوسی نے جس قدر کام لئے ہیں۔ ان کی بنیاد سر تا سر مبالغہ پر مبنی ہے۔ ایک جانور کا انسان کے بچّہ کو سات سال تک پرورش کرنا بالکل قیاس میں نہیں آتا۔ اسی طرح بعض خطرناک مواقع پر رستم کو سیمرغ کے مشوروں سے کامیابی حاصل ہونا جانوروں کی خصوصیات میں نہیں آسکتا، یہ سب انسانی صفات ہیں اور ہمارے ہیں اگر سیمرغ کو ایک نیک اور متاخر انسان ہی سمجھ لیا جائے جیسا کہ اکثر متین اور سنجیدہ مؤرخین کی رائے ہے تو اس میں سوائے اس کے اور کوئی قباحت لازم نہیں آتی کہ فردوسی کی وہ بلند خیالی اور شاعرانہ نکتہ سنجی بیکار ہو جائے جو اس نے اس داستان کے بیان کرنے میں صرف کی ہے۔

زال اپنے باپ سام کی معیّت میں منوچہر شاہ ایران کے دربار میں گیا تو شاہ ایران نے اُسے اپنی شاہانہ عنایت سے سرفراز کیا۔ کچھ عرصہ بعد سام اپنے بیٹے زال کو سیستان کا حاکم کرکے ہندوستان چلا آیا۔

زال سیر و سیاحت کے سلسلہ میں کابل گیا۔ وہاں کا حاکم سلم کا ماتحت اور خراج گزار تھا۔ اس نے حسب قاعدہ زال کا استقبال کرکے نذر پیش کی۔ زال نے بھی اس پر نوازشیں کیں۔ حاکم کابل مہراب کی لڑکی رودابہ اپنے باپ کی زبانی زال کے حالات سن کر اس پر فریفتہ ہوگئی۔ اور اپنی کنیزوں کو بیچ میں ڈال کر اس نے زال سے خفیہ ملاقات کی جس میں محبت کو نباہنے کے عہد و پیمان ہوئے۔ اس کے بعد زال سیستان واپس آگیا۔ کچھ دن گزر جانے پر زال اور رودابہ کی باقاعدہ شادی ہوگئی۔ فردوسی نے شاہنامہ میں زال اور رودابہ کے افسانۂ عشق کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے اور دونوں کی خفیہ ملاقات کا بھی ذکر کیا ہے۔ زال رودابہ سے ملنے گیا اور اس کے محل کے نیچے پہنچا تو اوپر سے رودابہ نے اپنی چوٹی کھول کر بال لٹکا دیئے تاکہ انھیں پکڑ کر زال کوٹھے پر چڑھ آئے۔ زال نے انھیں بوسہ دیا اور کمند پھینک کر اوپر چڑھ گیا۔ معشوق کے بالوں سے یہ کام لینا اس کی جرأت عشق نے گوارا نہ کیا۔

اس زمانہ کی جرأت و مردانگی اسی سے ظاہر ہے کہ رودابہ باوجودیکہ عورت تھی۔ مگر سیڑھی نہ ہونے کی حالت میں اپنے معشوق یا عاشق کے لئے

اپنی زلفیں لٹکا دیتی ہے۔ عاشق اس زمانہ میں بھی ہوتے ہیں۔ اور عاشق پیدا کرنے کی اہلیت کا جہاں تک تعلق ہے دنیا نے اس میں کافی ترقی کر لی ہے۔ مگر زال اور رستم پیدا کرنے میں وہ اتنی بخیل ہو گئی ہے کہ اب ان اوصاف کے لوگ بطنِ گیتی سے پیدا ہی نہیں ہوتے۔ لیکن ہر عاشق کو زال یا رودابہ سمجھ لینا بھی غلطی ہے۔ زمانہ موجودہ میں اگر عاشق کو دریا کے کنارے کھڑا کر کے اس کے معشوق کو پانی میں ڈال دیا جائے تو چاہے وہ کتنا ہی شور مچائے۔ دہائی دے اور اپنے عاشقِ صادق کو امداد کے لئے طلب کرے لیکن اس کی آتشِ عشق اس دریا کو دیکھتے ہی سرد ہو جائیگی اور وہ کبھی اس جان جوکھم میں نہ پڑے گا۔

بہرحال رستم جس کی طاقت وقوت شجاعت وبسالت کے حیرت انگیز کارنامے آج تک بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ اسی مردانہ صفات عورت کے بطن سے پیدا ہوا۔ رودابہ جمشید کی اولاد سے تھی۔

سپہ سالاری

ایران میں چار بڑے خاندان حکومت پر فائز رہے ہیں۔ پیشدادی کیانی اشکانی اور ساسانی۔ رستم کے اسلاف پہلے دو خاندانوں کے زمانۂ سلطنت میں نہایت اعزو اکرام سے زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ کیانیوں کا سب سے پہلا بادشاہ کیقباد تھا جو پیشدادیوں کے آخری تاجدار گرشاسب کے بعد ۳۶۹۱ھ میں زال کی حمایت وکوشش سے تخت نشین ہوا تھا کیقباد نے اورنگ نشین حکومت ہونے کے بعد رستم کو سپہ سالاری کے عہدے پر سرفراز کیا۔

رستم کو اس نئی ذمہ داری کے ساتھ ہی مملکتِ ایران کے ایک بہت قوی دشمن کا مقابلہ کرنا پڑا جو عرصہ سے ایران پر حملے کر رہا تھا۔ یہ ترکستان کا بادشاہ افراسیاب تھا۔ جو سلطنتِ ایران کے لئے ایک مستقل خطرہ بنا ہوا تھا۔ کیقباد سب سے پہلے اسی خطرے کی طرف متوجہ ہوا۔ اور فوج جمع کر کے رستم و سہراب وغیرہ کو مقدمتہ الجیش پر تعینات کیا۔ یہی نہیں بلکہ وہ خود بھی اس مہم پر گیا۔ افراسیاب نے بھی دلاوری سے مقابلہ کیا۔ رستم نے اس لڑائی میں اپنے "گرزِ گراں" سے ایسے حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے کہ افراسیاب ڈر کر صلح پر مجبور ہو گیا۔ یہی پہلی لڑائی تھی جس نے رستم کو بحیثیت ایک بہادر سپاہی کے سب سے پہلے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اور اُس کی بہادری کی آیندہ داستانوں کے لئے اسی لڑائی نے بنیاد اور اساس کا کام دیا۔

افراسیاب نے اگلے ہی دن شاہِ ایران کی خدمت میں صلح کا پیام بھیجا چنانچہ صلح ہو گئی۔ اور دونوں سلطنتوں کے حدود حکومت وہی قرار پائے جو اس سے پہلے معاہدۂ منوچہر کی رو سے طے ہو چکے تھے۔ بعض تاریخوں میں اس لڑائی کے متعلق یہ لکھا ہے کہ جس وقت لشکر صف آرا ہو گئے تو رستم نے افراسیاب کا پتہ پوچھ کر مردانہ حملہ کیا اور صفوں کو چیرتا پھاڑتا افراسیاب تک پہنچ گیا۔ وہ موقعہ کی نزاکت دیکھ رہا تھا لیکن رستم نے اسے شناخت کر کے گھوڑے سے گرا دیا اور گرفتار کر کے اپنے لشکر کی طرف لے چلا۔ عین اس وقت جب رستم لشکر گاہ میں پہنچا اور لشکری اُسے مبارکبادیں دینے لگے وہ ان کا جواب دینے میں ایسا مشغول ہو گیا کہ افراسیاب کو فرار ہونے کا موقعہ مل گیا۔ افراسیاب نے انتہائی حیلہ گری سے کام لیا اور اپنے ہاتھ سے رسی کھول کر ایک اور مرے ہوئے سپاہی کے باندھ دی۔ رستم اس مُردے کو کھینچ کر بادشاہ کے حضور میں لایا تو پتہ چلا کہ وہ افراسیاب نہیں ہے بلکہ کوئی معمولی سپاہی ہے جو لڑائی میں مقتول ہوا ہے۔ رستم سخت پشیمان ہوا۔ اس کے بعد افراسیاب نے اپنے لشکر میں پہنچ کر صلح کی درخواست کی۔

شہنشاہ کاؤس کی رہائی

رستم کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ منزلِ ہفت خواں کو طے کر کے کاؤس کو مازندرانیوں کی قید سے رہا کرانا ہے۔ اگرچہ منزلِ ہفت خواں کی اس داستان کو جو فردوسی نے شاہنامہ میں لکھی ہے مؤرخین نے بالکل لغو قرار دیا ہے تاہم ایک شہنشاہ کو قیدِ بلا سے نجات دلانا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ اور ایک فوجی سردار کا نام روشن کرنے کے لئے صرف اتنا کافی ہے۔ کہ اُس نے بادشاہ کو دشمنوں کے قبضہ سے چھڑا لیا اُس لئے اگر منزلِ ہفت خواں کے مصائب کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو رستم کی یہی کیا کم بہادری ہے کہ اُس نے دشمنوں کے ملک میں پہنچ کر کاؤس کو زندہ سے نکالا۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ کیقباد کے بعد اس کا بیٹا اور بعض روایات کی رو سے اس کا پوتا کاؤس وارثِ تخت و تاج ہوا۔ یہ بادشاہ نہایت مخیر اور عالی ہمت تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی متلوّن مزاج اور بے تدبیر بھی تھا بعض اوقات معمولی باتوں پر حد سے زیادہ توجہ کرتا تھا اور کبھی سخت سے سخت کاموں کو بھی درخورِ اعتنا خیال نہ کرتا تھا۔ اپنی اسی عادت کا شکار ہوا۔ یہ مازندران میں گرفتار ہوا۔ مگر رستم نے منزلِ ہفت خواں کے مصائب برداشت کرکے رہا کر لیا۔ ہفت خواں ایک راستہ تھا جو ایران سے مازندران کو جاتا تھا۔ یہ راستہ بہت قریب کا تھا اور صرف سات دن میں آدمی مازندران پہنچ جاتا تھا۔ مگر نہایت خطرناک بھی تھا۔ رستم نے اپنی پامردی سے تمام خطرات کو دور کیا اور اسی راستہ سے مازندران میں داخل ہوکر بادشاہ کی امداد کی۔ منزلِ ہفت خواں کے مصائب کی تفصیلات اگرچہ بہت دلچسپ ہیں لیکن حقیقت میں وہ شاعرانہ مبالغہ اور دور از قیاس باتوں پر مشتمل ہیں اس لئے ہم انھیں بیان کرکے مضمون کو طویل کرنا نہیں چاہتے۔

کاؤس مازندرانیوں کی قید سے رہا ہوکر ہندوستان وغیرہ کی تسخیر کو روانہ ہوا۔ پرکچھ عرصہ کے بعد کاؤس نے سنا کہ شاہ یمن کی لڑکی نہایت حسین ہے۔ کاؤس بغیر دیکھے ہی اس پر فریفتہ ہوگیا اور شادی کا پیام بھیج دیا۔ شاہِ یمن نے اپنی لڑکی سودابہ کو چار و ناچار اس کے عقد میں دے دیا۔ کاؤس نے یمن میں قیام کیا۔ شاہِ یمن نے موقعہ پاکر اُسے ساتھیوں سمیت گرفتار کر لیا۔ کاؤس کے ساتھ بہت سے مشہور فوجی افسر گستہم بنرن، طوس وغیرہ اسیر ہوئے تھے۔ یہ سب لوگ آسمانِ ایران کے نہایت روشن ستارے ہیں۔ رستم کو کاؤس کی گرفتاری اور قید کی خبر پہنچی تو وہ ایک ہزار سرداروں کو ساتھ لے کر یمن کی طرف چلا۔ جب یمن کے قریب پہنچا تو شاہِ یمن نے رستم کے خوف سے کاؤس کو چھوڑ دیا اور سودابہ کو بڑی شان و شوکت سے ایک ہزار لونڈیاں ساتھ دے کر رخصت کر دیا۔

رستم و افراسیاب کا مقابلہ

افراسیاب بار بار ایران پر حملے کر رہا تھا چنانچہ کاؤس کی اسارتِ یمن کے زمانہ میں بھی اس نے ایران پر تاخت کی، اور لوٹ مار کرکے اپنے پایۂ تخت ترکستان چلا گیا۔

اس کے بعد پھر افراسیاب نے حملہ کیا تو کاؤس نے اُس کے مقابلہ پر جانا چاہا۔ لیکن اس کے بیٹے سیاوش نے جو سودابہ کی جھوٹی تہمت کے باعث آزردہ خاطر تھا اس مہم پر جانے کی استدعا کی۔ کاؤس نے سیاوش کو بارہ ہزار سوار اور اتنے ہی پیادے دے کر بھیج دیا۔ رستم سیاوش کا اتالیق تھا۔ سیاوش نے رستم ہی کے زیرِ سایہ پرورش پائی تھی۔ اس لئے رستم کا اُس کے ساتھ جانا لازمی تھا۔ افراسیاب بہت ہی آزمودہ کار جنیل تھا وہ سیاوش کی آزردگیٔ خاطر سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ اُس کی ماں سودابہ نے اس پر باپ کے ناموس میں خیانت کرنے کا غلط الزام لگایا تھا۔ اگرچہ سیاوش کا دامن اس دھبتے سے پاک نکلا اور باپ نے اس کی بے قصوری کا یقین کر لیا تاہم یہ زخم ایسا نہیں ہے جو مندمل ہو جائے، سیاوش یقیناً زندگی سے بیزار ہے اور باپ کی حدودِ حکومت سے نکل جانا چاہتا ہے۔ چنانچہ اُس نے اپنے بھائی کو تحائف اور ہدایات دے کر سیاوش کی خدمت میں بھیجا اور صلح کی درخواست کی، رستم اور شاہزادہ نے شرائطِ صلح کا تعین کیا چنانچہ انہیں شرائط پر صلح ہو گئی۔ افراسیاب نے تمام مالِ غنیمت جو اس حملہ میں مملکتِ ایران سے اس کے ہاتھ لگا تھا واپس کر دیا اور اپنے خاندان کے سو آدمی شاہزادہ کی خدمت میں بھیج دیئے۔ کاؤس کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اُس نے طوس اور نوذر کو شاہزادہ کے پاس بھیج کر حکم دیا کہ افراسیاب کے آدمیوں کو جو تمہارے پاس ہیں فوراً گرفتار کرکے ہمارے پاس بھیجدو اور تحائف واپس کرکے توران پر حملہ کر دو اگر تم اس کام سے عہدہ برا نہ ہوسکو تو درفش کاویان (یہ شاہانِ کیان کا مخصوص نشان تھا جس میں اوپر گائے کا سر اور منہ بنا ہوا تھا) خزانہ اور لشکر طوس و نوذر کے حوالہ کرکے ہمارے پاس آجاؤ۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم افراسیاب کی چال میں آگئے اسی لئے صلح پر آمادہ ہو گئے۔ رستم کاؤس کے اس حکم کو سُن کر بہت آزردہ ہوا اور خفا ہوکر سیستان چلا گیا سیاوش نقضِ عہد پر آمادہ نہ ہوا اور بھاگ کر افراسیاب کی پناہ میں چلا گیا۔

سیاوش کا قتل اور اس کا انتقام

سیاوش نے پہلے ترکوں کے ایک امیر اور عہدیدار پیران ویسہ

کی لڑکی سے شادی کی جس کے بطن سے ایک لڑکا فرود پیدا ہوا۔ پھر اس نے پیران ویسہ کی وساطت سے افراسیاب کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ افراسیاب نے اس کیانی شاہزادہ کی نہایت عزت اور مدارات کی اور اپنی بیٹی فرنگیش کو اس کے عقد میں دے دیا۔ سیاوش کی افراسیاب کے دربار میں بہت قدر و منزلت تھی۔ اس بنا پر خاندانِ شاہی کے افراد کو اس کی ذات سے حسد پیدا ہو گیا جس کا انجام سیاوش کے قتل کی صورت میں ظاہر ہوا۔ افراسیاب نے لوگوں کے کہنے سننے سے سیاوش کو قتل کرا دیا۔ رستم نے یہ خبر سنی تو سخت ملول ہوا اور کاؤس کے محل سے سودابہ کو نکال کر مار ڈالا۔ کیونکہ اصل میں یہی عورت سیاوش کی خانہ بدوشی اور اس کی ہلاکت کی ذمہ دار تھی۔ اسی نے سیاوش پر الزام لگایا اور اسی کے خوف سے وہ افراسیاب کے ملک میں پناہ گزیں ہوا۔

سودابہ کو ہلاک کر کے رستم نے سیاوش کا انتقام لینے کی تیاری کی۔ رستم نے جس قدر فوج، اسلحہ اور سامانِ جنگ کاؤس سے طلب کیا اس نے سب مہیا کر دیا۔ رستم نے بڑے ساز و سامان اور جوش و خروش سے دریائے جیحون کو عبور کیا۔ افراسیاب اس کا مقابلہ نہ کر سکا اور اس کے پہنچنے سے پہلے ہی فرار ہو گیا۔ اس کا بھائی گرسیوز جس نے سیاوش کو متہم کر کے قتل کیا تھا۔ گرفتار ہو کر مارا گیا۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ افراسیاب نے اپنے بیٹے شہدہ کو مقابلہ پر بھیج دیا تھا جو کاؤس کے لڑکے فریبرز کے ہاتھ سے میدان میں مارا گیا۔ مگر فردوسی کا بیان ہے کہ شہدہ خوارزم میں کیخسرو کے ہاتھ سے مقتول ہوا ہے۔

رستم نے افراسیاب کی تخت گاہ پر قبضہ کیا اور خزانوں وغیرہ پر بھی متصرف ہوا۔ افراسیاب کی بیٹی فرنگیش کے بطن سے سیاوش کے ایک لڑکا کیخسرو پیدا ہو چکا تھا۔ رستم نے کیخسرو اور اس کی ماں کو بہت تلاش کیا۔ لیکن کہیں پتہ نہ چلا۔ اس کے بعد رستم ایران آگیا۔ جہاں کاؤس نے نہایت اعزاز کے ساتھ اسے سیستان کی طرف رخصت کیا۔

افراسیاب سے ایک اور مقابلہ

کاؤس نے کسی نہ کسی طرح کیخسرو کو ڈھونڈھ نکالا اور اپنے بیٹے فریبرز کی موجودگی میں کیخسرو کی عقل و فرزانگی اور استعداد ملک داری پر فرمانروائی کے باعث اپنا جانشین مقرر کیا۔

کیخسرو نے عنانِ سلطنت ہاتھ میں لیتے ہی باپ کا انتقام لینے پر کمر باندھی۔ اس نے زبردست لشکر اپنے چچا فریبرز اور طوس کی سرکردگی میں توران روانہ کیا۔ اس لشکر کشی میں کیخسرو کا بھائی فرود جو پیران ویسہ کا نواسہ تھا مارا گیا۔ اس لئے طوس معتوب ہوا۔ فریبرز افراسیاب کے ملک میں داخل ہوا۔ لیکن پیران ویسہ کے مقابلہ میں شکست کھا کر ایران آگیا۔ کیخسرو پر اس شکست کا بہت اثر ہوا۔ اس نے طوس کو رہا کر کے گودرز کے ساتھ ایک اور بہت بڑا لشکر روانہ کیا۔ افراسیاب کی طرف سے پھر پیران ویسہ مقابلہ کو آیا۔ سخت لڑائی کے بعد ایرانی لشکر منہزم ہو کر کوہِ ہماوند میں پناہ گزیں ہوا۔ تورانی پہاڑ کے دامن میں خیمہ زن ہو گئے اور حسب موقعہ قتل و غارت گری کرتے رہے۔ اسی دوران میں خاقانِ چین ایک بھاری لشکر لے کر پیرانِ ویسہ کی مدد کو آیا۔ اس کے آنے سے ایرانی نہایت تنگ اور مایوس ہوئے۔ ایسی مایوسی اور ناامیدی کے عالم میں رستم ایران سے آگیا۔ اس کے آنے سے ایرانیوں کی جان میں جان آئی اور سخت معرکہ ہوا۔ خاقانِ چین گرفتار ہوا۔ باقی فوجیں میدان چھوڑ کر بھاگ گئیں۔ اس طرح ملک خراسان بھی شاہِ ایران کے زیرنگیں آگیا۔ رستم اور گودرز خراسان کو فتح کر کے خوش خوش واپس ہوئے۔

رستم و اسفندیار کا معرکہ

کیخسرو کے بعد اس کا داماد لہراسپ اورنگ کیانی تخت پر بیٹھا۔ پھر اس کا بیٹا گشتاسپ تخت نشین ہوا۔ یہ بادشاہ زرتشت حکیم بانیٔ دینِ مجوس کا معتقد ہو کر آتش پرستی کرنے لگا۔ اس کا بہادر بیٹا اسفندیار دینِ مجوس کا نہایت سرگرم مبلغ تھا۔ اسی نے باپ کو اس کے آبائی مذہب سے منحرف کر کے آتش پرست بنایا۔ جن لوگوں نے اس دین کے تبلیغی کارکنوں کے حکم سے سرتابی کی انھیں قتل کر دیا گیا۔ ارجاسپ بادشاہ ترکستان نے یہ خبر سنی تو ایران پر چڑھ آیا لیکن گشتاسپ نے اسفندیار کی امداد سے اسے شکست دی۔ اس کے بعد گشتاسپ نے

ارکانِ حکومت کے کہنے سُننے سے اسفندیار کو قید کر دیا۔ ارجاسپ نے اس موقعہ کو بہت غنیمت خیال کیا اور بلخ پر فوج کشی کر دی۔ لہراسپ سابق شاہِ ایران جس نے اپنے بیٹے گشتاسپ کے حق میں تخت چھوڑ دیا تھا۔ یہاں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ بادشاہ توران نے اس کو قتل کر ڈالا اور گشتاسپ کے بیٹوں کو گرفتار کر کے ترکستان بھیج دیا۔ شاہِ ایران شکست کھا کر قلعہ بند ہو گیا۔ اس مجبوری کے وقت اس نے اپنے بھائی جاماسپ کو بھیج کر اسفندیار کو رہا کرایا اور اس سے وعدہ کیا کہ اگر وہ ملک کو دشمنوں کے قبضہ سے چھڑا لے گا تو گشتاسپ تاج و تخت اُسے سونپ دے گا اور آپ عزلت نشین ہو جائیگا۔ اسفندیار نے ترکوں کو شکست دے دی اور چین و ماچین نیز ہندوستان کو فتح کر کے دینِ مجوس کی خوب تبلیغ کی تمام مفتوحہ ممالک میں جا بجا آتشکدے تعمیر کئے لیکن گشتاسپ نے اس کی ان خدمات کی قدر نہ کی اور اسے ایک بڑے خطرے کا مقابلہ کرنے پر اکسایا۔ گشتاسپ خلعتِ حکومت اتار کر گلیم گدائی اوڑھنا نہ چاہتا تھا۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اسفندیار سے وعدہ خلافی کرنا اچھا نتیجہ پیدا نہ کرے گا۔ اس لئے اُس نے اسفندیار کو اپنے راستہ سے ہٹانے کی یہ تدبیر کی کہ اُس سے کہا کہ تم نے اگرچہ بہت دور دراز ممالک کو فتح کر لیا اور ہر جگہ اپنے مذہب کو پھیلا دیا لیکن رستم جو ہمارے ملک کے وسط میں سکونت رکھتا ہے اطاعت و فرمانبرداری پر آمادہ نہیں ہوتا نہ ہمارا دین قبول کرتا ہے۔ پہلے تم اسے گرفتار کر کے میرے پاس لے آؤ۔ پھر میں اپنا وعدہ پورا کروں گا۔ اسفندیار نے کہا کہ آپ اپنے وعدے کے خلاف یہ گفتگو کر رہے ہیں رستم کو چھیڑنا قطعاً مناسب نہیں ہے۔ مگر میں آپ کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا۔

اسفندیار فوج آراستہ کر کے سیستان کی طرف چلا۔ رستم کو معلوم ہوا تو وہ استقبال کو دوڑا۔ اسفندیار نے باپ کی طرف سے پیام دیا کہ ہم جب سے فرمانروا ہوئے ہیں تم حاضر نہیں ہوئے نہ تم نے مبارکباد پیش کی۔ رستم نے جواب دیا کہ مجھے بادشاہ کی اطاعت سے انکار نہیں۔ لیکن شاہ جم جاہ کے اسلاف نے مجھے آزادی عطا کر کے حاضریِ دربار سے مستثنےٰ کر دیا ہے۔ تاہم اگر بڑھاپا دامن کش نہ ہوتا تو میں ضرور حاضریِ دربار کا شرف حاصل کرتا۔ رستم نے اسفندیار کو اپنے گھر لے جانا چاہا۔ مگر وہ راضی نہ ہوا۔ اُس نے رستم سے کہا کہ میرے باپ نے حکم دیا ہے کہ میں تمہارے ہاتھ پیر باندھ کر تمہیں دربار میں لے جاؤں۔ رستم اس سے بھی انکار نہ کرتا مگر زال اور دوسرے مشیروں کی رائے اس کے خلاف تھی۔ رستم اور اسفندیار میں بہت طویل گفتگو ہوئی۔ اسفندیار کو رستم کی گرفتاری پر اصرار تھا اور رستم اپنی اس ذلت سے برابر غضبناک ہو رہا تھا۔ آخر رستم نے جھلا کر کہا ؎

کہ گوید برو دست رستم بہ بند
نہ بندد مرا دست چرخِ بلند

اسفندیار اس کے تلخ جوابات سے سخت برہم ہوا اور غصہ میں رستم کے خاندان کی توہین کرنے لگا۔ رستم نے اپنے اسلاف کی ان سرفروشیوں کا تذکرہ کیا جو حکومتِ ایران کی خدمت کے سلسلہ میں وہ کر چکے تھے۔ پھر اُس نے خاندان کی عظمت و برتری بیان کرتے ہوئے کہا زال سام کا بیٹا ہے جس کا باپ نریمان بن کورنگ تھا اور کورنگ کی ماں کا سلسلۂ نسب ملاسگہ سے ملتا ہے۔ میرا حسب و نسب آفتاب کی طرح روشن اور بے داغ ہے۔ البتہ تو گشتاسپ کا بیٹا ہے اور تیرا دادا لہراسپ تنہا گھوڑے پر بیٹھا ہوا ایران میں مارا مارا پھرا کرتا تھا۔ اُسے کوئی پوچھتا تک نہ تھا تیری ماں ایک رومی عورت تھی۔ تجھے ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ میرے خاندان پر طعن کرے۔ دیر تک دونوں اسی قسم کی باتیں کرتے رہے۔ آخر میں اسفندیار نے کہا کہ میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں اپنی طاقت اور قوت کے بھروسہ پر کرنا چاہتا ہوں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ تو بوڑھا ہو گیا اور میں نہیں چاہتا کہ حالت مگراہی میں تو مارا جائے۔

رستم اسفندیار کے خیمہ سے اُٹھنے لگا تو اُس نے ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر بٹھا لیا۔ اور کہا کہ میں ہمیشہ مہمان کی عزت کرتا ہوں۔ پھر دونوں نے ایک ہی خوان میں کھانا تناول کیا۔ اسفندیار نے بہت کوشش کی کہ رستم کو دست بستہ گشتاسپ کے سامنے لے جائے لیکن رستم کسی طرح رضامند نہ ہوا۔ چنانچہ آخری فیصلہ کو لڑائی پر منحصر رکھا گیا۔ رستم اپنے گھر چلا آیا اور رات بھر سخت پریشان و مضطرب

رہا۔ صبح کو مسلح ہوکر میدان میں آیا۔ اُدھر سے اسفندیار نکلا دن بھر
دونوں مست ہاتھیوں کی طرح لڑتے اور ٹکراتے رہے۔ شام کو اپنی
اپنی قیام گاہ پر چلے گئے۔ رستم آج کی لڑائی میں زخمی ہوگیا تھا رات
بھر زخموں کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال میں مصروف رہا۔ صبح کو پھر
دونوں میں مقابلہ ہوا اور رستم نے اسفندیار کو ایک ہی تیر میں
مار کر گرا دیا۔ یہ واقعہ ۹۴۷ سنہ ہبوط میں ظہور پذیر ہوا۔ فردوسی نے
اس واقعہ کو دوسری طرح نظم کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

چو رستم گز اندر کمان سخت بود • بدان سان که سیمرغ فرموده بود
بزد تیر بر چشم اسفندیار • سیه شد جهان پیش آن نامدار

خاص طور پر آنکھ میں تیر لگانا اس غلط شہرت کی بنا پر ہے جو
اسفندیار کے متعلق اب تک پائی جاتی ہے یقینی یہ ہے کہ اسفندیار
روئیں تن تھا اور اس کے جسم پر تلوار یا تیر کارگر نہیں ہوسکتا تھا۔
لیکن یہ بات قرینِ قیاس نہیں ہے۔ رستم پر اسفندیار کی شجاعت
کا کافی اثر تھا۔ ممکن ہے اسی خیال سے کہ وہ نبرد آزمائی اور دست
بدست کی لڑائی میں اسفندیار کو مغلوب نہ کرسکے گا۔ اس نے دوشاخہ
تیر کمان میں جوڑ کر سر کیا ہو اور اس سے اسفندیار کی دونوں آنکھیں
پھوٹ گئی ہوں۔ بہرحال گز جھاؤ کو بھی کہتے ہیں جو دریا کے کناروں
پر پیدا ہوتا ہے اور ایک قسم کے تیر کو بھی کہتے ہیں جس کے کنارے
باریک۔ اور درمیانی حصہ موٹا ہوتا ہے۔ سمجھ میں نہیں کہ جھاؤ کی
لکڑی میں کیا ایسی کرامت تھی کہ سیمرغ نے اُسے تیر کی جگہ استعمال
کرنے کا مشورہ دیا۔ قیاس غالب یہی ہے کہ اُس نے بے پَر اور
پیکانی کا تیر لگانے کو کہا ہوگا۔ جسے گز کہتے ہیں۔ تاکہ وہ پَر یا پیکان
کی وجہ سے رک نہ جائے۔

رستم کی موت

رستم کا ایک علاتی بھائی شغاد کابل میں رہا کرتا تھا۔ حاکم کابل
کی لڑکی سے اس کی شادی بھی ہوگئی تھی۔ یہ بہت ہی مفسد اور حاسد
آدمی تھا۔ شاہِ کابل رستم کا خراج گزار تھا۔ ایک دن دونوں نے متفق
ہوکر رستم کو قتل کرنے کی سازش کی۔ اس سازش کے مطابق شغاد نے
سیستان پہنچ کر رستم سے شاہِ کابل کی شکایت کی کہ وہ اس کی باتوں
میں آگیا اور اس کے ساتھ کابل چل دیا۔ شغاد نے حاکمِ کابل کو خفیہ
خط لکھا کہ جو قرار داد طے ہوچکی ہے اُس کو عملی جامہ پہنانے میں دیر
نہ کرنی چاہئیے۔ بادشاہ نے یہ خط پڑھتے ہی ایک باغ میں چند
کنوئیں کھدوائے اور اُن میں دھاردار آلے تلوار خنجر وغیرہ گاڑ
دیئے۔ کنوؤں کے منہ پر گھاس وغیرہ رکھ کر انہیں چھپا دیا۔ رستم
کابل پہنچا تو شاہِ کابل سر و پا برہنہ بہت سے تحائف لیکر استقبال
کو گیا اور سر کو زمین پر رکھ کر قسم کھائی کہ جو کچھ آپ سے کہا گیا ہے
وہ سب غلط ہے میں تو آپ کا غلام ہوں۔

رستم اس فریب سے بالکل ناواقف تھا۔ وہ شاہِ کابل کے
اظہارِ اطاعت پر مطمئن ہوگیا۔ اور ایک بہادر آدمی ہمیشہ اس نوع
کی معذرت سے متاثر ہوا کرتا ہے۔ سازش، فریب اور شجاعت و
مردانگی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ فریب اور سازش کا سرچشمہ
بزدلی ہے۔ اس لئے بہادر آدمی کبھی سازشی دماغ لے کر نہیں آتا۔
وہ ہمیشہ فراخ دل، سادہ لوح اور روادار ہوتا ہے، اور کبھی کسی
بات کو اُس روشنی میں نہیں دیکھتا جس میں ایک فریبی اور دغا باز
آدمی اُسے دیکھ سکتا ہے۔ چنانچہ رستم بھی شاہِ کابل کی معذرت پر
قطعی مطمئن ہوگیا۔ اتنا مطمئن کہ اس نے حاکمِ کابل کی دعوت پر اُس کے
باغ میں آنا بھی منظور کرلیا۔ آگے آگے شاہِ کابل نہایت احتیاط کے
ساتھ کنوؤں سے بچ بچ کر چل رہا تھا۔ اس کے پیچھے رستم بہادرانہ
بے پروائی کے ساتھ آرہا تھا۔ اُسے شاہِ کابل کی نیت پر کوئی شبہ نہ
تھا۔ اس لئے وہ اس کی احتیاط پر غور نہ کرسکا۔ اور حقیقتاً شکوک و
شبہات کو بہادری سے اتنا ہی بَیر ہے جتنا بزدلی کو بہادری سے
اس لئے رستم کو کسی قسم کا شبہ نہ ہوا۔ چلتے چلتے دفعتاً رستم کے
گھوڑے کا پیر گڑھے میں جاپڑا اور وہ مع گھوڑے کے کنوئیں کی
تہ میں پہنچ گیا۔ رستم کا بدن تلواروں کی نوکوں اور تیروں کے چھیدنے
سے لہولہان ہوگیا۔ مگر رستم کسی نہ کسی طرح کنوئیں کے اوپر آگیا
اور شغاد سے جو اُس وقت وہاں موجود تھا کہا کہ مجھے اس وقت
کم سے کم تیر و کمان تو دے دو تاکہ درندوں کے حملوں سے محفوظ

رہوں تھا لم شغاد کو اس وقت بھائی پر کچھ رحم آگیا۔ اس نے تیر و کمان دے دی۔ رستم نے کمزوری اور بے طاقتی کے باوجود تیر چلے میں جوڑ کر شغاد کو تاکا۔ وہ بھاگ کر پیڑ کی آڑ میں چھپ گیا۔ لیکن رستم کا تیر بھی قضا کا تیر تھا وہ کمان سے نکلا اور پیڑ کو چھیدتا ہوا شغاد کے جسم میں ترازو ہو گیا۔ فردوسی کہتا ہے ؎

چو رستم چناں دید بفراعت دست ٭ چناں خستہ از تیر بکشاد شست
درخت و برادر بہم بر بدوخت ٭ بہنگام رفتن دلش بر فروخت
شغاد از پس زخم او آہ کرد ٭ تہمتن بدو درد کوتاہ کرد
چنیں گفت رستم بہ یزداں سپاس ٭ کہ بودم ہمہ سال یزداں شناس
ازیں پس کہ جانم رسیدہ بہ لب ٭ بریں کین من تا گذشتہ دو شب
بگفت ایں و جانش برآمد زتن ٭ برو زار گریاں شدند انجمن

زال کو اس حادثہ کی قطعاً اطلاع نہ تھی۔ وہ ایک دن رستم کی ماں رودابہ کے ساتھ بیٹھا ہوا کھانا کھا رہا تھا۔ دفعتہً کوّے نے بولنا شروع کیا۔ زال اس کی آواز سنتے ہی رونے لگا۔ رودابہ نے پوچھا کیا ہوا۔ زال نے جواب دیا۔ کوّا ایک نہایت وحشت ناک خبر لایا ہے اور وہ ایسی مصیبت کی خبر دے رہا ہے جو بھوک کے بعد دنیا کے سارے مصائب سے زیادہ سخت اور تکلیف دہ ہے۔ رودابہ نے زیادہ اصرار کیا تو زال نے کہا کہ رستم اور شغاد مر گئے۔ رستم کی ماں رونے پیٹنے لگی اور نہایت نفرت سے بولی کہ تم بھی عجیب آدمی ہو کہ بھوک کی مصیبت کو اس مصیبت سے بڑا کہتے ہو۔ خدا کی قسم میں کھانا پینا چھوڑتی ہوں اور جب تک زندہ ہوں کچھ نہ کھاؤں گی نہ پیوں گی۔ اسی حال میں جان دے دوں گی۔ رودابہ نے اپنے عہد کے مطابق سات دن تک خور و نوش پر رغبت نہ کی اس عرصہ میں وہ نہایت کمزور ہو گئی۔ آنکھوں میں تیرگی آگئی۔ اتفاق سے وہ رات کو باورچی خانہ میں گئی۔ اور یہ خیال کر کے کہ کھانے کی کوئی چیز مل جائے ہاتھ بڑھایا۔ اتفاقاً ایک مرا ہوا سانپ مٹھی میں آگیا وہ اسی کو منہ میں لے جانے لگی ایک لونڈی نے دیکھ لیا اس نے شور مچایا کہ تمہارے ہاتھ میں سانپ ہے کہیں کھا نہ لینا رودابہ نے لونڈی کے متنبہ کرنے پر سانپ پھینک دیا اب اسے معلوم ہوا کہ زال ٹھیک کہتا تھا۔ وہ اپنا عہد نباہ نہ سکی اور غذا کھانے پر مجبور ہو گئی۔

رستم کی موت کے سلسلہ میں یہ بات بہت زیادہ غور و فکر کی محتاج ہے کہ زال نے کوّے کے بولنے سے کیونکر یہ قیاس کر لیا کہ رستم اور شغاد دونوں مر گئے۔ ممکن ہے کہ اس زمانہ میں کوّے کا کھاتے وقت بولنا بری فال سمجھا جاتا ہو۔ مگر اس صورت میں اس کے بولنے کو ... کسی حادثہ کا پیش خیمہ کہہ سکتے ہیں۔ حادثہ کا پورا حال کیوں کر وثوق کے ساتھ اس سے معلوم ہو سکتا تھا۔ یہ بات اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک آدمی پرندوں کی بولیوں سے پورے طور پر واقف نہ ہو۔ اگرچہ مذہبی نقطۂ نظر سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت سلیمان پرندوں کی زبان سمجھتے تھے۔ مگر یہ معجزہ صرف آپ ہی کی ذات تک محدود تھا کیخسرو بادشاہ ایران حضرت سلیمان کا ہم عصر تھا اور حضرت سلیمان نے اس کو گرفتار بھی کرنا چاہا تھا۔ مگر وہ بلخ کی طرف بھاگ گیا تھا۔ ممکن ہے زال جو اس زمانہ میں موجود تھا پرندوں کی بولیوں کو سمجھتا ہو۔ یا اس وقت خاص خاص لوگ اس سے واقف ہوں۔ لیکن یہ بھی کوئی سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے یہ علم اور روشنی کا زمانہ ہے۔ آج اس قسم کی بات کا کہنا بھی مضحکہ انگیز ہے تاہم اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پرندوں کی عادات اور ان کی خصوصیات کا سمجھ لینا ممکن ہے۔ لیکن نہ اس حد تک کہ اب پرندوں کی بولیاں سمجھ میں آنے لگیں۔ ممکن ہے آئندہ تحقیقات سے کوئی ایسی ترکیب ایجاد کر لی جائے۔

رستم کے بعد اس کے خاندان پر سخت تباہی آئی۔ اگرچہ حاکم کابل سے رستم کے بیٹے فرامرز نے انتقام لیا اور اس کو نیز اس کے افراد خاندان کو تہ تیغ کر دیا۔ مگر اس کے بعد بہمن نے اپنے باپ اسفندیار کا بدلہ لینے کی غرض سے سیستان پر چڑھائی کی فرامرز سے اس کا سخت مقابلہ ہوا۔ فرامرز اور اس کے تمام اعزہ اس جنگ میں کام آگئے۔ زال کو بہمن نے گرفتار کر لیا اس طرح یہ خاندان بظاہر ختم ہو گیا مگر حقیقت میں رستم آج بھی زندہ ہے اور اس کا نام قیامت تک اسی طرح زندہ رہیگا۔ رستم کے حالات میں اس کے بیٹے سہراب کا واقعہ ہم نے صرف اس بنا پر نظر انداز کر دیا ہے۔ کہ وہ بہت زیادہ مشہور ہے۔ بہت سے افسانے اور ڈرامے اس کے متعلق شائع ہو چکے ہیں۔ ✦

از حضرت نجم آفندی

اُس نظر کی چوٹ کھا کر رہ گئے
ہم ہی تھے جو مسکرا کر رہ گئے

واہ کیا مرنے چلے تھے بے اجل
زندگی سے ہاتھ اُٹھا کر رہ گئے

جانے والے اُن کی منزل کے بہت
دل ہی دل میں پھیر کھا کر رہ گئے

اُن کی سج دھج کا نہ نکلا ایک بھی
نام کیا کیا لب پہ آ کر رہ گئے

ہم کہاں تکلیفِ خود بینی کہاں
دل کو آئینہ بنا کر رہ گئے

کیا قیامت ہے تمھاری سادگی
اچھے اچھے رنگ لا کر رہ گئے

پاکبازانِ ازل پر رحمتیں
کن گنہگاروں میں آ کر رہ گئے

ہم ہی اچھے دل کی دل میں رہ گئی
جو سُنا پائے سُنا کر رہ گئے

آستاں نزدیک تھا ہم دُور تھے
اپنے اوپر رحم کھا کر رہ گئے

خاک کے پُتلوں پہ ہنستی ہے زمیں
آسماں تک سر اُٹھا کر رہ گئے

بڑھ چلے تھے دل کی منزل سے مگر
نجم کچھ آہٹ سی پا کر رہ گئے

محبّت کی نشانی

از محترمہ مضطر رضویہ صاحبہ ترمذی ؟

اس ناپاک دُنیا سے دور ــــــ بہت دور ــــــ اُفق کے اُس پار ــــــ ایک مقدس ہستی تھی۔ حسُن کی ــــــ جہاں زہرہ اپنی کافوری انگلیوں سے رباب عشق بجا رہی تھی۔ معصوم فرشتے اس سرود ازلی سے مست وبیخود عالم وجدان میں تال دے رہے تھے۔ فرش سے عرش تک ہر چیز اس لطیف ہنگامے میں موسیقی کی نرم ونازک لہروں پر تیر رہی تھی۔

نور کے شفاف تالاب میں اُمنگیں رنگین مچھلیوں کی طرح تلملا رہی تھیں۔ آرزوئیں عطر بیز پھولوں کی طرح ہچکولے لے رہی تھیں۔ حیائیں باد سحر کے ملکوتی نغموں کی طرح فضاؤں میں تھرتھرا رہی تھیں ــــــ فضائیں تحریم محبت کے لئے عبودیت کے مقدس جذبہ کی طرح ساکن تھیں مگر طوفان ہائے نادیدہ در بر لئے ہوئے۔

سفید گلاب کے ایک تختہ پر ایک مست شباب ــــــ حسین دوشیزہ ــــــ [illegible] لئے بے داغ پھولوں کا ایک ہار گوندھ رہی تھی ــــــ وہ مسرور تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ پھول نہیں ہیں بلکہ بے لوث تمناؤں کا ایک انبار ہے جو اپنے "معبود محبت" کے سامنے پیش کرنے کے لئے ایک لڑی میں پرو رہی ہے ــــــ یہ ہار آج وہ اپنے منتہائے حیات کی بلوریں گردن میں حمائل کردیگی۔ حسین مالن دیوانگیٔ شوق کی انتہا چاہتی تھی ــــــ وہ کچھ گنگنا رہی تھی ــــــ نغمہ محبت یا انشائے عبودیت ــــــ اور ــــــ دور ــــــ ایک کنج میں چھپا ہوا ایک خوشجمال نوجوان اس استغراق کو دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا ــــــ "یہ سب کچھ میرے لئے ہے"۔ اور جب وہ یہ الفاظ دُہراتا تو اُس کا سر بلند ہو جاتا۔ سینہ تن جاتا اور یوں محسوس کرتا کہ اب اس کے بازوؤں میں دونوں عالم تہ وبالا کردینے کی طاقت موجود ہے۔

ہار مکمل ہوگیا چھپ کر دیکھنے والا اپنی "کمینگاہ محبت" سے نکلا۔ قدموں کی چاپ پر اس حسینہ نے نگاہیں اُٹھائیں۔ وہ نگاہیں جن میں معصومیت والوہیت رقص کُناں تھی اور ہار اُس کی گردن میں پہنا دیا۔

نوجوان نہ جانتا تھا کہ اُس کا معاوضہ کیا ہو سکتا ہے۔ وہ تو نگاہوں کے سیلاب میں بہا جا رہا تھا۔ نہ جانے کس طاقت نے اُس کے بازو اُٹھا دیئے اور کس نے اس پیکر شعریت کو ان بازوؤں میں دھکیل دیا۔ دوشیزہ کے لب نوجوان کے کانوں میں سرگوشی کے انداز میں کہہ رہے تھے۔ "یہ ہے میرا ہدیۂ محبّت، جس کی خوشبو ہمیشہ ہمیں مسرور رکھیگی"۔ نوجوان نے سرگوشی کو اپنے لبوں میں دبوچ لیا وہ بولا۔ "اور یہ ہے میرا پیمان محبّت، جسے دُنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی"۔

شادی اور کانگرس!

ایک دلچسپ مزاحیہ افسانہ!

از جناب شفیق الرحمٰن صاحب میڈیکل کالج۔ لاہور

آپ کہینگے تو کہ بھلا شادی کا کانگرس سے کیا تعلق ہوسکتا ہے؟ مگر میں عرض کرونگا کہ تعلق ہے اور ہوسکتا ہے۔ میں کانگرس کا مشکور ہوں کہ اس نے مجھے ایک معاملہ میں بڑی مدد دی۔ وہ قصہ سُنیئے۔

امتحان ختم ہوا ہی تھا کہ گھر سے ایک تار نما خط ملا "کشمیر وغیرہ مت جاؤ۔ یہاں جلد پہنچو، تمھارا رشتہ ہوگا۔" لاحول ولا، یہ رشتہ کی بھی ایک ہی رہی، گویا میاں تو پڑھ رہے ہیں کالج میں اور بیوی گھر میں بیٹھی دُعا مانگ رہی ہیں۔ اور دعا بھی کیا کہ "یا الٰہی اُن کو پاس کر۔" اب اس "اُن" میں کسی خاص شریف آدمی کی خصوصیت تو نہ ہوئی۔ لہٰذا ایسی بے معنی دعا عرش سے ٹکرا کر واپس آجاتی ہے۔ اگر دعا مانگی جائے تو اس شخص کی طرح مانگی جائے جس نے دریا میں ڈوبتے وقت کہا تھا۔ "یا الٰہی قلندر بخش کو بچا۔ اس قلندر بخش کو نہیں جو ڈاکخانے کے پاس رہتا ہے بلکہ اس کو جو چوک میں نتھو حلوائی کے پاس رہتا ہے۔"

بیچیئے دُعا کی دُعا ہوگئی اور فرشتوں کو بھی تعمیل حکم میں سہولت ہوگئی۔ میں کہاں آپہنچا—— خیر! اسی مضمون کے کئی خطوط ملے مصیبت یہ تھی کہ جہاں وہ رشتہ کرنا چاہتے تھے وہ مجھے ناپسند تھا اور جہاں میں چاہتا تھا وہاں لڑکی کے والدین ناخوش تھے لہٰذا نا ممکن تھا۔ نتیجہ اس رسہ کشی کا یہ نکلا کہ میں نے دل میں سوچ لیا کہ شادی فی الحال منعقد نہ کی جائے چھٹیاں ہوئیں۔ گھر پہنچتے ہی شادی کے فوائد پر طویل و بسیط لیکچر دیئے گئے اور غیر شادی شدہ حضرات کی بُرائیاں بیان کی گئیں۔ کئی مرتبہ تو حدیث شریف کے صفحات بطور شہادت پیش کیئے گئے کہ ہر بالغ مسلم پر فرض ہے اخلاق و قانونی کہ وہ لگے ہاتھوں شادی کا ارتکاب کرلے اور نیچے ان بُرائیوں سے جو کہ ہوتی ہیں پیدا اس شخص میں جو کہ نہیں کرتا ہے شادی۔

کوئی ہفتہ بھر اسی قسم کا مشاعرہ ہوتا رہا آخر تنگ آکر میں نے کسی کے ہاتھ یہ کہلوا دیا کہ میں ابھی اور پڑھنا چاہتا ہوں جس پر چند ریویو سنائی دیئے۔ وھو ہٰذا۔

"بیوی کیا چھاتی پر سوار ہوکر کہیگی کہ مت پڑھو۔"
"شادی شدہ کیا پڑھتے نہیں؟"
"وہ غریب کیا گلے میں رسہ ڈال کر باندھ لیگی۔"
"بیوی سے تو رزق اور علم دونوں میں برکت ہوتی ہے۔"
"اجی یہ لڑکا ہی شرارتی ہے۔" وغیرہ وغیرہ

اور لطف یہ تھا کہ جن کے ہاں رشتے کی تجویز تھی وہ کسی طرح بھی پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ چوبیس گھنٹے دُم چھلا بنے رہتے تھے۔ باہر جاتا تو وہ لوگ تواضع کرتے اور اندر آتا تو کئی عدد بڑی بی یاں موجود ہوتیں، جو کبھی مجھے ہنسا کر دیکھتیں کبھی میری چال دیکھتی تھیں، کبھی کھانا کھاتے وقت نوالے گنتیں، اور دیکھتیں کہ کہیں ہیر پھیر تو نہیں کر رہا ہے۔ چاء پیتے وقت اس امر کا خاص خیال رکھا جاتا کہ شکر کس قدر ڈالتا ہے؟ اگر زیادہ ہو تو کہیں چٹورا تو نہیں اگر کم ڈالوں تو کہیں ذیابطیس کا عارضہ تو لاحق نہیں۔ سگرٹ تو نہیں پیتا۔ تاش تو نہیں کھیلتا۔ گانے کس قسم

گاتا ہے۔ خط لکھ کر بھاڑتا یا جلاتا تو نہیں۔ ساس کے منہ میں کتنے لمبے دانت ہیں اور اُن پر کہیں تمباکو کی زردی تو نہیں جمی ہوئی؟ یہ کیسا ہے؟ کیوں ہے؟ کب؟ اور کہاں ہے؟ وغیرہ وغیرہ

کالج سے گھر گئے تو تھے تفریح کیلئے اور یہاں نئی مصیبت میں پھنسے اور جس لڑکی سے میں رشتہ چاہتا تھا اُس کی والدہ مجھ سے ناراض تھیں۔ کیوں ناراض تھیں؟ یہ مجھے معلوم نہیں۔

خدا نے میری دعا سن لی اور ایک ہستی کے دل میں میرے لئے ہمدردی پیدا کر دی۔ یہ کون تھا؟ پڑوس کی ایک لڑکی جو کہ مجھ سے ذرا بڑی تھی۔ جسے میں تفریحاً آپا کہا کرتا تھا۔ اُس نے نہ صرف مجھ سے لفظی ہمدردی ہی ظاہر کی بلکہ میرے لئے ایک دردناک اپیل گھر کے ہائیکورٹ میں پیش کی جو ٹھکرا دی گئی۔

ایک رات میں چھت پر لیٹا کچھ سوچ رہا تھا کہ منڈیر سے آواز آئی "میاؤں" میں چونک پڑا اور فوراً منڈیر پر پہنچا۔ یہ وہی آپا تھیں۔

"کیا ہے؟—" میں نے پوچھا۔

"وہاں تمھارے متعلق باتیں ہو رہی ہیں۔" انھوں نے سامنے کے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ مکان انھیں کا تھا جو مجھے نالائق سمجھ کر دامادی کے معزز عہدے سے جواب دے رہے تھے۔

"اچھا تو پھر—؟" میں نے بےصبری سے کہا۔

"منڈیر سے نیچے اُترو۔ سامنے کی دیوار پھلانگ کر چوبارے کی سیڑھیاں طے کرکے پہنچ جاؤ اور خود سن لو۔ میں یہاں پہرہ دونگی۔"

"اور جو کسی نے دیکھ لیا تو پٹائی نہ ہوگی؟"

"اگر کوئی آگیا تو میں میاؤں کر دونگی۔ لو اب جاؤ۔"

میں چپکے سے منڈیر سے نیچے اُترا۔ دبے پاؤں اُن کی چھت پر جا پہونچا۔ صحن میں ایک گھنا درخت کھڑا تھا۔ اُس کی آڑ لے کر ٹہنیوں میں سے جو دیکھتا ہوں تو نیچے آل انڈیا وومنز کانفرنس ہو رہی تھی۔ خدا جانے کتنی خواتین بیٹھی تھیں۔ بیچ میں ہماری "ناہونے والی خوشدامن" اور ان کے پاس وہی محترمہ تشریف فرما تھیں جن سے میں شادی کا طلبگار تھا۔ میں آہستہ سے منڈیر کے نزدیک آگیا اور باتیں سننے لگا۔

ایک بڑی بی بولیں۔ "نہ بہن ویسے تو لڑکا تندرست ہے مگر مجھے اُس کی عادتیں پسند نہیں۔ کمبخت داڑھی، مونچھ منڈا، یونہی ڈنڈا سا ہلتا رہتا ہے۔ گلے میں ایک رنگین چیتھڑا لٹکا کر سر پر گوڑی دیگچی سی اوندھی مار کر دیدے مٹکاتا پھرتا ہے جب دیکھو تب ہنس رہا ہے اور جو آدمی ہر وقت دانت نکالے وہ مجھے زہر دکھائی دیتا ہے۔"

دوسری بولیں "اجی وہ لڑکی ہی کون سی پدمنی ہے۔ دبلی ایسی کہ اگر آندھی آئے تو اُڑ ہی جائے۔ اور لڑکا رہ جائے یونہی ٹاپتا۔ ناک ایسی کہ اگر پانی پینے لگے تو پانی پہلے ناک میں جائے اور پھر منہ میں۔ آنکھیں اتنی چھوٹی کہ ہاتھ سے ٹٹولنے ہی سے پتہ چلے۔ منہ کوئی ڈیڑھ ہاتھ کا خدا جھوٹ نہ بلوائے جب ہنستی ہے تو بارہ دری کھل جاتی ہے اور پھر ملتانی جیسا رنگ صحت ایسی جیسے مہینوں سے گھر میں بھوک ہڑتال ہے۔"

"توبہ کیجئے۔" وہی میری محترمہ بولیں۔ "اتنی بُری بھی نہیں۔ بھلا ایسا انسان بھی کہیں ہو سکتا ہے جیسا حلیہ آپ نے بتایا ہے ویسا آدمی اگر کہیں پیدا ہو جائے تو لوگ دہشت سے مر جائیں۔"

میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ تیکھا ناک نقشہ۔ ہلکی پھلکی نازک سی ایک نیلے لباس میں ملبوس ہاتھ میں شربت کا گلاس لئے ساقی کی خدمت سرانجام دے رہی تھی۔ میں نے دل میں دعا مانگی کہ یا الٰہی! اگر واقعی ہمیں پھنسانا منظور ہے تو اسی سے شادی کیجیو۔

ایک خاتون بولیں۔ "نہیں بہن لڑکے میں اتنے عیب نہیں جتنے تم بتا رہی ہو۔ ہاں البتہ بےنماز ضرور ہے۔ اور داڑھی مونچھ منڈے کبھی بھی بخشے نہیں جائینگے۔ خیر جب اس کی عمر آئیگی آپ کریگا۔ بیچارہ اچھا بھلا تندرست ہے۔"

"تندرست ہے تندرست! یہ کیا بک بک لگا رکھی ہے۔" ایک صاحبہ بولیں۔ "کوئی کشتی تھوڑا ہی لڑوانی ہے یا ہل میں جوتنا ہے اُسے کیا بڑا پہلوان کہیں کا۔ ہمیں ایسا نہیں چاہیے۔"

"تو پھر آپ کے خیال میں تپ دق کا مریض ہونا چاہیئے۔" وہی نیلی ساڑی والی محترمہ بولیں۔

"چپ رہ لڑکی۔ تو مدرسے میں انگریزی کیا پڑھی سر پر ہی آگئی نہ چھوٹوں کا لحاظ نہ بڑوں کی شرم۔" یہ انھیں ڈانٹ دی گئی۔

"ایک بات تو بتاؤ بہن"۔ ہماری نہ ہونے والی خوشدامن سے سوال کیا گیا۔ "آخر تم نے اس لڑکے میں کیا کیا عیب دیکھے جو رشتے سے انکار کر دیا"۔

"اجی کوئی ایک عیب ہو تو گنواؤں بھی وہ کمبخت تو نرا عیبوں کی پوٹلی ہے۔ سب سے پہلے تو اُس کے پیشے کو لو۔ ہر وقت غلاظت میں رہنا۔ صبح سے شام تک بیماروں کی چیخیں سننا۔ چوبیس گھنٹے کہیں چیر رہا ہے کہیں سونگھ رہا ہے۔ نہ خدا کا نہ رسول کا۔ بڑا بات تو یہ ہے کہ جب سے یہ ڈاکٹر آئے ہیں نئے نئے مرض دنیا میں پھیل گئے۔ اچھا اب کوئی مجھے ایک فائدہ تو ڈاکٹروں کا بتا دے"۔

"اگر خدا نخواستہ کسی کو سخت تکلیف ہو تو اُسے پھر کون یاد آئیگا"۔ میری محترمہ بولیں۔

"خدا یاد آئیگا"۔ آگے سے جواب ملا۔ "اور اُس کے بعد مولوی صاحب وہ کچھ پڑھکر دم کر دینگے اُن کے بعد حکیم جی۔ ڈاکٹر کا تو میں نام بھی نہ لونگی۔ ہاں بہن! ــــ تو میں عیب گنوا رہی تھی اس کے۔ دوسرا عیب اُس میں یہ ہے کہ وہ طرح طرح کے وحشیانہ کھیل کھیلتا ہے سب سے بُرا کھیل تو باک سین (یہ اُن کا باکسنگ کی طرف اشارہ تھا) ہے جسے لوگ گھونسے بازی کہتے ہیں"۔

"یہ کیا کہا تم نے؟ کیا معنی ہوئے اس کے؟ گھونسلے بازی؟"۔

"جی نہیں ــــ گھونسے بازی"۔

"اخاہ! اب میں سمجھی" بڑی بی بولیں۔ "ڈھکوسلے بازی! وہ لڑکا ڈھکوسلے گھڑتا ہوگا"۔

"نہیں بڑی بی۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ دو باؤلے آدمی ہاتھوں پر تھیلے باندھکر اور سینہ ننگا کر کے ایک چبوترے پر چڑھ جاتے ہیں۔ لوگ چاروں طرف سے باندھ دیتے ہیں کہ کبھی یہ دونوں باہر نہ نکل جائیں پھر وہ ایک دوسرے کو مارنا شروع کرتے ہیں مارتے مارتے ایک دوسرے کو لہو لہان کر ڈالتے ہیں اور آخر میں ایک دوسرے کو جان سے مار دیتے ہیں"۔

"توبہ توبہ اماں! جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے"۔ وہی محترمہ بولیں "مار کہاں ڈالتے ہیں اور بھلا کہیں جان سے مار بھی سکتے ہیں البتہ چوٹیں خاصی آجاتی ہیں مگر اس سے انسان مضبوط ہو جاتا ہے اور اگر کہیں لڑائی ہو جائے تو مار نہیں کھا سکتا"۔

"آخر تجھ سے کون پُوچھ رہا ہے؟ یونہی بولے جا رہی ہے بے شرم کہیں کی۔ کیا لگتا ہے وہ تیرا، جو یوں حمایت کر رہی ہے اُس کی؟" پھر ایک ڈانٹ ملی اور محترمہ کا چہرہ نیچا ہو گیا۔

"ہاں بہن! اور وہ لڑکا ہاکی بھی کھیلتا ہے جس میں بہت سے لڑکے ڈنڈے ہاتھوں میں لے کر ایک لوہے کی گیند زمین پر پھینک دیتے ہیں جو غریب گیند کو چھوتا ہے سب کے سب ڈنڈے مار مار کر اس کا سر پھوڑ دیتے ہیں۔ دیکھو نا بُوا! ہمیشہ آئندہ کی سوچنی چاہیئے۔ اگر اس لڑکے کی یہی حالت رہی اور کل کلاں کو یہ ہاتھ پیر تڑوا کر یہ گھر بیٹھ رہا تو پھر؟ یا کسی روز غصے میں کسی بچے کو مارنے لگے تو مارے گھونسوں کے جان ہی نکال دے بابا کیا اعتبار ہے ایسے لڑکے کا اور پھر لڑکی کے واسطے علیحدہ کی سولی گڑی رہیگی اور ہاں ایک بات اور یاد آگئی ــــ" "وہ مضمون لکھتا ہے"۔

"تو بہن مضمون تو ہمارا ننھا بھی لکھتا ہے۔ بکری گائے اور اونٹ پر ایسے ایسے جواب مضمون لکھتا ہے کہ ماسٹر دنگ رہ جاتے ہیں"۔

"اجی نہیں، سوال مضمون یا جواب مضمون، بلکہ خالی مضمون، کوئی جھوٹ کا قصہ یا کہانی، یا یونہی بکواس۔ بس جو دل میں آگئی لکھ مارتا ہے اور پھر اُسے چھپوا دیتا ہے۔ اب اگر وہ خدا نخواستہ کہیں یہاں کھڑا سُن رہا ہو تو سب باتیں لکھ کر چھپوا دے۔ اب تم ہی بتاؤ ایسے سے ڈرنا چاہیئے یا نہیں ــــ؟" (سب نے اثبات کے طور پر سر ہلا دیئے)

"کیا بتاؤں بہن، کچھ کہنے کو دل نہیں چاہتا۔ لو ایک اور سندلیہ لو۔ وہ لڑکا ایکٹنگ بھی کرتا ہے"۔

اس عجیب لفظ پر سب کی نگاہیں اوپر کو اُٹھ گئیں۔

"دیکھئے میں سمجھاؤں آپ کو اس کے معنی۔ آپ نے بھانڈ۔ میراثی یا قوال وغیرہ تو دیکھے ہونگے اور خاص طور پر کالو قوال کا اللہ ہُو تو ضرور سُنا ہوگا۔ وہ لڑکا بس اسی طرح نقلیں اُتارتا ہے۔ بھان متی کا تماشہ بھی کرتا ہے۔ ناچتا بھی ہے گاتا بھی ہے کبھی راجہ بنتا ہے تو کبھی فقیر کبھی پٹواری بن جاتا ہے تو کبھی ڈپٹی کمشنر"۔

"کبھی بلی بنتا ہوگا اور کبھی اونٹ"۔ ایک بڑی بی بولیں۔

"کہہ جو رہی ہوں کہ سارے بھیس بدلتا ہے اور پھر ہزاروں لوگوں کے سامنے کبھی چلاتا ہے تو کبھی ہنستا ہے کبھی بلخیت رونے لگتا ہے"

"تو پھر پاگل ہوا وہ، علاج نہیں کرواتے اُس کا؟ سنا ہے کہ باولے کتوں کے کاٹے ہوؤں کا علاج کسولی میں ہوتا ہے۔ فتّو نے وہیں علاج کرایا تھا۔ کیوں بوا نصیبن اُس کے بچنے کی اُمید بھی تھی کوئی؟ ——"

جن خاتون کا اسم شریف بوا نصیبن تھا اُنھوں نے دور ہی سے سر ہلا دیا۔

"اور ہُن! —— پچھلے سال اُس نے ایک ڈرامہ کیا جس میں وہ ایک نواب بنا تھا۔ اس لئے سب کے سامنے مونچھیں منڈوائیں اور پھر اپنی بیگم سے ——"

"کیا کہا بیگم؟" ایک بڑی بی چلا کر بولیں۔ "تو گویا وہ شادی شدہ ہے؟"

"جی نہیں! ایک لڑکے کو زنانے کپڑے پہنا کر بیگم بنایا گیا تھا" میری محترمہ بولیں۔

"خیر جس طرح بھی ہوا اور جو کچھ بھی ہوا سب کچھ فضول تھا بھلا ایسے رُسوا اور خوار کو کون پسند کرتا ہے۔ جس نے دیکھا اُسی نے لعنت بھیجی۔"

"مگر اخباروں میں تو بڑی تعریف نکلی تھی۔ دیکھنے والے بھی لوٹ پوٹ ہو گئے۔" محترمہ بولیں۔

"اور کمبخت تجھے کیا ہو گیا ہے جو یہاں بیٹھی بٹھائی اس پر لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی۔" ایک خطرناک بڑی بی بولیں۔ "نگوڑی کنواری ہو کر یہ ڈہائی ہاتھ کا ڈنڈا اُسنر میں کہاں سے رکھ لیا۔ جب دیکھو قینچی کی طرح کتر کتر زبان چل رہی ہے۔ اس موئے اونٹ پر لٹو ہوئی پھرتی ہے —— (محترمہ کی والدہ سے مخاطب ہو کر) تو اس ڈاکٹر کو اپنی لڑکی دیدے دو نفل کا ثواب ہوگا۔ ورنہ یہ بیچاری پھڑک پھڑک کر جان دیدیگی۔ توبہ توبہ بے شرمی کی بھی حد ہو گئی۔"

نتیجہ یہ ہوا کہ میری محترمہ کو محفل سے اُٹھا دیا گیا۔ ادھر سے آواز آئی "میاؤں" میں فوراً بھاگا اور اپنی چھت پر جا کر دم لیا۔ سارا قصہ آپا کو سنایا جس پر وہ مُسکرائیں اور بولیں۔ "وہ لڑکی تو تم سے بہت خوش ہے۔ تمھارے مضمون پڑھتی ہے۔ تمھاری بڑی تعریفیں کرتی ہے۔ اور تمھاری ایک تصویر بھی اُس کے پاس رکھی ہے۔ پچھلے مہینہ جب اُس نے سنا کہ تمھارا امتحان ہو رہا ہے تو غریب دُعا بھی مانگتی رہی کہ تم کامیاب ہو جاؤ ——"

"ارے۔" میرے مُنہ سے بیساختہ نکل گیا۔

"ابھی وہ تو کمبخت اس کی والدہ ہی رضامند نہیں ہوتی لڑکی تو بہت خوبصورت ہے۔ لکھی پڑھی ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ تمھاری بڑی قدر کرتی ہے۔" وہ بولیں۔

"دیکھئے گا جناب بس اگر کچھ شادی وادی ہو گی تو اُسی سے ورنہ کہیں بھی نہیں ہونے کی۔ یہ بات آپ نے پہلے سے کیوں نہ بتائی اب کیا کیا جائے ——؟"

"میرے خیال میں تو تم پہلے اپنا اس موجودہ رشتے سے پیچھا چھڑاؤ پھر دوسرے کے لئے کچھ سوچیں گے۔" اُنھوں نے کہا۔

کوئی آدھ گھنٹہ ہم سوچتے رہے۔ یکایک وہ اُچھل پڑیں ——

"لاؤ کان ادھر ——!" اُنھوں نے ایک عجیب و غریب تجویز بتائی جو میرے فرشتوں تک کو بھی معلوم نہ تھی۔ وہ یہ تھی کہ میرے ہونے والے خُسر جو کہ ایک ہیڈ ماسٹر تھے کانگریس کے سخت خلاف تھے۔ "بس اگر تم یہ ثابت کر دو کہ تم کانگرسی ہو تو وہ تمھیں اپنا جانی دشمن سمجھیں گے۔" اُنھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

واقعہ یہ تھا کہ مجھے اگلے روز ہی اُن کے یہاں جانا تھا کیونکہ اُنھوں نے ازراہ شفقت مجھے اپنے یہاں بُلا بھیجا تھا۔ اس سے اچھا موقع ملنا ناممکن تھا۔ کافی دیر غور و خوض کے بعد ہم دونوں نے ایک تقریر تیار کی ری ہرسلیں کیں۔ اُنھوں نے ایک کہنہ مشق ڈائرکٹر کی طرح مجھے اچھی طرح سے تیار کر دیا اور چلتے وقت بولیں۔ "وقت مقررہ سے پورے آدھ گھنٹہ پہلے پہنچنا اور جب اُن کے آنے کی آہٹ آئے تو لیکچر شروع کر دینا۔ ہاں یہ خیال رہے کہ تمھارے لب و لہجہ سے یہ معلوم ہو کہ تم ایک مجمع کو مخاطب کر رہے ہو۔ کہیں کہیں ٹھہر کر وقفے دینا۔ سمجھ گئے ہونا۔"

میں نے سر ہلا دیا۔

میں علی الصُبح اُٹھا۔ ایک مرتبہ پھر ری ہرسل کی۔ سفید کپڑے پہنے حالانکہ گھر سے مجھے بہترین سوٹ پہننے کی تاکید کی گئی تھی۔ ایک کھدر کی ٹوپی پہنی اور بردکھوے کے لئے روانہ ہو گیا۔ وہاں جا کر دیکھا تو میدان صاف تھا۔ خیر، پورے گھنٹے تک ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے میں اُن کا انتظار کیا۔ گھڑی نے نو بجائے اور میں کھڑکی سے لگ کر کھڑا ہو گیا

بمشکل پانچ منٹ گذرے ہونگے کہ کھٹ کھٹ کی آواز آئی۔ میں سمجھ گیا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب ہیں۔ میں نے کھڑکی ذرا سی کھولدی اور خود جلدی سے میز پر چڑھ گیا۔ کھڑکی کی طرف پیٹھ کرکے آہستہ آہستہ تقریر شروع کردی اب ساری تقریر تو کیا بتاؤں چند فقرے لکھتا ہوں۔

"پیارے بھائیو! پیاری بہنو!! میں آج پھر آپ کے سامنے بول رہا ہوں۔ جو قدر آپ نے میری پچھلی تقریر کی کی تھی اُس کا میں مشکور ہوں...... آج میں اُس سب سے اہم گتھی کو سلجھانا چاہتا ہوں جس کی کھٹک ایک عرصہ سے ہمارے سینوں میں پھانس کی طرح چبھ رہی ہے (ہیڈ ماسٹر کھڑکی میں سے مجھے دیکھ رہے تھے) بھلا جب تک قربانیاں نہ ہوں۔ جب تک زندگیاں برباد نہ کی جائیں جب تک (چلاکر) بھارت ماتا کے سپوتوں کا خون پانی کی طرح نہ بہے تب تک آزادی کہاں؟ پیارے سمجھو مرجاؤ ـــــ کٹ جاؤ، یا پھر ڈوب کر مرجاؤ۔ میں ایک سچا کانگرسی ہوتے ہوئے کہتا ہوں کہ اگر ہر ایک بھارت کا لال تھوڑی بہت ذمہ داری بھی محسوس کرنے لگے تو (چٹکی بجاکر) آج سوراج مل جائے۔ میں نہیں سمجھتا کہ لوگ کانگرس کو برا کیوں بتاتے ہیں۔ کم از کم میں تو اس پر عاشق ہوں لیجئے سب سے پہلے میں اپنا قیمتی سوٹ جلاتا ہوں (میں نے یہ ایکٹنگ اس طرح کی گویا میں دراصل سوٹ جلا رہا ہوں) اب میں کھدر پہنا کرونگا آپ بھی قسم کھائیے کہ ہمیشہ کھدر پہنینگے۔ نوجوانوں کو چاہئے کہ اپنی بیویوں کو محض کھدر پہنائیں اور ـــــ (کھٹ کھٹ کھٹ) ہیڈ ماسٹر صاحب چلے گئے تھے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور کھڑکی میں سے دیکھنے لگا۔ وہ تیزی سے جارہے تھے۔ آہ اُن کی پشت کس قدر خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔

اگلے روز فیصلہ ہوگیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے رشتے سے قطعی انکار کردیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہدیا کہ اگر لڑکے کے یہی خیالات رہے تو تعجب نہیں کہ دماغ میں خلل آجائے یا بہت جلد جیل کی ہوا کھائے۔ خیر صاحب ہمیں سو فیصدی چھٹکارا مل گیا تھا۔ اب دوسرے رشتے کی کوشش کا سارا بوجھ ہم نے آپا پر رکھا اور خود کالج واپس آنے پر تیار ہوگئے واپس آنے سے ایک روز پہلے میں نے محترمہ کو تانگے میں جاتے دیکھا۔ میں سائیکل پر جا رہا تھا۔ جلدی سے تانگے کے برابر پہنچ گیا۔

"سلام صاحب!" میں نے سر جھکا کر کہا ـــــ اُس نے سر کے اشارے سے جواب دیا۔

"میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میرے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار کیا۔ میرے مضمون پڑھے۔ میرے لئے دعا مانگی۔ میری تصویر کو پسند کیا اور... اور..." (میں ایک موٹر سے ٹکراتے ٹکراتے بچا) "خدا کا شکر ہے کہ دنیا میں ایک ہستی تو میرا خیال ہے۔" میں نے سائیکل کو بریک لگاتے ہوئے کہا۔ "مگر خدا جانے آپ مجھے کیسا سمجھتی ہیں اچھا یا برا ـــــ؟"

وہ چپ تھی۔

"اچھا سمجھتی ہیں آپ ـــ؟"

اُس نے اثبات کے طور پر سر ہلا دیا۔

"یا برا سمجھتی ہیں ـــ؟"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"اچھا تو اگر آپ مجھے اچھا سمجھتی ہیں تو وہاں موڑ پر پہنچکر ذرا چھینک یا کھانس دیجئے۔ اور اگر برا سمجھتی ہیں تو میری جانب سے منہ پھیر لیجئے۔ مگر مجھے جواب ضرور دیجئے کیونکہ آج رات کو واپس جا رہا ہوں۔" میں نے سائیکل ذرا آہستہ کرلی۔

تانگہ موڑ پر پہنچا۔ ایک خفیف سی کھانسی کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ میں نے سائیکل کو بے تحاشہ چلانا شروع کیا ـــــ اور فوراً برابر آپہنچا۔

"آپ کا بیحد مشکور ہوں۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔ مگر آپ سے پوچھنا بھی ضروری تھا۔"

"تو آپ خط لکھینگی مجھے؟"

ـــــ خاموشی ـــــ

"دیکھئے ضرور لکھئے گا۔ میرا پتہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا۔ نئے ہوسٹل کی معرفت" (اُن کا گھر آگیا تھا)۔

"اچھا خدا حافظ"

"خدا حافظ" اُس نے گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

دوسرے روز میں واپس آرہا تھا۔ سٹیشن پر عزیز و اقارب چھوڑنے آئے تھے۔ چلتے وقت ایک بزرگ بولے۔ "دیکھو ہر کام سوچ سمجھ کر کیا کرو۔ ہم نے سنا ہے تم تقریریں کرتے ہو۔ اپنے کپڑے جلاتے ہو۔ چندے اکٹھے کرتے ہو۔ ہمارے خیال میں تو تمھیں پالیٹکس میں کوئی حصہ نہیں لینا چاہئے۔ تمھیں اس قسم کی چیزوں سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہئے اگر تمھارے خیالات کانگرس کی طرف راغب ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ تم بالکل دیوانے ہو جاؤ اور اپنی تعلیم کو چھوڑ دو۔ تم خود سمجھدار ہو۔ اور ہمیں زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اچھا ——"

گاڑی چلدی —— !

میرے چہرے پر مسکراہٹ کی ایک لہر دوڑ گئی —— غالباً اب آپ سمجھ گئے ہونگے کہ کانگرس اور شادی کا کیا تعلق ہے؟

رُباعیات

حضرت دعاؔ ڈبائوی

۱

وہ دل نہ رہا وہ نوجوانی نہ رہی ‖ وہ لُطف گیا وہ شادمانی نہ رہی
کیا دورِ گذشتہ کا دعاؔ ذکر کریں ‖ ہم رہ گئے اور زندگانی نہ رہی

۲

اِک نقش برآب ہے جوانی میری ‖ مانندِ سُراب ہے جوانی میری
بس نام ہی نام ہے جوانی کا دعاؔ ‖ کچھ بھی نہیں خواب ہے جوانی میری

۳

وقفِ سوز و گُداز میں بھی ہُوں ‖ عشق میں سرفراز میں بھی ہُوں
آپ دُنیا میں ہیں مجسّم ناز ‖ تو سراپا نیاز میں بھی ہوں

۴

اُن سے پھر رسم و راہ کرتا ہُوں ‖ زندگی کو تباہ کرتا ہُوں
جس گُنہ کی بھگت چکا ہوں سزا ‖ آج پھر وہ گُناہ کرتا ہُوں

تجلیات

حضرت عابد شاہجہانپوری

میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ حاصل نہ سمجھنا
ہر جلوے کو حدِ نظر اے دل نہ سمجھنا

ساحل تو نظر آتا ہے ڈوبا ہوا مجھکو
حاصل کا بھی اے دل کوئی حاصل نہ سمجھنا

کچھ اور بھی ہنگامے ہیں دُنیائے وفا میں
پامالئ دل کو حدِ منزل نہ سمجھنا

اتنی تو لطافت نہ تھی رعنائی گُل میں
اس پردہ کو تم پردۂ حائل نہ سمجھنا

سمجھیں مجھے ناکام طلب اُنکی نگاہیں
اے جوشِ وفا دل کو لبِ دل نہ سمجھنا

یہ ہمتِ ناکام یہ ہنگامۂ طوفاں
ساحل کا یہاں سے کوئی حاصل نہ سمجھنا

اے چشمِ کرم شانِ کرم دیکھ رہا ہوں
خودداریٔ دل سے مجھے غافل نہ سمجھنا

اے بیخبرِ راز کہاں تک یہ تغافل
ساحل نہیں کچھ اور ہے ساحل نہ سمجھنا

واقف ہی نہیں آپ ابھی عظمتِ دل سے
ہے حاصلِ کونین اسے دِل نہ سمجھنا

اِک پردۂ حائل ہے پسِ پردۂ حائل
عابد حدِ منزل کو بھی منزل نہ سمجھنا

تاریخ کابل

ایک نہایت معلوماتی اور دلچسپ تاریخی مقالہ

از جناب لطیف صاحب ندوی لکھنؤ

کابل ایک ایسا نام ہے جس کے ساتھ قدیم ایشیا کی بہت سی تاریخی و جغرافی روایات وابستہ ہیں۔ عہد قدیم میں کابل مختلف عظیم الشان تمدنوں اور باقتدار سلطنتوں کا مرکز رہ چکا ہے۔ ہر چند کہ اس مشہور شہر کے وہ سیاسی حالات و کوائف زیادہ روشن نہیں جن کا تعلق زمانہ قبل از اسلام سے ہے، تاہم اتنا یقینی طور پر معلوم ہے کہ شہر کابل سکندر مقدونی کے زمانے میں موجود تھا چنانچہ سکندر کے ہم عصر مورخین نے اپنی تاریخوں میں متعدد مقامات پر اس شہر کا ذکر کیا ہے بطلیموس نے بھی بقول شمس الدین سامی اپنے مشہور عالم جغرافیہ میں کابل کو "کابورہ" اور "تو پا" کے ناموں سے یاد کیا ہے۔

کابل نہایت قدیم زمانے سے مختلف ممالک کے بڑے بڑے فاتحین اور حملہ آوروں کا گذرگاہ رہا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندی، چینی، یونانی، فارسی اور منگولی تمدنوں سے کابل نہ صرف متاثر ہوا بلکہ اس نے ان مختلف تمدنوں کے باہمی اختلاط سے ایک جدید ترقی یافتہ تمدن کی بنیاد ڈالی۔

کابل ہی کی راہ سے یونانی، عرب اور ایرانی ہندوستان پر اور اہل ہند اور چینی ایران پر حملہ آور ہوئے۔

کابل اپنے بہترین محل وقوع کے باعث ابتدا ہی سے ہندوستان اور ترکستان کا زبردست مرکز تجارت رہا ہے چنانچہ مشہور یونانی مورخ "ہیروڈوٹس" کے قول کے مطابق کابل کا تجارتی مال یونان، اور روم کے تمام بازاروں میں عام طور پر فروخت ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں فراعنہ مصر کے محلات اور قصور سلطنت کے نقش و نگار کے لئے مختلف قیمتی پتھر کابل ہی سے بھیجے جاتے تھے۔

کابل یونانیوں کے عہد میں

ولادت مسیح سے ۲۵۰ سال پیشتر اور سکندر کے بعد تقریباً باختر (بلخ) کی یونانی سلطنت کے زمانہ میں کابل کی مدنی اور اقتصادی حالت میں کافی ترقی ہوئی۔ کیونکہ اسی راستہ سے یونانی تمدن ہندوستان میں داخل ہو کر عام طور پر پھیل چکا تھا خصوصاً قبل مسیح پہلی صدی کے آغاز میں جب کہ بلخ کی یونانی سلطنت شمال سے میڈیا کے حملوں اور مغرب سے پارت کی یورشوں کی وجہ سے انحطاط پذیر ہو کر "ہندوکش" کے جنوب میں محصور ہو گئی تو کابل کی تہذیب و تمدن میں بیشتر اضافہ ہوا، اس زمانہ میں مخصوص تمدن بلاد غزنی، قندہار (گرشک) سیستان اور سواحل سندھ تک پھیلا ہوا تھا۔

افغانستان میں مسٹر "فوشہ فرانسیسی" کی کھدائی و تحقیق کے سلسلہ میں شاہ "ہرمایوس" کے بہت سے نقرئی و مسی سکے دستیاب ہوئے ہیں جو کابل کا آخری یونانی بادشاہ تھا اور جس کی سلطنت کا زمانہ پہلی صدی عیسوی کا ابتدائی حصہ ہے چنانچہ اس قسم کے ۹ عدد سکے کابل کے فنون لطیفہ کے عجائب خانے میں محفوظ کر دیئے گئے ہیں، یہ سکے صاف اس امر پر روشنی ڈالتے ہیں کہ یونانیوں کے عہد میں نہ صرف کابل بلکہ افغانستان اپنے انتہائی عروج و ترقی کو پہنچ گیا تھا چنانچہ مسٹر فوشہ فرانسیسی کہتے ہیں۔

> "اس دعویٰ کا ثبوت مشہور یونانی بادشاہ دی میترس کے سکے ہیں جس نے ۱۹۰ قبل مسیح میں بلخ میں حکمرانی کی ہر یہ سکے یونانیوں کے آخری زمانے کے سکوں سے مختلف ہیں

کیونکہ بعد کے سکّوں میں ابتدائی سکّوں کے برخلاف ایک رُخ میں یونانی حروف اور دوسرے رُخ میں آرین حروف نقش کئے جاتے تھے۔

یہ مسلّم ہے کہ یہ آرین حروف نہ پہلوی ہیں اور نہ سنسکرت البتہ اگر تخت رستم (ایران) کے نوشتوں یا کابل و جلال آباد کی تحریروں سے ان حروف کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان سکّوں کی تحریریں دراصل اُسی آرین زبان سے تعلق رکھتی ہیں جو علاقہ آریانہ یعنی ہندوکش اور پیکی پولیس کے درمیان رائج تھی۔ اس سے بآسانی ہم یہ نتیجہ پیدا کر سکتے ہیں۔ کہ یونانی حکمران آہستہ آہستہ ذہنیت افغانستان کے مؤثرات و عوامل سے متاثر ہو رہے تھے“

افغانستان میں یونانیوں کی حکمرانی سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے اور اس میں کسی شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ شہر کابل اس زمانہ میں موجود تھا لیکن یہ کب آباد ہوا؟ اور اس کے بانی کا کیا نام ہے؟ یہ سوالات ہنوز حل طلب ہیں ان کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ اتنا معلوم ہے۔ کہ افغانستان میں یونانیوں کے ورود سے پہلے ”کابل“ نام کا ایک شہر ضرور موجود تھا۔

کابل عہدِ کوشانی میں

افغانستان میں یونانی حکومت کے زوال سے لیکر ظہورِ اسلام تک کابل مختلف حکومتوں کے زیرِ اقتدار رہا چنانچہ یونانیوں کے انحطاط کے بعد کابل کے شمال سے کوشانی خاندان اُٹھا اور اُس نے ہندوستان کے ایک بسیط حصّے پر قبضہ کر لیا، سلسلہ کوشانی علاقۂ تخار (تخارستان، قطغن و بدخشان) سے تعلق رکھتا ہے، یہ لوگ بُدھ مذہب کے پیرو تھے، جیسا کہ مشہور روسی مستشرق ”بارٹولڈ“ نے ایران کے تاریخی جغرافیہ میں وضاحت کی ہے۔ بہرحال پانچویں صدی عیسوی تک کابل کوشانی حکومت کے زیرِ فرمان رہا۔ چنانچہ کابل کے مشہور کوشانی بادشاہ (زتابکی، مالیکا) کے جو سکّے کابل کے عجائب خانے میں موجود ہیں۔ وہ صاف اس چیز پر روشنی ڈالتے ہیں۔

سلاطین کوشانی کے عہد میں کابل نے نہ صرف تمدنی و مادی ترقی ہی کی بلکہ ایک نوع کی مذہبی مرکزیت بھی حاصل کر لی۔ چنانچہ اسی زمانہ میں بلخ بامیان، اور ہدہ وغیرہ کے مذہبی تعلقات کابل سے وابستہ ہوئے اس مذہبی اہمیت نے بذاتِ خود کابل کی ترقی و جلال میں بیش بہا اضافہ کر دیا۔

”کابل“ و ”یفاتلہ“

جیسا کہ اس سے پیشتر طوائف تخار کی سلطنت کے پیر ہندوستان سے اُکھڑ گئے تھے۔ پانچویں صدی عیسوی میں سلسلہ کوشان کی حکومت بھی جنوبی ہندوکش سے منقرض ہو کر محض بلخ میں محدود ہو گئی۔ اسی زمانہ میں تخار کی ایک جماعت نے ”یفاتلہ“ کے نام سے جنکو مورخین عرب ”ھیاطلہ“ کے لفظ سے یاد کرتے ہیں بلخ میں ایک نئی سلطنت کی تشکیل کی، تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یفاتلہ نے جنوبی ہندوکش کو فتح کر لیا، اس زمانہ سے لیکر چھٹی صدی عیسوی کے وسط تک کابل یفاتلہ کے مشہور شہروں میں شمار کیا جاتا تھا۔

اسی صدی میں ترکوں نے ساسانیوں کی متفقہ قوت سے دولت یفاتلہ کا خاتمہ کر دیا اور مملکت تخارستان پر جو ۲۷ ولائیتوں پر مشتمل تھی۔ اپنا پرچم جلال لہرا دیا۔ ترکوں کا یہ تسلط کابل پر آغاز ظہورِ اسلام تک برابر قائم رہا۔

کابل اور مقامی سلطنتیں

جس وقت ترک تخارستان پر مسلط تھے، کابل میں ایک نئی سلطنت ظہور پذیر ہوئی۔ جو نہ صرف زمانۂ ظہورِ اسلام بلکہ صفّاریوں کے عہد تک برابر قائم رہی،

شاہانِ رتبیل

کابل کے یہ مقامی بادشاہ زمانۂ فتوحات اسلامی میں رتبیل کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ ان لوگوں کی حکمرانی کی حدود کوہ ہندوکش کے جنوبی مشرقی حصّہ تک وسیع تھیں۔ درحقیقت اس زمانہ میں جیسا کہ ”یاقوت“ اشارہ کرتا ہے، اسم ”کابل“ اس مملکت پر اطلاق کیا جاتا تھا جس کی حدود ہندوستان سے ملی ہوئی تھیں۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کابل کے ان مقامی بادشاہوں کے معاصرین شاہانِ بلخ اور شاہان گردیز تھے۔ کیونکہ شاہانِ بلخ کے مورث اعلیٰ ابو داؤد[1] محمد بن احمد نویں صدی کے آخر میں بلخ کے حکمران تھے نیز صاحب

---

[1] انہیں کی طرف منسوب کرتے ہوئے شاہانِ بلخ کو آل داؤد بھی کہتے ہیں۔

زین الاخبار نے محاربہ یعقوب صفاری کے سلسلہ میں شاہان گردیز میں سے ایک بادشاہ کو ابو منصور افلح بن محمد خاقان کے نام سے ذکر کیا ہے۔

بہرحال کابل کے مقامی بادشاہوں کے زمانہ سے لیکر صفاری جنگوں تک کوئی عربی فاتح کابل اور کوہ ہندوکش کے جنوبی ممالک کو پورے طور پر فتح کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا حتیٰ کہ بنی امیہ کا اولالعزم اور بلند ہمت حکمران حجاج ثقفی بھی اس معاملہ میں ناکام ہی رہا[1]۔ بالآخر مجبور ہو کر اہل عرب کو کابل سے خراج ہی لینے پر قانع ہونا پڑا۔ البتہ یعقوب[2] لیث بانی سلسلہ صفاریاں وہ سب سے پہلا شخص تھا جس نے نویں صدی عیسوی میں سنگین جنگوں کے بعد زابلستان، شارستان (غزنی) اور نوشار (بلخ) کو تباہ و برباد کر دیا اور کابل کو قطعی طور پر ممالک اسلامی میں شامل کر لیا۔ لیکن صفاری سلسلہ کے منقطع ہونے کے بعد پھر دوبارہ کابل میں ایک جدید مقامی سلطنت قائم ہو گئی جس کی عمر کچھ زیادہ طویل نہ تھی۔ کیونکہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد شرقی پہاڑوں سے ایک زبردست قوم اٹھی جس نے کابل میں ایک جدید سلطنت کی داغ بیل ڈالی۔ ان لوگوں کا مذہب "برہما" اور ان کے سردار کا نام "کالالہ" تھا۔

اس سلطنت کے زمانہ میں کابل میں مذہب برہما کی خوب ترویج ہوئی۔ اس کا آخری بادشاہ "جاپاپایا" تھا جس پر سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

دورِ غزنوی

اب غزنوی دور کا آغاز ہو چکا تھا، چنانچہ ۳۶۶ھ مطابق ۹۷۷ء میں کابل غزنی کے مشہور بادشاہ سبکتگین (۳۶۶-۳۸۷) کے دائرہ فتوحات میں داخل ہو گیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ کابل کے بجائے غزنی تمام مملکت کا دارالسلطنت قرار پایا جس سے کابل کی مرکزی اہمیت بڑی حد تک زائل ہو گئی۔

سلطنت غوری

لیکن جب ۵۴۴ھ میں علاؤ الدین غوری نے غزنی کو تباہ کر دیا تو کابل بھی اس کے دست تصرف میں آگیا یہاں تک کہ ۶۱۸ھ میں چنگیز خان نے اپنی قیامت خیز تاخت و تاراج کے سلسلہ میں غزنی اور کابل پر قبضہ کر لیا۔

---

[1] دیکھئے طبری اور ہفت اقلیم

[2] یعقوب اس قدر باجبروت بادشاہ تھا کہ شاہان گردیز تک اس کے باجگزار تھے۔

تیموری فتوحات

جس زمانہ میں امیر تیمور گورگانی نے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا، کابل امیر حسین بن صلائے بن امیر قزغن کے زیر اقتدار آگیا۔ کیونکہ اس زمانہ میں پولاد بوقا و اقبوتا جو کابل کے فرمانروا تھے کھلم کھلا بغاوت کا اظہار کر رہے تھے۔ اس لئے تیمور نے ان کو قتل کر کے اپنے داماد امیر حسین کو اس تاریخی شہر کا حاکم بنا دیا لیکن بدبختی سے امیر حسین کی سلطنت بھی زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہی۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد تیمور نے امیر حسین کو قتل کر دیا اور خود کابل کا مطلق العنان بادشاہ بن بیٹھا۔ اس زمانہ میں تیمور کی طرف سے امیر جاکو برلاس اور ابو سعید وقتاً فوقتاً کابل کے والی مقرر ہوتے رہے۔ تیمور کی وفات کے بعد [illegible] میں میرزا پیر محمد بن مرزا جہانگیر کابل کا بادشاہ ہوا۔

سیور غتمش جو کابل و زابل سے لیکر حدود ہندوستان تک حکمرانی کرتا تھا ۸۳۰ھ میں وفات پا گیا جس کے باعث امیر شیخ علی مغل کابل کے تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔

بعد ازاں انقلاب کی بدولت سلطنت مرزا ابو سعید بہادر خان شہید کو پہنچی جن کی طرف سے ان کا فرزند مرزا الغ بیگ کابل میں حکمرانی کرتا رہا تھا، لیکن جب ۹۰۷ھ میں اس کا انتقال ہو گیا تو اسی سنہ کے آخر میں محمد مقیم پسر امیر ذوالنون کابل کا بادشاہ ہوا، الغرض اسی طرح عرصہ تک کابل انقلابات کی آماجگاہ بنا رہا۔

بابر بادشاہ

حتیٰ کہ آخر ربیع الثانی ۹۱۰ھ میں ظہیر الدین محمد بابر نے کابل کو فتح کر لیا۔ چنانچہ ۹۳۲ھ تک کابل بابر کی طرف سے جنوب ہندوکش کا پائے تخت رہا، بعد ازاں ۳ ربیع الاول ۱۱۵۱ھ کو نادر شاہ ترکمان، ہند کی رچیل ستون میں داخل ہوا اور کابل پر بلا شرکت غیرے قابض و متصرف ہو گیا۔

احمد شاہ درانی

پھر جب ۱۱۶۰ھ میں احمد شاہ درانی افغانستان کا بادشاہ ہوا۔ تو اس نے محض اس خیال سے کابل کو پایۂ تخت بنانا مناسب سمجھا کہ وہ افغانستان

کے تقریباً وسط میں واقع تھا۔ چنانچہ اسی غرض سے اس نے ۱۱۶۶ھ میں کابل کے گرد ایک زبردست دیوار بنانے کا حکم دیا جو سردار جان خان پوپلزائی سپہ سالار کے زیر اہتمام چار ماہ کی مدت میں بنکر تیار ہوئی۔

اس دیوار کا ایک ضلع کارخانہ اندرابی سے شروع ہوکر گلستان سرائے کے آخر میں جاکر ختم ہوتا ہے، اور دوسرا ضلع سلام خانہ کی حد سے شروع ہوتا ہے اور زیارتگاہ بابہ کیدانی کو عبور کرتے ہوئے ذرا سا مڑ کر لاہوری دروازہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح اس دیوار کے بقیہ اضلاع مختلف پیچ و خم کھاتے ہوئے کارخانہ اندرابی تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس دیوار کے حسب ذیل مختلف دروازے تھے:۔

(۱) قندہاری دروازہ ...... دہ مزنگ کے قریب
(۲) سفید دروازہ ... ... حد سلام خانہ خاص کے خاتمہ پر
(۳) دروازہ سردار جانخان ... حد زیارت گاہ بابہ کیدانی کے خاتمہ پر
(۴) پیست دروازہ .... پشت عیدگاہ کی انتہا کے قریب
(۵) دروازہ گذرگاہ
(۶) لاہوری دروازہ
(۷) خافیا دروازہ
(۸) دروازہ شاہ شمندها
(۹) دروازہ کبری ہا
(۱۰) دروازہ قرت ہا
(۱۱) دروازہ شیرازی ہا .. وغیرہ وغیرہ

اس عظیم الشان دیوار کا کچھ حصہ آج بھی کارخانہ اندرابی خانقاہ، خربوزہ منڈی میں موجود ہے، جو داخل عمارت کرلیا گیا ہے۔ جس سے اس کے استحکام اور افغانی فن تعمیر کے کمال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

تاریخ بالاحصار

بالاحصار کابل کی تاریخ کا ٹھیک طور سے پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس زمانہ میں تعمیر ہوا تھا، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ظہور اسلام سے پیشتر کابل کے شاہان رتبیل کے زمانہ کی تعمیر ہے اور بعض لکھتے ہیں کہ بادشاہ بابر نے اس کو بنوایا تھا جس میں جہانگیر نے بعد کو بہت کچھ ترمیم کی، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، بالاحصار کی تاریخ بابر و جہانگیر کے پیشتر سے تعلق رکھتی ہے۔ البتہ یہ بالکل یقینی ہے کہ تیمور کے زمانہ تک اس میں وقتاً فوقتاً ترمیمات ہوتی رہی ہیں، اور اس کے بعد اسکو اسکی حالت پر چھوڑ دیا گیا۔

سدوزائیوں کے دور حکومت میں بالاحصار میں تعمیرات کا کام نہایت پیش رفتاری کے ساتھ ہوا، چنانچہ احمد شاہ نے جیسا کہ گذر چکا ہے کابل کے چاروں طرف ایک زبردست دیوار تعمیر کرائی۔

۱۲۹۶ھ میں انگریزوں نے کیوناری، غیبر کے انتقام خون کے سلسلہ میں بالاحصار اور کابل کے چار چھتہ کو بارود سے اڑا دیا اور اس طرح یہ قدیم مقام جو متواتر چھ صدیوں تک کبھی تنہا کابل اور کبھی تمام مملکت افغانستان کا دارالسلطنت رہ چکا تھا چشم زدن میں خاک میں مل گیا۔

خدا کا شکر ہے کہ عہد نادر شاہی میں دوسرے اصلاحی کاموں کے سلسلہ میں بالاحصار کی تعمیر کا بھی حکم جاری کیا گیا چنانچہ سردست ایک بڑے احاطے کے اندر چند خوبصورت عمارتیں بنائی گئی ہیں، جن میں افغانستان کا فوجی کالج قائم کیا گیا ہے۔

کابل حالیہ

عہد تیمور شاہ (۱۱۹۰ھ - ۱۷۷۶ء) میں کابل سرکاری طور پر سلطنت کا مرکز قرار دیا گیا، اور تمام سرکاری دفاتر بجائے قندھار کے یہیں منتقل کر دیئے گئے۔ چنانچہ اس وقت سے لیکر آج تک یہ افغانستان کا مستقل پایۂ تخت ہے اور روز بروز اس کی ترقی و مدنیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔

کابل خورد اور بگرام کی تاریخ معلوم نہ ہوسکی۔ جس کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ قدیم کابل یہی تھا۔

آثارِ قدیمہ

کابل میں بہت سی آثارِ قدیمہ کی یادگاریں باقی ہیں۔ جو قابل دید ہیں۔ ان میں سے مسجد گدوی جسے شاہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے بنوایا ہے۔ بہت زیادہ اہم ہے ✦

ہستی

از جناب عزیز احمد صاحب عزیزؔ فرزند نواب فصاحت جنگ مدظلہ

دوشِ عالم پہ بار ہے ہستی
کس قدر سوگوار ہے ہستی

کر لوں تحمیل زندگی کیونکر
رات دن بےقرار ہے ہستی

موجِ صہبا سے ملتی جلتی ہے
کتنی ناپائدار ہے ہستی

شمع اُمید کی نہیں جلتی
ایک اُجڑا دیار ہے ہستی

آپ ہی مبتلائے اُلفت ہے
آپ ہی سوگوار ہے ہستی

تیز لہریں تھیں جو حوادث کی
کشتۂ روزگار ہے ہستی

دوستی گرمیٔ نفس تک ہے
حسن بے اعتبار ہے ہستی

غم کی نیرنگیاں ارے توبہ
اک طلسمِ خمار ہے ہستی

آرزوؤں کے پھول ہی نہ کھلے
گلشنِ بے بہار ہے ہستی

درد سے آشنا ہوا ہے عزیزؔ
غمِ دل کا شکار ہے ہستی

خطرناک جادوگر

ایک نہایت دلچسپ فلسفیانہ افسانہ

از جناب مرزا عاشق علی بیگ صاحب خیال مرادآبادی

مرزا فرحت حالانکہ جدید تعلیم یافتہ تھے اور حکومت کے ایک نہایت اہم عہدہ پر کامیابی سے سرفراز رہ کر سبکدوش ہو چکے تھے ان کی طرز معاشرت مغربی اور مشرقی امتزاج کا بہترین نمونہ تھی لیکن وہ پھر بھی لڑکیوں کو انگریزی درسگاہوں میں، لڑکوں کے ساتھ تعلیم دلوانے کے مخالف تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ موجودہ طریقہ تعلیم چونکہ تربیت نفس و تعلیم اخلاق کے لحاظ سے دیوالیہ ہے۔ اس میں سوائے چند علوم کی سطحی تعلیم ہوتی ہے۔ اسلئے دو نوجوان صنفوں کا باہمی اختلاط، فائدہ تو کم نقصان زیادہ رکھتا ہے۔ موجودہ طرز تعلیم سے طلبا فضول خرچی، فیشن پرستی، غلط آزادی اور مغربیت کی بری باتیں سیکھ لیتے ہیں اور بس! ایسی حالت میں لڑکے جب اپنی مشرقی خصوصیات کو ہاتھوں سے دے بیٹھتے ہیں تو لڑکیوں کا تو خدا ہی حافظ ہے۔

مرزا فرحت ان ہی وجوہات کی وجہ سے اپنی اکلوتی لڑکی صالحہ کو مروجہ تعلیم دلوانے کے لئے اسکول بھیجنے کے مخالف تھے لیکن خوش قسمتی سے ایک زنانہ اسکول جس کی ہیڈ معلمہ نہایت شریف۔ سلیقہ شعار، دیانت دار مسلمہ تھیں اور اپنی طالبات میں مذہبی اور مشرقی محاسن پیدا کرنے کی ساعی رہا کرتی تھیں۔ شہر میں ایسا تھا جہاں صالحہ کو اس کی خالہ صاحبہ کی ضد پر حصول تعلیم کے لئے بھیجا جا سکتا تھا۔ چنانچہ صالحہ اس اسکول میں جدید تعلیم کے نصاب کو نہایت کامیابی اور ذہانت کے ساتھ پورا کر رہی تھی اور اس کی خالہ اور اماں جان نہایت مسرور اور خوش تھیں۔

اصل واقعہ یوں تھا کہ صالحہ اپنی خالہ کے لڑکے شمشاد سے منسوب تھی اور ان کی یہ نسبت ٹھیکرے کی مانگ تھی۔ صالحہ کے پیدا ہوتے ہی اس کی خالہ نے اس کو پیاری بہن سے اپنے ہونہار اکلوتے بیٹے شمشاد کے لئے مانگ لیا تھا۔ شمشاد کے والد نہایت دولتمند اور نئی روشنی کا مکمل نمونہ تھے۔ انہوں نے شروع سے شمشاد کو انگریزی نرسوں اور ٹیوٹروں کی نگرانی میں تعلیم و تربیت دلوائی تھی اور ان کا ارادہ اسے کیمبرج سے اعلیٰ ڈگری دلوانے کا تھا اسلئے یہ امر نہایت ضروری تھا کہ ہونے والی رفیقہ حیات بھی مہذب، تعلیم یافتہ اور سوسائٹی کی آنکھ کا تارا ہو۔ یہ وجہ تھی کہ صالحہ کی تعلیم و تربیت کے معاملات میں اس کی خالہ کا حکم چلتا تھا اور مرزا فرحت باوجود اختلافِ خیال کے صالحہ کے معاملات تعلیم میں زیادہ دخل اسلئے نہیں دیتے تھے کہ آخر کو صالحہ جن کے گھر جانے والی ہے وہی ایک حد تک اس کے نیک و بد کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔

وقت اس تیزی سے گذرتا ہے کہ اس کی سرعت رفتار کو کسی چیز سے تشبیہ دی نہیں جا سکتی۔ دن رات اور راتیں دنوں میں بدلتی گئیں اور بات کرنے میں ذہین صالحہ نے میٹرک کا امتحان دے ڈالا۔ اور جب نتیجہ نکلا صوبہ بھر کی لڑکیوں میں وہ اوّل نمبر نکلی۔ یہ مژدہ جانفزا صالحہ کی خالہ اور دوسرے رشتہ داروں کے لئے ہی روح افزا نہ تھا بلکہ صوبہ بھر کے اخبارات میں اس مسلمان لڑکی کی غیر معمولی ذہانت کا چرچا رہا اور تعلیم نسواں کے حامیوں نے صالحہ کی قابل رشک کامیابی پر مضامین لکھے۔ بعض اخبارات کے

ان چند نمائندوں نے مرزا فرحت کی کوٹھی پر دھاوا بول دیا اور صالحہ کے حالات زندگی اور اس کی تصویر کی بھی فرمائش کر دی۔

مرزا فرحت اس ہڑبونگ سے بہت مکدر ہوئے اور انہوں نے سب کو مناسب جوابات دے کر اپنے سر سے ٹالا اور ان کو بتا دیا کہ صالحہ ایک مشرقی خاندان کی باعزت لڑکی ہے۔ اس کے حالات اور اس کا فوٹو اخبارات کی زینت ہرگز نہیں بن سکتا۔

صالحہ چونکہ تمام صوبہ کے اندر نسوانی حلقہ تعلیم میں اوّل رہی تھی۔ اس لئے اس کو سرکاری معقول وظیفہ دیئے جانے کا بھی اعلان ہوا۔ اور اس کی خالہ کے ہاں اس کی اس شاندار کامیابی پر خوب خوشیاں منائی گئیں۔ ان تمام ہنگامہ ہائے عیش و مسرت کے بعد ایک روز صالحہ کی خالہ اپنی بہن کے گھر تشریف لائیں اور اپنی بہن اور بہنوئی سے صالحہ کی اعلیٰ تعلیم کے متعلق تبادلۂ خیالات کرنا چاہا۔ صالحہ کی ماں چونکہ پرانے طرز عورت کی تھیں اور مرزا فرحت کی مشرقیت پسند ذہنیت کی وجہ سے اور بھی دقیانوسی خیالات کی مالک تھیں۔ کچھ تو اسلئے اور کچھ اسلئے کہ وہ طبعاً مرنجاں مرنج فطرت کی اور دنیاداری کے معاملات میں زیادہ دلچسپی نہ لیتی تھیں۔ اسلئے صالحہ کی خالہ نے جب اس مسئلہ پر اس سے گفتگو کی تو انھوں نے کہا کہ میں اس معاملہ میں تمہاری ہم خیال ہوں صالحہ تمہاری ہے۔ تم اس کے حق میں جو چاہو کرو۔ ماں سے زیادہ خالہ کو اپنی ماں جائی کی اولاد سے محبت ہوا کرتی ہے لیکن بہتر ہوگا کہ صالحہ کے باپ سے صلاح کر لو۔ وہ مجھ سے زیادہ بہتر رائے دے سکیں گے۔

غرض اسی روز شام کو کھانے کے بعد جب مرزا فرحت حقہ پینے بیٹھے تو ڈرائنگ روم میں صالحہ کی خالہ صاحبہ آگئیں اور کہا۔

"بھائی صاحب! صالحہ کی تعلیم کے متعلق اب کیا ارادہ ہے؟"

"میرا ارادہ"! فرحت نے ذرا طنز سے کہا۔

"جی ہاں! آپکا ارادہ تو سب سے مقدم ہے"۔ خالہ صاحبہ نے فرمایا۔

"نہیں! میرا ارادہ اور خواہش آپ کے ارادہ اور خواہش پر ہرگز مقدم نہیں ہو سکتا"۔

"یہ کیسے؟"

"یہ اس لئے کہ آپ کو علم ہے کہ میں لڑکیوں کی تعلیم کا حامی نہیں اور خاص طور پر اعلیٰ تعلیم کا مخالف ہوں"۔ مرزا نے قطعی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"حیرت ہے کہ آپ تعلیم کے مخالف ہیں"۔

"آپ کو غلط فہمی نہ ہو جائے۔ میں موجودہ تعلیم مغربی کو شرفا کے لئے زہر قاتل سمجھتا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ میں چونکہ صالحہ کو شمشاد کے لئے دے چکا ہوں اور آپ صالحہ کو اپنے نور نظر کے لئے موزوں بتا رہی ہیں تو میں اب تک اپنے اختلاف رائے کو پورے زور سے واضح نہ کر سکا۔ اور میٹرک تک تعلیم دلوا دی۔ میرے نزدیک یہ کافی ہے اور صالحہ شمشاد کے لئے کافی سے زیادہ موزوں ہو چکی ہے"۔

"مگر دیکھئے تو"۔ صالحہ کی خالہ نے کہا۔ "شمشاد دو سال میں انگلستان سے واپس آجائے گا۔ اس کے بعد شادی ہوگی۔ اس لئے یہ دو سال صالحہ اور تعلیم حاصل کر لے تو اچھا ہے"۔

"اب اس صورت میں اس کو کالج میں پڑھنا پڑے گا۔ شہر میں کوئی زنانہ کالج ہے نہیں باہر اس کو بھیجا نہیں جا سکتا۔ لامحالہ لڑکوں کے کالج میں پڑھنا پڑے گا۔ یہ بات میرے نزدیک پسندیدہ نہیں"۔

"ہاں! آپ کا خیال درست ہے۔ مگر میں مجبور ہوں شمشاد نے اپنا عندیہ یہ ظاہر کیا ہے کہ صالحہ ایف۔ اے۔ ضرور کرے۔ مجھ اور شمشاد کے باپ کو بھی اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ اس لئے آپ کی اجازت بھی ہو جائے تو اچھا ہے"۔

"جب یہ صورت ہے"۔ مرزا فرحت نے بے تعلقی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "تو میری اجازت کے بغیر بھی آپ لوگ اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ صالحہ آپ کی ہو چکی آپ اس کے مالک و مختار ہیں۔ لیکن میں ایک بات ضرور عرض کروں گا کہ خدانخواستہ اگر اس جدید تعلیم کے اثرات کے نتیجے کے طور پر کچھ قباحتیں پیش آئیں تو اس کی ذمہ داری کسی پر نہ ہوگی اور صرف آپ ہی اس کی ذمہ دار ہوں گی"۔

"بھائی صاحب! توبہ کیجئے! آپ تو ہر معاملہ کے تاریک پہلو دیکھا کرتے ہیں۔ لیکن شریف لوگوں میں بھی ایسی ویسی باتوں کا وجود

ممکن ہو سکتا ہے"۔

صالحہ کی خالہ نے کہا اور مرزا فرحت کو مزید اطمینان دلانے کیلئے کہا "صالحہ برقعہ پہنکر کرسچن کالج جایا کرے گی۔ وہاں اور بھی چند اونچے گھرانے کی لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ انہوں نے اگرچہ پردہ اٹھا دیا ہے لیکن صالحہ برقعہ میں رہ کر تعلیم حاصل کرے گی"۔

"میرے خیال میں" مرزا نے ایک لطیف طنز کے ساتھ کہا۔ "شمشاد جیسے مغربی فیشن کے دلدادہ کے لئے صالحہ کو بے پردگی کی عادت ڈلوانا بھی ضروری ہے۔ اگر یہ برقع اور پردہ میری دقیانوسیت کا پاس کرتے ہوئے ہے تو میں اجازت دیتا ہوں کہ اس تکلف کو کیوں درمیان رکھا جائے۔ میں جانتا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں جب ہم اپنی مشرقیت کو گم کر رہے ہیں۔ ہم بوڑھوں کو اپنے نوجوانوں کے جذبات اور رجحانات کا احترام کرنا چاہیے۔ پردہ اٹھانے کے معاملہ کو آپ صالحہ کے اوپر چھوڑ دیں"

اس گفتگو کے بعد صالحہ کی اعلیٰ تعلیم کا مسئلہ اس کی خالہ کے حق میں طے ہو گیا۔ اور تعلیم نئے سال کے آغاز میں۔ صالحہ کرسچن کالج کے سال اول کی طالبات میں امتیازی حیثیت سے اپنی ذہنی قابلیتیں دکھانے کے لئے میدان عمل میں آ گئی۔

صالحہ اس نئی زندگی میں حیات انسانی کے عروج یعنی شباب کی پوری قیامت خیزیاں لیکر داخل ہوئی۔ نسوانیت بجائے خود ایک ہنگامہ قیامت ہے اور جن کے اندر احساسات و جذبات کے لطائف موجود ہیں وہ محض نسوانیت کو ہر رنگ میں دیکھ کر سر بکف ہو جایا کرتے ہیں۔ اگر نسوانیت کے ساتھ حسن، شباب۔ ذہنی علو اور رفعت ہو وہاں اس قدر دلکشی مجتمع ہو جاتی ہیں کہ سنگین دل اور آہنی دماغ بھی شعلہ بن کر شمع کی طرح پگھل جاتے ہیں۔ صالحہ میں نسوانیت کے قدرتی "عطیہ عام" کے ساتھ عنفوان شباب، حسن ابہترین ذہنی قوتیں بھی موجود تھیں اور وہ تہذیب جدید کے انعامات سے بہرہ ور ہونے ہوئے بے پردہ کالج میں پڑھتی تھی۔ اونچی سوسائٹی میں یہ بات گوارا ہی نہیں بلکہ ایک فیشن بن چکی تھی۔ پردہ محض غریبوں اور چکی پیسنے والی بیواؤں کی لڑکیوں کے لئے مخصوص ہو گیا تھا۔

کالج کی خالص مغربی فضا، مغربی شعراء اور ادبا کے افکار عالیہ اور مغربی نژاد اساتذہ کی چند روزہ تعلیم و تربیت نے صالحہ کے روشن دماغ کو اس قدر تابناک بنا دیا کہ وہ علمی اور ادبی حیثیت سے کالج کی سوسائٹی کے اندر گل سرسبد خیال کی جانے لگی۔ اس کی فصاحت و بلاغت کے سامنے مجالس مناظرہ میں اچھے تیز و طرار لڑکے نہ ٹھہر سکتے تھے۔ امتحان کے مقابلہ میں ساٹھ طالب علموں کی اتنی بڑی جماعت میں سوائے سلیم کے کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ اس سال لڑکیوں کے اندر صالحہ سب سے اچھی طالبہ تھی اور لڑکوں میں سلیم قیادت اور برتری کا فخر رکھتا تھا حسن اتفاق سے ان دونوں میں شروع سے ایک قسم کی ہمنداقی موجود تھی۔ کالج کی پہلی سہ ماہی کے امتحان کے نتائج جب نکلے تو سلیم کا نام اول اور صالحہ کا نمبر دوئم تھا۔ اس موقعہ پر صالحہ نے طالب علمانہ آزادی اور مسخرانہ بے حجابی سے سلیم کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

"سلیم صاحب! یہ کالج مردوں کا ہے۔ انہوں نے اپنی مردانگی کی عزت رکھنے کو آپ کو اول کر دیا ورنہ یہ صالحہ کا حق تھا۔ اچھا آئندہ دیکھا جائے گا۔ میں آپ کو دعوتِ مقابلہ دیتی ہوں"۔

سلیم نے اس کے جواب میں جو کچھ کہا وہ یہ تھا۔

"معاف کیجئے میں نے کسی پروفیسر کو رشوت نہیں دی اور نہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے ساتھ بے انصافی ہوئی۔ میں آپ کی دعوت مقابلہ کو منظور کرتا ہوں۔ اور محض اسلئے کہ آپ کے مقابلہ میں میری شکست بھی لطف سے خالی نہ ہو گی"۔

صالحہ اور سلیم کالج بھر میں ممتاز اور مفتخر ہستیاں تھیں۔ طلبا اور پروفیسر سب ان کی عزت کرتے تھے۔ ان کے اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ ترین کریکٹر نے سب کی نظروں میں ان کی تقدس مآب عظمت قائم کر دی تھی۔ اعلیٰ درجہ کے طالب علم ہونے ہوئے دونوں میں پہلے رقابت اور مقابلہ رہا اور پھر الفت۔ اسے کے سال دوئم میں انس اور محبت پیدا ہو گئی۔ ان دونوں کے تعلقات میں سوائے ذہنی ہمدردی کے احساس اور محبت کے اور کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ وہ کالج کے احاطہ میں فرصت کے اوقات میں مختلف مباحث پر تبادلہ خیالات کیا کرتے تھے اور اکثر و بیشتر ہم خیال ہو کر بحث کو ختم کر دیتے تھے۔ لیکن ان ظاہری

بچپن سے اندر صالحہ کی دل کی دنیا چپکے چپکے بدل رہی تھی اور سلیم بھی نئے نئے احساسات کے عجیب عجیب خواب دیکھنے لگا تھا۔

یہ ظاہر ہے کہ سلیم کے خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتے تھے۔

مانا وہ خوبصورت، تندرست، ذہین اور طباع نوجوان تھا۔ یہ مسلّم کہ وہ نہایت ہونہار اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد حکومت کے بڑے سے بڑے امتحان مقابلہ میں کامیاب ہو کر بڑا آدمی بن جانے والا تھا لیکن صالحہ کو اس کی یہ صفات اور زریں مستقبل کبھی بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی غربت اور صالحہ کی بچپن کی نسبت یہ دو خبریں ایسی تھیں کہ موجودہ معاشرتی قیود میں ان دو بہترین ہستیوں کا ایک دوسری کی زندگی میں شریک ہونا از قبیل محالات تھا۔

اس امر کا دونوں کو احساس تھا لیکن وہ کسی مقناطیسی طاقت سے ایک دوسرے کی طرف کھنچے جا رہے تھے۔ جذباتی اور روحانی حیثیت سے دونوں ایک جان دو قالب ہو کر رہ گئے تھے۔ ایک امتحان کے موقعہ پر صالحہ کا نظم کا پرچہ تیار نہ تھا اور جب اس نے سلیم کو یہ بات بتائی تو سلیم نے بیساختہ کہا تھا۔

"صالحہ! پروا نہ کرو اور یوں کرو کہ جب پرچہ حل کرنے لگو تو میرا تصور باندھ کر جو سمجھ میں آئے لکھتی چلی جاؤ۔ پاس نہ ہو جاؤ تو جو جرمانہ جی چاہے کر دینا"۔

"معلوم ہوا کہ آپ کشف صدر پہ قادر ہیں"۔ صالحہ نے مذاقاً کہا۔

"یقین نہ آئے تو تجربہ کر لیجئے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے"۔ سلیم نے دعویٰ کرتے ہوئے کہا۔

"میں تیار ہوں"۔ صالحہ بولی۔

"اچھا یہ نظم لیجئے اور ڈسک پر بیٹھ جائیے۔ میرا تصور کیجئے۔ ادھر میں اس کو حل کرتا ہوں ادھر جو آپ کی سمجھ میں آئے لکھتی جائیے پھر لطف دیکھئے"۔

صالحہ کی حسرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے اپنی تحریر اور سلیم کی تحریر کو ملایا اور لفظ بلفظ یکساں پایا۔

"سلیم! یہ کیا تماشہ میری عقل تو کام نہیں کرتی"۔

"معمولی بات ہے۔ دل را بہ دل رہیست۔ اگر دو روحیں ایک دوسرے سے وابستہ ہو جائیں تو اس قسم کی باتیں معمولی ہیں۔ ہم اور آپ مل کر دنیا کو ہلا سکتے ہیں"۔

"شاعری مت کرو۔ مجھے اصلیت بتاؤ۔ میں اس کا فلسفہ معلوم کرنا چاہتی ہوں"۔

سلیم نے ہنس کر کہا "موجودہ سائنس اس حقیقت کو حل کرنے سے عاجز ہے۔ یہ مشرقی روحانیت ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو فلاسفہ یونان "اشراقیت" کے نام سے موسوم کرتے تھے اور ایک شاگرد ہزاروں میل کی دوری پہ بیٹھ کر اپنے استاد سے سبق پڑھا کرتا تھا"۔

"اچھا اب میں بھی آپ میرے استاد ہیں۔ بہتر! پروفیسر صاحب! میں ادب سے درخواست کرتی ہوں کہ اس راز پر ذرا روشنی ڈالنے کی زحمت گوارا فرمائیے"۔

"صالحہ! واقعہ یہ ہے کہ میں کچھ عرصہ سے محسوس کر رہا ہوں کہ اگر انسان دوسرے انسان کا ہم خیال ہو جائے اور ان دونوں کی ذہنیت اپنی پاکیزگی اور شفافیت میں ہم پایہ ہو تو وہ ایک دوسرے کا ایک آئینہ بن سکتے ہیں اور اپنے خیالات کو ایک دوسرے کے دل میں بآسانی ذرا سی توجہ اور تصور سے منتقل کر سکتے ہیں۔

یہ امر واقعہ ہے کہ ہر انسان کی روح، خیالات و احساسات کی ایک برقی لہر فضا میں دوڑاتی ہے اور یہ لہر دوسری روحوں کو متاثر کرتی ہے اور متاثر روحیں اپنی اپنی لطافت اور اثر پذیری کے لحاظ سے اثر قبول کر لیا کرتی ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ محبت و نفرت کا اثر دل پہ ہوتا ہے۔ محبت کرنے والوں کے ساتھ ہمیں راحت و مسرت کا احساس ہوتا ہے اور نفرت کرنے والے لوگوں کے حلقہ میں روح پر کبیدگی اور پژمردگی طاری رہتی ہے۔ دعا اور بددعا کا بھی یہی فلسفہ ہے۔ دعا محبت کی خواہشات خیر و برکت کا نام ہے۔ ہم جس کے لئے دعا کرتے ہیں اپنی روح کی طرف سے گویا اس کے لئے مسرت و سکون کی ایک طلسمی فضا پیدا کرتے ہیں اور جس کو دعائیں دیتے ہیں اس کی روح کو اطمینان و راحت بخشتے ہیں۔ بددعا کرنے کی صورت میں غیض و غضب روحانی کی تیز و شرر انگیز لہریں پیدا کر کے دوسری روح کو اس دنیا میں دوزخ

کامرا جھکا دیتے ہیں۔

میری اور تمہاری روح میں چونکہ بہت سی یگانگت اور ربط باہمی موجود ہے۔ اسلئے میں اگر اپنے خیالات تمہارے دل و دماغ میں منتقل کر سکتا ہوں تو کوئی اعجاز نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اس نظم کو تم نے پڑھا ضرور تھا اور اس کا مفہوم تمہارے دماغ میں موجود تھا۔ اسلئے میں نے اپنی روحانی قوت سے اس کی تفصیلات اور تشریحات کو تم تک بھیجا اور تم نے اس کو لکھ دیا جو کچھ تم نے لکھا وہ تمہارے اندر موجود تھا۔ میں نے صرف امداد و اعانت کے رنگ میں گویا تمہیں سہارا دیا۔ میں نے ہدایت کر دی تھی کہ میرا تصور رکھ کر نظم مکمل کرنا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ تمہارے اندر خود اعتمادی کو تقویت ہو جائے اور بس! —

"سلیم! بس کرو! معلوم ہو گیا کہ تم خطرناک جادوگر ہو"۔ صالحہ نے موضوعِ سخن کو بدلنے کی نیت سے کہا۔

"صالحہ! معاف کرنا کہ تم بھی دلنشیں ساحرہ سے کم نہیں ہو"۔

صالحہ اور سلیم کے درمیان اس طرح اعتراف محبت یا پیمان یگانگت ہو جانے کے بعد کبھی بھی محبت کے لطیف جذبات کے متعلق کوئی گفتگو نہیں ہوئی اور ایک خاص قسم کا — حجاب اور احساس عظمت — دونوں کے درمیان حائل ہو گیا۔

صالحہ کی تعلیم کا یہ دور بھی متوقع کامیابی کے ساتھ ختم ہو گیا اور اس کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ شمشاد بہت جلد ہندوستان پہنچنے والا تھا۔ اس کی آمد کے بعد ہی شادی کی رسم مکمل ہونے والی تھی۔ لیکن سوئے اتفاق سے صالحہ کی صحت خراب ہو گئی اور کچھ عرصہ کے بعد ڈاکٹروں نے حسب معمول اس کی بیماری کو مرض دق سے تعبیر کر کے اس کی شادی کو غیر معین وقت تک کے لئے ملتوی کر دینے کا حکم صادر کر دیا۔

تہذیب جدید میں ڈاکٹروں کی شخصیت اور رائے کو کافی اہمیت دی جاتی ہے اور دولتمند لوگ موت سے بہت ڈرتے ہیں۔ اسلئے اس کو بدقسمتی ہی کہنا چاہئے کہ صالحہ کی ذہنی کشمکش کے لئے شادی کا یہ التوا خطرناک ثابت ہوا۔ وہ مکمل آرام کے لئے بالکل تنہا چھوڑ دی گئی۔ اور خیالات کے سمندر میں تن تنہا غوطے کھاتی رہی۔ عورت سراپا تصور اور تخیل ہے۔ اس کی دنیائے تصور میں جب شباب کا آفتاب ضوریز اور نور بیز ہوتا ہے۔ تو سب سے پہلے حسن مردانہ حسن و جوانی کی تصویر اس کی آنکھوں میں سما جاتی ہے وہ اس کو بھول نہیں سکتی۔

محبت کی پہلی چوٹ کچھ اس طرح نوجوان لڑکیوں کو مضطرب کر دیتی ہے کہ وہ اس کو فراموش نہیں کر سکتیں۔ اور جس قدر اس کو فراموش کرنے کی کوشش کرتی ہیں اسی قدر وہ مبتلائے عذاب ہو جاتی ہیں۔

صالحہ کی تمام خودداریاں ناکام ہو چکی تھیں اور اب وہ ہر قیمت پر سلیم کو حاصل کرنا چاہتی تھی۔ وہ سماج کی تمام رسم و رواج سے بغاوت پر آمادہ تھی۔ بعض اوقات وہ ناکامی اور نامرادی کے تصور کے بعد جان پر کھیل جانے کے منصوبے بھی باندھنے سے باز نہیں رہتی تھی ظاہر ہے کہ اس کی اندرونی خلفشار اس کو کسی طرح بھی صحت حاصل کرنے نہیں دے سکتی تھی۔ روز بروز وہ جسمانی حیثیت سے تباہی کی طرف جا رہی تھی۔

اس کی خالہ اور مغرب زدہ شمشاد تا صحت کامل شادی پر آمادہ نہ تھے۔ اور فطرت شناس مرزا فرحت کے اصرار پر کان نہیں دھرتے تھے وہ کہتے تھے کہ شادی تبدیل ماحول اور نئی زندگی کی دلچسپیاں صالحہ کو یقیناً تندرست کر دیں گی۔ اس کی تنہا زندگی اور شباب کی تجلی بے راہ روی جو اس کا اصل مرض ہے دور ہو جائے گا۔ ان کو ہرگز یہ علم نہیں تھا کہ صالحہ کا مرکز تجلی کون ہے! لیکن ان کی رائے قطعی مبنی بر صداقت تھی۔ غرض اسی الجھن میں تین سال کا طویل عرصہ چشم زدن میں گذر گیا اور صالحہ صحت افزا مقامات میں بیماری کی حیثیت سے زندگی کے دن پورے کرتی رہی۔

جو گندر نگر کے سینیٹوریم میں، صالحہ، اس کی خالہ اور اس کا منگیتر اور تمام اہل خاندان موسم گرما گذار رہے تھے۔ یہاں کی آب و ہوا نے اس پر اچھا اثر کیا تھا اور وہ غیر معمولی طور پر تندرست نظر آ رہی تھی۔ اس کے پژمردہ رخساروں پر خون صالح کی لطیف سرخی جھلک رہی تھی۔ وہ خود بخود محسوس کر رہی تھی کہ اس کا مضطرب دل مطمئن ہے۔ اس کے ذہن کی الجھن کم ہو گئی ہے۔ کوئی غیبی طاقت اس کو روشن مستقبل کی خوش خبری دے رہی ہے۔ ایک روز ہندوستان کے مشہور مصور رسالے میں اس نے سلیم کی تصویر دیکھی جس کے نیچے لکھا تھا۔

مسٹر سلیم جنہوں نے سال رواں کے امتحان سول سروس میں
اوّل درجہ کا امتیاز حاصل کیا ہے"۔

صالحہ نے ماہنامہ مذکور کے دفتر کو خط لکھا اور سلیم کا پتہ حاصل
کر کے ایک مختصر خط سلیم کو لکھا۔

سلیم صاحب!۔

اپنی فراموش شدہ ہم جماعت کی طرف سے اپنی قابل
رشک کامیابی پر ہدیہ تبریک قبول فرمایئے!۔
میں بہت عرصہ سے بیمار رہوں۔ اور شاید
ان ڈاکٹروں سے مر کر ہی نجات ملے گی"۔

فوراً سلیم کا خط آیا۔

"زندگی کی ہر سانس میں مہک پیدا کرنے والی صالحہ!
مبارکباد کا شکریہ! بیماری کی خبر سے صدمہ ہے۔
میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ موت مجھے مار کر تم تک
پہنچ سکے گی۔ میں اپنی ملازمت کا چارج لے کر تم سے
ملنے کو آؤں گا۔ کیا تمہارے شوہر ایک مخلص دوست
کو اپنی میزبانی سے نوازیں گے"؟۔

صالحہ نے اس کا جواب الجواب لکھا۔

سلیم صاحب!۔

آپ کی بیمار پرسی کا شکریہ! اور ہمدردی کا مکرر
شکریہ! آپ عجیب آدمی ہیں کہیں کوئی بیمار اور رلب
گور ہستی بھی شادی کی بلا میں مبتلا ہو سکتی ہے۔ والد
صاحب کے گھر میں بھی چند روز کی مہمان ہوں۔ ان
کی میزبانی سے شاید آپ بھی محروم نہ رہیں گے"۔

صالحہ کو روبصحت دیکھ کر اس کی خالہ نے مرزا فرحت سے شادی
کی تکمیل کے لئے کہا لیکن اس اثنا میں ان کو صالحہ اور سلیم کے متعلق تعلق خاطر
کا پتہ چل چکا تھا۔ اور اسی کے ساتھ سلیم کی طرف سے صالحہ کے لئے پیغام
بھی آچکا تھا۔ اسلئے انہوں نے کہا۔

"آپ کو اس معاملہ میں صالحہ سے گفتگو کرنی چاہئے"۔

"یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ اس معاملہ میں صالحہ کا کیا بیچ ہے"۔

"شادی صالحہ کی ہوگی۔ عقل و شرع کے لحاظ سے اس کی رضامندی
ضروری ہے"۔

"یہ تو درست ہے۔ میں کب کہتی ہوں کہ وہ رضامند نہیں"۔

"میں نے سنا ہے کہ کوئی سلیم صاحب ہیں ان کا پیغام آیا ہے۔
یہ کیا بات ہے۔ لڑکی ہماری ہے۔ ہماری شکرے کی مانگ ہے۔ اگر کچھ گڑ
بڑ ہوئی تو خاندانی تعلقات کا خاتمہ ہو جائے گا"۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ صالحہ اس رشتہ کو پسند کرتی ہے۔ رہا خاندانی
تعلقات کا خراب ہو جانا میں اس میں مجبور رہوں"۔

"آپ صالحہ کے باپ ہیں۔ آپ کے سامنے اس کی پیش نہیں
جا سکتی"۔

"میں صالحہ کا باپ تو ہوں لیکن آپ اس کی روحانی ماں ہیں
اس کی آزادانہ تعلیم اور مغربی تربیت کے لحاظ سے آج جو قباحت پیش
آ رہی ہے اس کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے۔ یہ صالحہ کا قصور
نہیں۔ یہ آپ کا بھی قصور نہیں۔ یہ آزاد تعلیم کا قصور ہے۔ لیکن اسی کے
ساتھ مجھے خوشی ہے کہ صالحہ کی شرافت نفس نے ازدواج کے بارے
میں کوئی ایسی صورت پیش نہیں کی جو انسانیت کے لئے بدنما داغ ہوتی
میں اس کو شادی کے معاملہ میں پوری آزادی دینے پر مجبور ہوں اور
یہ اسلئے کہ اس کی تعلیم و تربیت اور ذہنی رجحان کا احترام کرتے ہوئے"۔

صالحہ کی خالہ کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ انہوں نے نسوانی کج
بحثی پر اُتر کر کہا۔

"اگر صالحہ کی ایسی ہی آزادی ہے تو میں اس کو کچل دوں گی۔ آپ
کو اس کی شادی شمشاد سے کرنا پڑے گی۔ ورنہ یاد رکھئے کہ ناخنوں
سے گوشت علیحدہ کر دوں گی۔ سارا خاندان آپ کا بائیکاٹ کر دیگا"۔

مرزا فرحت نے نہایت نرم مگر دل خراش انداز میں کہا۔

"آپ جوش میں آگئیں۔ اپنا قصور آپ دوسروں کے سر تھوپ
رہی ہیں۔ مجھے اس کے اظہار میں کوئی شرم نہیں کہ صالحہ کو کالج کی تعلیم نے
اپنی پسند کا شوہر انتخاب کرنے کا موقع دیا۔ اس کی ساری ذہنیت
ایک ہم جماعت نوجوان سے متاثر ہو گئی۔ شکر ہے کہ وہ اس کا ہم کفو نکلا۔

بصورت دیگر بڑی مصیبت ہوتی۔ یہی خرابی ہے جس کی وجہ سے میں مغربی طرز تعلیم و تربیت کا لڑکیوں کے لئے سخت مخالف ہوں۔

اگر سارا خاندان ناراض ہو جائے گا تو میں صالحہ کی حمایت سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔ سلیم اور شمشاد دونوں ایک حیثیت کے آدمی ہیں۔ صالحہ کے انتخاب پر ہمیں بھی راضی ہو جانا چاہئے۔

مجھے افسوس ہے کہ آپ لوگ اس کی بیماری سے متاثر ہو گئے اور شادی کو التوا میں ڈال دیا۔ اب جبکہ سلیم، شمشاد کے مقابلہ میں آ چکا ہے۔ آپ شادی کے لئے آمادہ ہیں"۔

فرحت اور صالحہ کی خالہ میں یہ آخری فیصلہ کن گفتگو تھی اور خاندانی قطع تعلق کا آغاز لیکن مرزا صاحب نے اس کی پرواہ نہ کی اور صالحہ بہت جلد بیگم سلیم آئی۔ سی۔ ایس بن گئی"۔

شادی کے بعد ایک روز صالحہ نے سلیم سے کہا۔

"ہاں سلیم تم نے یہ آج تک نہیں بتایا کہ تین سال تک تم کہاں غائب رہے اور مجھے خط تک نہیں لکھا۔ کیا محبت اسی کا نام ہے"۔

"میں اس عرصہ میں تمہاری محبت کا جوگی بن کر ہمالیہ پہاڑ میں تپسیا کرتا رہا اور جب پورا خطرناک جادوگر بن گیا تو ایک دم مہذب دنیا میں کوٹ پتلون پہن کر آ دھمکا"۔

"سلیم! مذاق مت کرو! بات بتا دو!"۔

"بتا تو دیا۔ میں جانتا تھا کہ دلنشین جادوگری کے لئے مجھے بڑی ریاضت کرنی پڑے گی۔ اس سے قبل اس کا حصول محال ہے۔ اس لئے میں نے شمشاد کا مقابلہ کرنے کے لئے پورا زور لگایا اور کامیاب ہو گیا"۔

"اچھا مجھے خط کیوں نہیں لکھا"۔

"صالحہ! میں کاغذی اظہار محبت کا قائل نہیں۔ کیا تم کو میرے روحانی پیغام نہیں پہنچتے رہے۔ جب تک میں یاس و امید کی کشمکش میں مبتلا رہا تم ناقابل تشخیص مرض میں مبتلا رہیں۔ جب میں امتحان میں پاس ہو گیا اور تمہارے حصول کی امید قائم ہو گئی تو تم خود بخود اچھی ہو گئیں۔ کیا یہ میرے پیغام نہ تھے"۔

"واقعی تم بڑے خطرناک جادوگر ہو"۔

"دلنشین ساحرہ! قدرت بڑی نکتہ رس ہے۔ شمشاد بیچارے کو تمہارے افسوں سے نجات مل گئی اور میری جان حزیں تمہاری سحر کاریوں کی شکار بن گئی"۔

جب صالحہ نے مسکرا کر سلیم کو "شریر" کہا تو اس نے صالحہ کے شریر لبوں پر شکریہ کی مہر لگا دی۔

شباب

از جناب سید دل محمد صاحب فضا منشی فاضل، ادیب فاضل

میری نظروں سے کوئی دیکھے گلستانِ شباب
ہے سراپا حسن وہ رنگیں ادا جانِ شباب

آج بزمِ ناز میں یوں روح پرور ساز چھیڑ
مطربِ دلکش نوا رنگیں ہو عنوانِ شباب

ہر نظر غرقِ محبت ہر نفس لبریز جام
اُف یہ جوشِ حسن یہ موجیں یہ طوفانِ شباب

ایک تصویرِ مجسم رنگ جس کا دلفریب
حسن ہے گویا بہارِ گل بداماں شباب

ہے دلِ پُر آرزو محوِ ادائے حسنِ شوخ
یہ چمن زارِ محبت وہ گلستانِ شباب

جب نگہ اُلجھی ہوئی تھی زلفِ عنبر فام سے
آج تک ہے یاد وہ خوابِ پریشانِ شباب

تا کجا یہ نازِ تمکیں تا کجا شوقِ حجاب
حسن کے جلوے ہیں پنہاں زیرِ دامانِ شباب

زلف اک تشبیہ کامل ہے شبِ دیجور کی
عارضِ رنگیں ترے صبحِ گلستانِ شباب

ہر ادا گلشن بداماں ہر نگہ سحر آفریں
کس قدر دلکش نظر آتے ہیں سامانِ شباب

اک نگاہِ مست تیری کیف سے لبریز جام
اک ترا ہلکا تبسم موجِ طوفانِ شباب

دل مرا محوِ تمنا تو نشاطِ زندگی
اک نگاہِ لطف مجھ پر بھی ہو اے جانِ شباب

پھر اُٹھے وہ بیحجاب انگڑائیاں لیتے ہوئے
جلوہ آرا پھر ہوا خورشیدِ تابانِ شباب

آنِ واحد میں ہوا نذرِ خزاں وہ رنگ و بو
کیا خبر تھی بے حقیقت ہے گلستانِ شباب

غنچے چٹکے گل ہنسے رنگیں ہوئی ساری فضا
اے فضا آیا چمن میں جب کوئی جانِ شباب

ابواسحٰق حلاّج شیرازی

فارسی زبان کا ایک ظریف شاعر

از حضرت علاّمہ محوی صدیقی لکھنوی (مدراس)

قدیم شعرائے ایران میں مولانا عبید زاکانی اپنی ظرافت نگاری کے لحاظ سے مشہور ہیں اور ہندوستان میں جعفر زٹلی ان کا جواب کہے جاسکتے ہیں بلکہ بدرجہا ان سے بھی بڑھے ہوئے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں کی سخنوری ظرافت نہیں بلکہ فحش گوئی تھی۔ اگرچہ ان کے کلام میں ایسے نمونے بھی بکثرت موجود ہیں جو فحش سے پاک ہیں۔

فارسی کے ظرافت گو شعراء میں ابواسحٰق حلاج بھی بہت مشہور اور اپنی قدامت نیز جدت مذاق کے لحاظ سے یگانہ ہیں یہ حضرت حافظ شیرازی کے کچھ ہی بعد گزرے ہیں۔ ان کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر شعر میں لذیذ اور عمدہ عمدہ کھانوں کا ذکر کرتے ہیں۔ کوئی شعر کھانے کے ذکر اور اس لذت طعام سے خالی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ زبان کے بڑے چٹورے اور کھانوں کے بڑے رسیا تھے۔ اسحٰق تخلص رکھ لیا تھا۔ اور اسحٰق طعمہ[2] کے نام سے مشہور تھے۔ بہارستان سخن کے مصنف[3] ان کے کلام کی نسبت لکھتے ہیں: "جمیع اشعار رنگینش بوصف الوان طعام معنون ومختتم این نوع از انواع سخن بلکہ موجد درین فن"۔ یعنی اسحٰق کے تمام رنگین اشعار قسم قسم کے کھانوں کے وصف سے لبریز ہیں اور شعر کی جتنی قسمیں ہیں یا ہوسکتی ہیں ان میں سے یہی ایک نوع انھیں پسند آئی۔ بلکہ وہ اس فن کے موجد ہیں"۔

صاحب بہارستان کا یہ بیان بالکل درست ہے کیونکہ اسحٰق سے پہلے کسی نے ایسے اشعار نہیں کہے۔ نہ کسی کا خیال ادھر گیا۔ یہ انھیں کی جدت اور اُپج ہے۔

اس جدت طرازی کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ بواسحٰق کے ایک نہایت عزیز دوست فقدان اشتہا (بھوک نہ لگنے کی بیماری) میں مبتلا ہو گئے تھے۔ لاکھ علاج کیا فائدہ نہ ہوا آخر مولانا اسحٰق نے از راہ محبت یہ عجیب وغریب ترکیب سوچی کہ ایسے اشعار کہے جائیں، جن میں قسم قسم کے کھانوں کا ذکر اور تعریف ہو۔ ان اشعار کو سن کر شاید دوست کی بھوک کھلے اور معدہ مبارک آمادۂ غذا ہو۔

یہ ترکیب اسحٰق کو غالباً حکیم ارزقی کے اتباع میں سوجھی: جو طغان شاہ کا طبیب خاص تھا۔ طغان شاہ خراسان کا والی اور آل سلجوق میں سے نامور گذرا ہے۔ یہ بادشاہ بیچارہ مردمی کی قوت سے عاجز دعاری ہوگیا تھا۔ طبیبوں اور حکیموں نے بہتیرے علاج کئے۔ دوائیں دیں۔ طلاء لگوائے۔ معجونیں کھلوائیں لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا حکیم ارزقی نے ایک نیا نسخہ

---

[1] دُھنیا۔ روئی دھنکنے والا

[2] طعمہ جمع طعام یعنی کھانا۔ یعنی کھانے والا بو اسحٰق،

[3] عبد الرزاق، نواب شہنواز خاں، وزیر سلطنت آصف جاہی مصنف مآثر الامراء۔ یہ کتاب غیر مطبوعہ ہے اس کا ایک نسخہ مدراس کے سرکاری کتبخانے میں ہے اور راقم الحروف اسے مرتب اور نقل کر رہا ہے مدراس یونیورسٹی کی جانب سے آئندہ شایع ہوگی۔

تجویز کیا اور وہ یہ کہ اس نے ایک کتاب "الغیۂ شیفتہ" کے نام سے تالیف کی جس میں جماع کے حالات تھے اور اس کی بہت سی تصویریں کتاب میں شامل کی تھیں تاکہ اُن کو دیکھ کر بادشاہ کی حرارت غریزی جوش میں آئے اور کچھ اپنا جوہر دکھائے۔ حکیم کا یہ نسخہ کارگر ہوا اور بادشاہ کی شکایت بتدریج جاتی رہی۔ اس نسخے کا شہرہ دور دور ہو گیا۔ بسحٰق بھی سن چکے تھے انھوں نے ارزقی کی اس ترکیب سے پورا فائدہ اٹھایا اور اپنے دوست کی اشتہا بڑھانے کے لئے ایسے اشعار کہے جن میں قسم قسم کے مزیدار کھانوں کا ذکر بڑے ذوق و شوق کے ساتھ کیا گیا تھا تاکہ بیمار کے دل میں رغبت اور طبیعت میں شوق غذا پیدا ہو۔ خدا جانے یہ روایت کہاں تک درست ہے اور ابو اسحٰق کے "شاعر طعامیات" ہونے کی واقعی وجہ ہے بھی یا نہیں مگر میرا تو خیال ہے کہ یہ قصہ بو اسحٰق کی جدت طبع کے لئے محض ایک وجہ پیدا کرنے کیلئے تراش لیا گیا ہے۔

بسحٰق نے اپنے کلیات کا نام بھی اُس کے مضامین کی رعایت سے "کنز الاشتہا" (اشتہا کا خزانہ) بہت خوب رکھا تھا۔ افسوس کہ وہ نسخہ آج ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے ممکن ہے دُنیا کے کسی کتبخانے کے کسی گوشے میں گمنامی کی حالت میں کوئی نسخہ پڑا ہو۔ بسحٰق کی نظر عنایت بہت زیادہ حضرت حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ پر مبذول رہی ہے اس وجہ سے کہ انھیں کا کلام عام طور پر ملک میں بہت مقبول اور لوگوں کی زبانوں پر تھا۔ غرض اُن کے کلام پر خوب ہاتھ صاف کیا ہے یا یوں کہئے کہ اُن کے شربت خانۂ طبع سے مسالے لیکر اپنے اشعار تیار کئے ہیں مولانا بسحٰق کی ترکیب یہ ہے کہ حافظ صاحب کے اشعار لیکر اُن کے مصرعوں پر اپنے مصرعے لگاتے ہیں یا انھیں کی زمینوں میں شعر کہے ہیں یا ان کے اشعار میں الفاظ کا کچھ ردّ و بدل کر دیا اور اپنا لیا ہے۔ اس سبب سے بسحٰق کی یہ جدّت زیادہ مزادے گئی اور اُس زمانے میں بہت مرغوب و مقبول ہوئی۔ سخن فہم اور طبیعت دار حضرات کا اتفاق ہے کہ "بسحٰق کا یہ کلام اپنے رنگ میں نہایت مزیدار، ظریفانہ اور پُر لُطف ہے اور ساتھ ہی تہذیب کے خلاف بھی نہیں۔"

اکثر ارباب تذکرہ لکھتے ہیں کہ بسحٰق چونکہ اپنے دور کے ارباب سخن میں اپنی ظرافت طبع کی وجہ سے بہت ممتاز اور مشہور ہو گئے تھے اس وجہ سے بڑے بڑے امیروں اور حاکموں کے درباروں میں اُن کو رسائی تھی اور مزے کے ساتھ اپنے عہد کے رئیسوں کی مصاحبت میں زندگی بسر کرتے تھے خاص کر امیر تیمور کا پوتا شاہزادہ سکندر بن عمر فارس کا حاکم اعلیٰ بسحٰق کا بڑا قدردان تھا اور اس کے ساتھ مولانا بسحٰق کا بہت ربط و ضبط تھا۔ یہ شاہزادہ ۸۱۶ھ میں شہزادہ شاہرخ مرزا کے خلاف بغاوت کے جرم میں گرفتار ہوا اور پھر نہ معلوم کیونکر اس کا خاتمہ ہوا۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ بو اسحٰق شاہزادہ اسکندر کی مجلس میں کئی روز بعد حاضر ہوئے شاہزادے نے پوچھا مولانا اتنے دنوں سے کہاں تھے؟ جواب میں ارشاد ہوا بادشاہ سلامت! کیا عرض کروں؟ ایک روز روئی دُھنتا ہوں اور تین روز وہ روئی اپنی ڈاڑھی سے چنتا ہوں پھر یہ شعر پڑھا ؎

منعِ مگس از پشمکِ قندی کردن
از ریش حلاج پنبہ برداشتن است

ترجمہ۔ مکھیوں کو حلوے یا میٹھی سوّیوں سے روکنا ایسا ہی ہے جیسے دُھنیے کی داڑھی سے روئی صاف کرنا۔

پشمک کے معنی فارسی کی کتب لغت میں نوعی از حلوا یا حلوائے معروف و مشہور لکھا ہے۔ میرے خیال میں سوّیاں، یا پھینیاں یا وہ مٹھائی ہے جسے بڑھیا کے بال یا بڑھیا کا کاتا کہہ کر پھیری والے بیچتے ہوئے نکلتے ہیں اور بچے خریدتے ہیں۔ سفید بالوں کی طرح لچھے ہوتے ہیں۔ میں نے اس وقت جلدی کی وجہ سے زیادہ تحقیق نہیں کی یہی معنی ہوں تو لفظی اور معنوی لطافت سے خالی نہیں۔

افسوس کہ ۸۰۷ھ یا ۸۰۸ھ میں اس "شاعر طعام" نے دُنیا کی قسم قسم کی نعمتوں سے مُنہ موڑ کر آخرت کی نعمتوں کا رُخ کیا۔ اب ذرا ان کے اشعار کی بھی سیر فرمایئے جو ان کے دیوان حلاوت نشان سے منقول ہیں فرماتے ہیں قطعہ ؎

نرگس کہ شبیہ است بچشم خوشِ دلبر
گویند طبقی دارد از سیم و پُر از زر،
در دیدۂ بسحٰق نہ زر دارد و نے سیم
شش نان تنک دارد و یک صحن مُزعفر

داہ کیا کہنے ہیں میاں لسحق! کیا خوب سوجھی ہے اور کیا پتے کی کہی ہے۔ (ترجمہ) کہتے ہیں کہ نرگس جو محبوب کی پیاری آنکھ کے مشابہ گویا وہ ایک چاندی کا طباق ہے جو سونے سے بھرا ہوا ہے لیکن لسحق کی نظر میں تو نہ اس میں سونا ہے نہ چاندی صرف چھ ہلکی پھلکی روٹیاں ہیں اور ایک مزعفر کی رکابی۔ شعراء سے تشبیہ میں کس خوبصورتی سے الگ ہوئے ہیں۔ اور ملاحظہ ہو ؎

مخلفے سبنوسۂ پُر قیمہ در منقار داشت
درمیان جوش روغن نالہائے زار داشت
گفتمش در روغن ایں جوش و شور نالہ چیست
گفت مارا شیوۂ سبنوسہ دریں کار داشت

یہ دونوں شعر قطعہ بند ہیں۔ مخلف کے معنی بُرہان میں "کبوتر بچہ" لکھے ہیں۔ اب ذرا معنی ملاحظہ ہوں کہ ایک کبوتر ایک قیمہ سے بھرا ہوا سبنوسہ چونچ میں دبائے تھا اور سبنوسے سے روغن کے جھاگ اُٹھ رہے تھے اُدھر یہ شور مچاتا اور غٹر غوں کرتا تھا۔ میں نے پوچھا ارے بابا آخر یہ تو روغن کے جوش کے ساتھ کیوں شور مچاتا اور نالہ کرتا ہے۔ تو وہ کہنے لگا کہ سبنوسے کی تقلید کر رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ سبنوسہ جب کڑاہی میں کڑکڑاتے ہوئے گھی یا تیل میں پڑتا ہے تو آواز ہوتی ہے اور روغن میں بلبلے اور جھاگ سے اُٹھتے ہیں اس کو کبوتر کی غٹر غوں سے تشبیہ دی ہے کیا اچھی سوجھی ہے۔ واہ۔ حضرت حافظ شیرازیؒ کا مطلع اور دوسرا شعر جو قطعہ بند ہیں یہ ہیں ؎

بلبلے برگِ گلے خوش رنگ در منقار داشت
واندراں برگ و نوا خوش نالہائے زار داشت
گفتمش در عین وصل ایں نالہ و فریاد چیست
گفت مارا شیوۂ محبوب دریں کار داشت

اب آپ ان شعروں سے ہمارے شاعر ماکولات کے اشعار کا موازنہ کیجئے۔ اور دیکھئے کہ حافظ صاحب کے کلام میں کیا مزیدار تصرفات کئے ہیں۔ اس زمین میں ایک اور شعر ہے ؎

گر مزعفر با عدس نشست جرم سفرہ نیست
بادشاہِ کامراں بود از گدایاں عار داشت

فرماتے ہیں کہ مزعفر اگر مسور کے ساتھ دسترخوان پر نہ بیٹھے تو بیچارے دسترخوان کا کیا قصور۔ مزعفر قسمت مند و کامران بادشاہ کی طرح ہے اور وہ ظاہر ہے کہ فقیروں، غریبوں سے عار رکھتا ہے۔ مزعفر اور مظفر کی تجنیس بھی لطیف ہے۔ اس شعر میں پہلا مصرعہ لسحق کا اور دوسرا حافظ کا ہے کس خوبصورتی سے اپنایا ہے۔ حافظ صاحب کا مصرع اوّل یہ ہے ؎

یار اگر ننشست با ما نیست جائے اعتراض
بادشاہے کامراں بود از گدایاں عار داشت

در شعر ما از اں ہمہ ذکر مزعفر است
کز ہر چہ میرود سخن دوست خوشتر است

حافظ شیراز کا مطلع یہ ہے ؎

باغ مرا چہ حاجت سرو و صنوبر است
شمشادِ سایہ پرور ما از کہ کمتر است

من آں نیم کہ ز حلوا عناں بگردانم کہ ترک صحبت شیریں نہ کار فرہاد است

یہ بھی حافظ ہی کی زمین ہے۔ مقطع ملاحظہ فرمایئے۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

حسد چہ می بری اے کاسہ لیس بر لسحق
برنج زرد و عسل روزی خدا داد است

حافظ صاحب کا مقطع یہ ہے ؎

حسد چہ می بری اے سست نظم بر حافظ
قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است

چہ آرائی بمشک و زعفراں رخسار پالودہ (لسحق)
برنگ و بود خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را
جمالِ بَرّہ بریاں و حُسنِ دُنبہ کشمک
چناں بردند صبر از دل کہ ترکاں خوان یغما را
مرا زاں بوئے روح افزا کہ کیپا داشت ظاہر شد
کہ زود از پردۂ بہ ہیز بیروں آورد ما را

مزید لطف کیلئے حافظ صاحب کے اشعار ملاحظہ ہوں اس کے

بعد ان شعروں کی مختصر اور ضروری تشریح کردی جائیگی۔

فغاں کیں لولیان شوخ وشیریں کار شہر آشوب
چناں برند صبر از دل کہ ترکاں خوانِ یغمارا

زعشق ناتمام ما جمالِ یار مستغنی ست
بآب ورنگ و خال وخط چہ حاجت روئے زیبارا

من آں از حسنِ روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخارا

حافظ صاحب کا مذکورہ بالا شعر مشہور اور لاجواب ہے۔ اب بواسحٰق کے اشعار کا ضروری حل سمجھ لیجئے۔

برہ بکری کو کہتے ہیں۔ کشک اور کشک ایک قسم کا ہریسہ ہے جو آٹے اور بکری کے دودھ سے بنایا جاتا ہے۔ میٹھا اور نمکین دونوں قسم کا ہوتا ہے۔ نمکین میں گوشت بھی ڈالدیتے ہیں اور کیپا بھی ایک لذیذ کھانا ہے اس کی ترکیب یہ ہے کہ بکری کی آنتیں پاک صاف کرکے اس میں قیمہ گوشت مسالے اور چاول بھر کر گھی میں تلتے یا پکالیتے ہیں خوشبو کے لئے الائچی اور زعفران وغیرہ بھی شامل کرلیتے ہیں۔ باقی اشعار کے معنی صاف ہیں اس غزل میں حافظ شیراز کی غزل پر کئی جگہ ہاتھ مارا ہے اور ملاحظہ کیجئے ؎

دارم از کلّہ بریاں گلہ چنداں کہ مپرس
کہ چناں زو شدہ ام بیسرو ساماں کہ مپرس

کلّہ بریاں۔ بھنی ہوئی سری کا گوشت ؎

روزہ داری وریاضت ہوسم بود ولے
چشمکے میزند آں دُنبہ بریاں کہ مپرس

گرچہ پالودہ ندارد سرِ دنداں چنداں
من چناں عاشقمش از بُنِ دنداں کہ مپرس

گفتم اے دل زقطائف چہ قدر تواں خورد
گفت اگر ہست ترا ہاضمہ چنداں کہ مپرس

قطائف ایک قسم کی مٹھائی یا حلوا ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ لوزینہ (بادام کی مٹھائی) یا لوزینہ بھری روٹی کو کہتے ہیں۔ سوئیوں کو بھی رشتہ قطائف کہتے ہیں (غیاث) عربی میں تلطف کے معنی ہیں پہل ظنیا۔ اب مقطع ارشاد ہوتا ہے ؎

بہر بسحٰق زشیراز برائے بغرا
تا بجدیست مرا سیل خراساں کہ مپرس

بغرا کی نسبت لغت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک آش کا نام ہے جو خوارزم کے بادشاہ بغرا خاں نے ایجاد کیا تھا۔ وہ یہ ہے کہ بیسن (چنے کا آٹا) کی کاغذی لیموں کے برابر یا اس سے کچھ چھوٹی گولیاں بناکر اُس کا آش تیار کرتے ہیں۔ ممکن ہے بیسن کی پھلکیاں مراد ہوں جو سالن کی طرح مسالہ ڈال کر پکائی جاتی ہیں۔ دوسرا بیان یہ ہے کہ بادشاہ ترکستان کا ایجاد کردہ ایک قسم کا آش ہے۔

آئین اکبری میں مذکور ہے کہ بغرا ایک قسم کا پلاؤ ہے جو گوشت میدہ۔ چنا۔ گھی۔ قند۔ سرکہ اور ادرک وغیرہ سے تیار کیا جاتا ہے (غیاث) باقی شعر کا مطلب صاف ہے۔

اب حافظ صاحب کی غزل کے وہ اشعار ملاحظہ ہوں جن میں ہمارے شاعر طعام نے مزید تصرفات کئے ہیں۔ حافظ کا مطلع یہ ہے ؎

دارم از زلفِ سیاہت گلہ چنداں کہ مپرس
کہ چناں زو شدہ ام بے سروساماں کہ مپرس

اس کے پہلے مصرعے میں "زلفِ سیاہت" کی جگہ "کلّہ بریاں" رکھ کر اپنا بنایا ہے باقی پورا شعر حافظ کا ہے۔ دوسرا شعر ؎

گوشہ گیری وسلامت ہوسم بود ولے
فتنہ میکند آں نرگسِ فتاں کہ مپرس

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں تصرف کیا ہے "گوشہ گیری وسلامت" کی جگہ "روزہ داری وریاضت" بنایا ہے باقی پورا شعر الگ ہے لیکن چربہ اسی سے لیا ہے۔ دوسرے مصرع کے تصرفات خوب ہیں فتنہ کی جگہ چشمکے۔ میکند کی جگہ میزند۔ نرگس فتاں کی جگہ کلّہ بریاں بسحٰق کا ہے تیسرا شعر خالص انھیں کا ہے۔ حافظ صاحب کے کسی شعر کا رہین منت نہیں۔ چوتھے شعر کا اصل ماخذ حافظ کا یہ شعر ہے ؎

گفتم از گوئے فلک صورتِ حالی پرسم
گفت آں میکشم اندر خمِ چوگاں کہ مپرس

اس میں بہت تصرف ہے مگر لیا اسی سے ہے۔

حافظ کا مقطع یہ ہے ؎

گفتمش زلف بکین کہ کشادی ؟ گفتا
حافظ ایں قصہ دراز است بقرآں کہ مپرس

بسحق کا مقطع بالکل الگ ہے اس سے کچھ تعلق نہیں۔

ردیف ق میں ارشاد ہوتا ہے ؎

برنج زرد پراز روغن و رقیق و شفیق
گرت مدام میسر شود زہے توفیق

بغیر قلیہ برنج ایں طعامہا ہیچ است
ہزار بار من ایں نکتہ کردہ ام تحقیق

حافظ کے شعر سنئے ؎

مقام امن و مے بیغش و رفیق شفیق
گرت مدام میسر شود زہے توفیق

جہان و کار جہاں جملہ ہیچ در ہیچ ست
ہزار بار من ایں نکتہ کردہ ام تحقیق

مطلع کا پہلا آدھا مصرع ان کا تصرف کیا ہوا ہے جس پر خط ہے باقی پورا حافظ صاحب کا ہے دوسرے شعر کا دوسرا مصرعہ پورا حافظ کا ہے صرف پہلے میں پون مصرعہ بسحق کا ہے جس پر خط ہے۔

اور فرماتے ہیں ؎

صباحی کسے کاچی آورد پیش،	وزاں خشم بر رفت دودم بسر
ازاں کینہ ازخانہ بیروں شدم	بہ مہمانیم خواند بارے دگر
چو رفتم عدس بود و نان جویں	بیاد آمدم آنکہ گفتے پدر
بہر حال مر بندہ را شکر بہ	کہ بسیار بد باشد از بد تر

یہ حضرت سعدی شیرازی کی ایک حکایت گلستاں کا چربہ ہے آخری مصرعہ سعدی کا ہے۔ اشعار صاف ہیں ترجمہ لکھنے کی چنداں ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

یہ ہے بسحق اطعمہ کے کلام کا نمونہ۔ ہر شعر میں کسی کھانے کا ذکر ضرور ہے اور حافظ شیراز کے اکثر پاکیزہ اشعار میں تصرف کرکے کس خوبی سے اپنا لیا ہے، چونکہ یہ بسحق کی ظریفانہ جدت تھی یہ کلام اپنے زمانے میں بہت مقبول ہوا، لوگ پڑھتے اور لطف لیتے تھے امراء کے یہاں بھی لطف کا سبب تھا لیکن ان شعروں میں کوئی اعلیٰ نکتہ پردازی۔ بلندخیالی اور تخیل کی عظمت نہیں نظر آتی سوا اس کے کہ کھانے کا ذکر ہر شعر میں ہے۔ بہرحال یہ بھی ایک جدت تھی جو بہت دنوں تک مجلسوں میں گرمی اور لطف کا باعث رہی اور بسحق علاج کو اس مسخرہ پن نے بہت فائدہ پہنچایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو میں بسحق کا پیرو یا جواب کوئی نہیں ہوا البتہ ان کے بالکل خلاف لکھنؤ میں ایک میاں چرکین ضرور گذرے ہیں جن کے مذاق لطیف کا یہ عالم ہے کہ انھیں گو۔ موت اور گوز وغیرہ ناپاک اور گندہ چیزوں کے بیان کے علاوہ کسی پاک و لطیف چیز سے دلچسپی نہیں اسی میں کمال حاصل تھا ان کا زیادہ کلام تہذیب سے بھی گرا ہوا ہے اور اُس کا نمونہ یہاں پیش کرنا ہماری بحث سے خارج ہے بسحق پر یہ مضمون کوئی جامع و کامل مضمون نہیں ہے اگر مزید کاوش سے کام لیا جائے اور تذکروں کی ورق گردانی کی جائے تو بسحق کے مزید حالات اور کلام فراہم ہوسکتا ہے ہم نے مدیر "عالمگیر" کے تقاضے۔ وقت کی تنگی اور عجلت کے خیال سے صرف نمونہ پیش کردیا ہے اور حضرات اس میں اضافہ فرماسکتے ہیں۔ میرے خیال میں بسحق پر اردو میں غالباً یہ پہلا مضمون ہے ایسی نئی چیزیں پیش کرنا ہمارے ادیبوں کا فرض ہونا چاہئے امید ہے کہ آئندہ اور اہل قلم بھی ظریف شعراء پر کچھ نہ کچھ لکھتے رہینگے۔

قطعہ

جناب عبدالعظیم خانصاحب عزمی

ہنوز تیری نظر میں ہے یہ جہاں محدود
ہنوز حسنِ ازل تجھ پہ برملا نہ ہوا،

ہنوز وا نہ ہوئے تیرے دیدۂ باطن
ہنوز اصل حقیقت سے آشنا نہ ہوا

نہیں تو اپنے مقام بلند سے آگاہ
ہنوز دہر میں ہم سنگ نقش پا نہ ہوا

جو اپنے ساز رگ جاں سے واسطہ ہے تجھے
تو فکر کیا ہے اگر کوئی رہنما نہ ہوا

اسیر ہوش و خرد ہے ہنوز اے عزمی
خودی کو بھول کے تو بندۂ خدا نہ ہوا

"ذکر و فکر" کا ایک ورق

نغمۂ شوق

از جناب اثر صہبائی صاحب ایم-اے-ایل ایل بی

جناب اثر صہبائی ہندوستان کے رنگین نوا شاعروں میں ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کے کلام کا مجموعہ "ذکر و فکر" کے نام سے زیرِ طباعت ہے۔ ہم آپ کے بیحد ممنون ہیں کہ آپ نے ہماری درخواست پر یہ نظم خاص طور پر عالمگیر کے خاص نمبر کے لئے مرحمت فرمائی۔

اے مرے رنگِ زندگی! اے مرے نورِ زندگی
تیرے ہی دم سے ہے مرا کیف و سرورِ زندگی!

تیرے ہی فیض سے رواں ہے مرا کاروانِ زیست
تیرے کرم سے پُر بہار ہے مرا گلستانِ زیست

تیرے جمال سے مری چشم ہے نور آشنا
تیرے خیال سے مرا دل ہے سرور آشنا

تیرے ہی ذکر سے مرے لب ہیں رہینِ میکشی
تیری ہی یاد سے مری روح ہے غرقِ بے خودی

تیرا تبسمِ لطیف، مری بہارِ زندگی!
تیری نگاہِ دلنواز، میرا قرارِ زندگی

کوثرِ نغمہ و سرود ہے تری گفتگو مجھے
خندۂ گلفشاں ترا دعوتِ ہاؤ ہو مجھے

ایک جہانِ رقص ہے تیرے خرامِ مست میں
تیرے خرامِ مست سے رقص بلند و پست میں

تیرے شباب کی بہار رشکِ صد ہزار خلد
تیری ہر اک نگاہِ پُرشوق ہے نثارِ خلد

بادۂ عشق سے ترے شام و پگاہ مست ہوں
روزِ الست سے ترا رندِ سیاہ مست ہوں

اے مرے رنگِ زندگی! اے مرے نورِ زندگی!
تیرے ہی دم سے ہے مرا کیف و سرورِ زندگی!

بھوت

ایک سنسنی خیز، بہترین پُراسرار افسانہ

ادیب شہیر حضرت ایم۔ اسلم کے قلم سے

ڈاکٹر اینڈریو یا پادری اینڈریو سے میرے بہت دیرینہ مراسم تھے
میں شکار کا دیوانہ اور اُسے بھی شکار کی لت لینی ؎
خوب گذرے گی جو مل بیٹھینگے دیوانے دو

میری پہلی ملاقات ڈاکٹر اینڈریو سے اُس وقت ہوئی جب میں ملازم تھا۔ ڈاکٹر اِس ملک میں نووارد تھا۔ اسے رومن کیتھولک مشن کیلئے کچھ زمین کی ضرورت تھی۔ میری کوشش سے اُسے کوئی بیس پچیس ایکڑ زمین بہت سستے داموں مل گئی اور ڈاکٹر کچھ میرا اتنا گرویدہ ہوگیا کہ مشن کے کام سے جس وقت اُسے فرصت ملتی میرے پاس آجاتا۔ شکل وصورت سے تو وہ کٹر پادری نظر آتا تھا لیکن حقیقت میں وہ بہت باذاق آدمی تھا زبان اتنی میٹھی کہ سانپ کو بھی رام کرلے۔ اخلاق ایسا اچھا کہ دشمن بھی دوست بن جائے۔

ہم جب بھی ملتے بس یہی شکار کی باتیں لے بیٹھتے۔ یا کبھی کبھی وہ مجھے امریکہ کے لچوں اور بدمعاشوں کے ایسے ایسے قصے سناتا کہ بسا اوقات تو میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے۔ معلوم ہوتا کہ ہمارے یہاں کے لچے شہدے تو اُن کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے اور پھر ڈاکٹر ان کے جرائم کی داستان کچھ اس انداز سے بیان کرتا کہ الفاظ میں تصویر کھینچکر دکھا دیتا۔

اس وقت ڈاکٹر کی عمر پچاس سے کچھ اوپر ہی تھی اور وہ گرجے کی خدمت سے سبکدوش ہوچکا تھا۔ اس جگہ وہ مشن ہسپتال کا مہتمم تھا۔ اس ہسپتال سے کوئی امیر ہو یا غریب دوا بھی مفت ملتی اور اگر ضرورت ہوتی تو ڈاکٹر بغیر فیس لئے مریض کو گھر پر بھی جاکر دیکھ آتا۔

ایک روز جو میں اُسے ملنے گیا تو وہ کچھ مغموم سا بیٹھا تھا۔ میں نے ہنسکر کہا۔ "ڈاکٹر! دیکھا۔ اسی لئے میں تم سے کہا کرتا ہوں کہ شادی کرلو۔"

"پھر کیا ہوگا؟" اُس نے پوچھا۔

"پھر یہ تنہائی کی گھڑیاں خوشگوار ہوجائینگی۔" میں نے جواب دیا۔

"شادی سے تنہائی کی گھڑیاں کیسے خوشگوار ہوسکتی ہیں" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"جب میم صاحبہ تشریف لے آئینگی تو پھر کوئی نہ کوئی شغل رہا کریگا۔" میں نے کہا۔ "اور جب کوئی شغل ہوگا تو پھر پریشانی یوں دامنگیر نہ ہوا کریگی۔"

"تم نے یہ کیسے جانا کہ میں پریشان ہوں۔" ڈاکٹر نے پوچھا۔

میں نے ہنسکر کہا۔ "ڈاکٹر تم پر تو وہی مثل صادق آتی ہے کہ "صورت بیں حالت مپرس"۔ ذرا آئینہ لیکر صورت تو دیکھو کیا ہوائیاں اُڑ رہی ہیں یا تو یہ بات ہے کہ بس ؏
سارے جہاں کا درد تمھارے جگر میں ہے
اور جو یہ نہیں تو پھر کوئی خلاف معمول واقعہ ضرور ہے جو تم اس قدر مضمحل نظر آرہے ہو۔"

"کچھ بھی نہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"یہ تو میں ماننا نہیں ڈاکٹر۔" میں نے کہا ؏ کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے

ڈاکٹر ایک آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ پاس ایک تپائی پر انگریزی کے دو چار اخبار رکھے تھے۔ برآمدے کی دیواروں پر عشق پیچاں نے اپنا جال پھیلا رکھا تھا۔ عشق پیچاں میں پھول آئے ہوئے تھے اور شہد کی دو چار موٹی موٹی مکھیاں ان پھولوں سے عشق بازیاں کر رہی تھیں۔ بسنتی رنگ کی ننھی ننھی تیتریاں بیلوں میں ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ اور چڑیا کا ایک جوڑا برآمدے میں چھت میں چھپا بیٹھا چڑ چوں کر رہا تھا۔ اور ایک چھپکلی بھڑوں کے اس چھتے کے پاس جو برآمدے کی ایک محراب میں تھا اپنے شکار کی تاک میں لگی بیٹھی تھی۔

آپ جانئے مجھے اس کمبخت چھپکلی سے ہمیشہ سے نفرت ہے اس کی شکل دیکھ کر مجھے کچھ گھن سی آنے لگتی ہے۔ میں نے اُسے ڈرانے کے لئے زور سے تالی جو بجائی تو چڑیا کا جوڑا خوفزدہ ہو کر پھر سے باہر بھاگ گیا۔ ڈاکٹر بولا۔

"بھئی ان غریبوں نے تمھارا کیا بگاڑا جو تم نے اُن کو یہاں سے نکال دیا؟"

"ڈاکٹر" میں نے کہا "میں نے تو اس کمبخت چھپکلی کو یہاں سے ہٹانے کو تالی بجائی تھی"

ڈاکٹر اس کی طرف دیکھ کر بولا "بیچارہ رہنے دو تمھارا کیا بگاڑتی ہے۔ آخر اس نے بھی تو پیٹ بھرنا ہے"

"بہت کریہہ صورت چیز ہے" میں نے کہا۔

"کریہہ صورت ہے یا اچھی صورت۔ اس کی ذمہ دار نہ وہ ہے نہ ہم تم ہیں۔ یہ تو اس کے بنانے والے کی مرضی ہے جو بنایا سو بنا دیا"

"بجا ارشاد ہوا جناب پادری صاحب!" میں نے ہنس کر کہا۔

"پادری بننا بھی تو کچھ آسان نہیں" اُس نے بھی ذرا مسکرا کر کہا۔

"جس نے مفت کی کھائی ہو وہ پادری بن جاتا ہے" میں نے جواب دیا۔

"بھئی! یہ تو تم نے غلط کہا" ڈاکٹر نے ایک آہ بھر کر کہا۔

"غلط ۔۔۔؟" میں نے پوچھا "نہ کام نہ کاج اور حکومت مفت کی۔ کہئے تو کیا کام کرنا پڑتا ہے آپ کو؟"

"یہ مت پوچھو" ڈاکٹر بولا "پادری بننا آسان نہیں" بہت ذمہ داری کا کام ہے"

"یہ تو میں بھی مانتا ہوں" میں نے ہنس کر کہا۔ "کہ جناب مسیح علیہ السلام کی بھیڑوں کی نگہبانی کوئی آسان کام نہیں۔ ٹھیک ہے نا؟"

"بھئی! چھوڑو اس قصے کو" ڈاکٹر نے ذرا مسکرا کر کہا۔

"تو فرمایئے کہ آج آپ یہ پریشان سے کیوں بیٹھے ہیں" میں نے کہا۔

"کبھی کوئی بھوت دیکھا ہے تم نے" ڈاکٹر نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"خدا نہ دکھلائے" میں نے جواب دیا۔

"خدا نہیں دکھلایا کرتا۔ بلکہ بھوت خود نظر آیا کرتے ہیں" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"تو اس وقت آپ نے کوئی بھوت دیکھا ہے" میں نے کہا۔ "جو آپ یوں کھوئے کھوئے سے بیٹھے ہیں"

اس کے جواب میں ڈاکٹر نے دو ایک بار سر ہلا دیا۔ اور میں ایک مصوّر اخبار اٹھا کر دیکھنے لگا۔ پہلے صفحہ پر شیطان کی تصویر تھی۔ سر پر سینگ تھے۔ شکل انسان کی لیکن نیچے کا جسم حیوان کا۔ اور پاؤں بکری کے ایسے تھے۔ میں نے کہا ۔۔۔ "ڈاکٹر! شیطان کے سر پر سینگ بھی ہوا کرتے ہیں؟"

"کبھی دیکھا تو نہیں" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"یہ دیکھ لو" میں نے اخبار اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کہیں اسی نے تو نہیں پریشان کر رکھا ہے تمھیں؟"

"شیطان مجھے کیوں پریشان کرنے لگا" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"تم جو عمر بھر شیطان کش کرتے رہے" میں نے کہا۔ "تو کیا اب وہ انتقام نہ لے گا؟"

"شیطان نابکار نے کیا انتقام لینا ہے" ڈاکٹر بولا "لیکن یہ بُری طرح میری جان کا لاگو ہو رہا ہے"

"کون ۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے جواب تو کچھ نہ دیا صرف منہ سے سیٹی بجانے لگا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ "اگر انسان مجبوری میں کوئی گناہ کرے تو کیا اس کی بھی سزا بھگتنی پڑیگی؟"

تاریخ سوانح عمری

کتاب	مصنف	قیمت
مصطفیٰ کمال	کے حمید	2/-
غدر ۱۸۵۷ء کی مکمل داستان		1/-
چینی مسلمان		1/4/-
کمپنی کی حکومت	باری	1/8/-
عربوں کا تمدن	نذیر نیازی	2/-
انقلاب روس	کشن پرشاد کول	2/8/-
ہندوستان کا نیا دستور حکومت		1/-
سولینی		-/6/-
ہٹلر ـ میری جد وجہد		2/-
محمد شاہ تغلق	مہدی حسین	2/8/-
محبوب خدا	چوہدری افضل حق	1/8/-
پیغمبر صحرا	خالد لطیف گابا	2/-
سرور کائنات	سید امیر علی مرحوم	1/4/-
زوال غازی	عزیز ہندی	3/8/-
سلطان ابن سعود		2/-
تعمیر نو	عبداللہ انور بیگ	1/4/-
تاریخ کانگرس		2/8/-
انقلاب فرانس	باری	-/12/-
تاریخ مکہ معظمہ		1/-
تاریخ مدینہ منورہ		1/-
عرب و ہند کے تعلقات	سلیمان ندوی	4/-
انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ		3/8/-
قرون وسطی میں ہندوستانی تہذیب		4/-
مہاراجہ رنجیت سنگھ		3/8/-
تاریخ اسلام مکمل		5/-

ادب و تنقید

کتاب	مصنف	قیمت
مکاتب غالب	ناظم علی عرشی	4/-
فلسفۂ عجم	علامہ اقبال	2/8/-
مقالات یوم اقبال		1/8/-
پیام اقبال	طالب بی ـ اے	2/-
مختصر تاریخ ادب	اعجاز حسین ایم اے	2/8/-
ذکر غالب	مالک رام ایم ـ اے	-/8/-
اکبر الہ آبادی	طالب الہ آبادی	5/-
سودا	پروفیسر چاند ایم ـ اے	3/-
شعرائے پنجاب	نسیم رضوانی	2/-
معین الشعرا	آفاق بنارسی	5/-
تذکرہ شعرائے دکن ـ دو جلد		10/-
ہندی شاعری	ڈاکٹر اعظم کریوی	2/-
اردو کے اسالیب بیان	زور ایم اے	1/4/-
یادگار انیس		2/-

لغات اردو

کتاب	قیمت
کریم اللغات	-/9/-
لغات کشوری	3/4/-
مبادی اللغات	1/4/-
لغات فیروزی	2/8/-
فیروز اللغات دو جلد	8/-
جدید اللغات اردو	3/-
مفید اللغات	2/-
ہندی اردو ڈکشنری	7/8/-
انگریزی اردو ڈکشنری	3/-

نظم

کتاب	مصنف	قیمت
ارمغان حجاز	علامہ اقبال کی آخری تصنیف مجلد	3/8/-
جنگ نامۂ اسلام	منظور حسین	1/-
جام طہور	اثر صہبائی	1/8/-
سرود زندگی	اصغر گونڈوی	2/-
میخانۂ الہام	شاد عظیم آبادی	4/8/-
ریاض رضوان	ریاض خیر آبادی	6/-
آہنگ رزم	وقار انبالوی	-/8/-
دیوان بیدار	بیدار دہلوی	-/8/-
مصحف بیدم	بیدم وارثی	1/-
صحیفۃ التکوین	والئے چترال	3/-
باقیات فانی	فانی بدایونی	1/8/-
شعرائے اردو	نسیم رضوانی	2/-
بادۂ مشرق	ساغر نظامی	5/-
تصویر کشمیر	حفیظ جالندھری	8/-
دیوان غالب		5/-
دیوان غالب (بلاکوں سے چھپا ہوا)		1/8/-
دیوان حالی		-/8/-
دیوان ذوق		-/8/-
شعلۂ طور	جگر مراد آبادی	2/8/-
کلیات اکبر ـ تین حصے		4/8/-
کلیات طغرائی	فیروز الدین طغرائی	2/-
نوائے حرم	اختر شیرانی	1/-
نغمۂ روح	اختر انصاری	1/-
قصائد عزیز لکھنوی مجلد		3/-
عالم خیال	شوق قدوائی	-/4/-

ملنے کا پتہ

ہاشمی بک ڈپو بیرون لوہاری دروازہ لاہور

نوعی اور صنفی کتب

کتاب	قیمت
کام شاستر	-/12/-
پریم شاستر	1/-
گربھ شاستر	1/-
بڑے آدمیوں کا عشق	-/12/-
جوانی کی راتیں	-/12/-
علمی پریاں	1/-
گناہ کی دنیا	-/12/-
دلہن کی ڈائری	1/4/-
دلہنوں کی کانفرنس	1/-
ہدایت نامہ خاوند	-/8/-
ہدایت نامہ بیوی	-/12/-
سہاگ کی پہلی رات	-/8/-
لذت النساء	1/-
ابسنلو کا شاہکار	1/-

جاسوسی و دہشتناک ناول

کتاب	قیمت
آرسین لوپن	2/-
شاہی خزانہ	2/-
ڈاکٹر نکولا	1/8
نازک کنار	1/8
دغا کا پتلا	1/4
پیلا ہیرا	2/-
سنہری بچھو	2/-
کرنی کا پھل	2/8
زہری پان	2/-
چڑیا کی کی	2/-
جھانسی کی رانی	1/-
سراجہ دولہ	2/8/-
ستم ہوشربا	2/8/-

تاریخی و اسلامی ناول

کتاب	قیمت
معرکہ صلیب	2/-
سلطان صلاح الدین	-/12/-
مجاہد	-/12/-
طارق بن زیاد	-/12/-
انقلاب سمرنا	-/6/-
حور بغداد	-/6/-
بہادر عرب	-/12/-
ترکی امیر	-/12/-
شہزادی عباسہ	-/12/-
عرب کا چاند	-/12/-
مصر کا چاند	-/12/-
فتح ایران	1/2/-
مشرق کی حور	-/12/-
حور عرب	1/2/-
فتح یرموک	2/-
سعید و فلپانہ	2/-
فتح انطاکیہ دو جلد	4/-
جنگ صلیب و ہلال	2/-
آرمینا کا چاند	2/-
مشرق کی حور	1/-
ایران کی حسینہ	1/8/-
قعر دریا دو جلد	4/-
بہادر دلہن	1/8/-
آفتاب دمشق	1/4/-
تیغ کمال	1/-
در شاہوار	-/10/-

لڑکیوں کیلئے

کتاب	قیمت
سگھڑ بیٹی	-/10/-
آرسی	-/9/-
لڑکیوں کی انشاء	-/6/-
شریف بیٹی	-/4/-
سچے موتی	-/8/-

عورتوں کے لئے

کتاب	قیمت
خانہ داری	-/12/-
رفیق عروس	-/7/-
صفیہ بیگم	-/10/-
روشنک بیگم	1/8/-
اختر النساء بیگم	1/4/-
جانباز	-/12/-
زہرہ بیگم	-/14/-
سوکن کا جلاپا	-/6/-
نبات النعش	-/12/-
مراۃ العروس	-/12/-
زلفی	-/10/-
گل بکاؤلی	-/12/-
گوہر مقصود	-/6/-
سوشیلا	-/8/-
چمپا	1/4/-
آخری تحفہ	1/4/-
زاد راہ	1/-
واردات	1/-
مستورات چین و جاپان	-/4/-
باپ کا خط بیٹی کے نام جواہر لال	2/-

بچوں کیلئے

کتاب	قیمت
کھیل تماشا	-/3/-
مونگے کا جزیرہ	-/12/-
بچوں کے کارنامے	-/6/-
رابندرناتھ ٹیگور	-/8/-
سرگذشت منصور	-/6/-
شہید یونان	/6/-
شیخ چلی کی کہانیاں	-/10/-
تحفہ امریکہ	-/6/-
تحفہ روس	-/6/-
داستان عجم اول -/14/- دوم	-/10/-
دلیزا دوں کا ملک	-/8/-
رابنسن کروسو	-/12/-
عجائب المخلوقات	/8/-
پنجاب کی نہریں	-/8/-
داستان وطن	-/6/-
نواب مرزا خان داغ	/4/6
میر درد	-/4/-
شبلی	-/4/6
مولانا نذیر احمد مرحوم	-/4/-
غالب	-/4/-
ہندوستان کی تاریخی کہانیاں اول	-/12/6
″ ″ دوم	-/12/-
مشکلات کی عظمت	-/6/-
لالہ زار	-/8
بھیشم	-/6/-
ہنومان	-/6/-
ارجن	-/7/-

ملنے کا پتہ

ہاشمی بک ڈپو بیرون لوہاری دروازہ لاہور

"ایک پادری کو تو غالباً نہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔
"پادری کو کیسے نہیں؟" ڈاکٹر نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔
"کسی کے اقبال گناہ پر گرجے سے اُسے معافی نامہ جو مل جاتا ہے" میں نے ہنسکر کہا۔

"تم ہنستے ہو" ڈاکٹر بولا "لیکن یاد رکھو۔ کسی کو اپنے گناہوں کا اقرار کرتے سننا بہت بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ اگر ایک حرف بھی کبھی زبان پر آجائے تو سمجھ لو دنیا میں اس کے لئے کہیں ٹھکانا نہیں۔"
"لیکن اقبال گناہ پر گرجے کا معافی دے دینا بھی تو کچھ کم مضحکہ خیز نہیں۔" میں نے ہنسکر کہا۔
"تمہارے نزدیک ہوگا" ڈاکٹر بولا "لیکن میرے خیال میں اس سے اگر اور کچھ نہیں تو کم از کم گنہگار کو تسلی تو ضرور ہو جاتی ہے اور سچ پوچھو تو میری اس پریشانی یا مصیبت کا بھی یہی باعث ہے۔"

اتنے میں دو آدمی ڈاکٹر کو ملنے آگئے۔ یہ کسی مریض کو دکھلانا چاہتے تھے اور مریض جس گاؤں میں تھا وہ اُس جگہ سے کوئی پانچ سات میل کے فاصلہ پر تھا۔ ڈاکٹر چاہتا تھا کہ وہ اُسے یہاں ہسپتال میں لے آئیں لیکن ان دونوں آدمیوں کے بیان کے مطابق مریض سفر کے قابل نہ تھا۔
"دیکھ آیئے" میں نے کہا "شام تک تو آپ واپس آ ہی جائینگے"
"کوئی سواری ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔
وہ کہنے لگے کہ وہ گھوڑوں پر آئے ہیں لیکن اس کے لئے تانگہ مل سکتا ہے۔ خیر کچھ دیر کی رد و کد کے بعد ڈاکٹر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اور ان میں سے ایک تھوڑی دیر کے بعد ایک تانگہ لے آیا۔
"رات تمہیں میرے ساتھ کھانا کھانا ہوگا" ڈاکٹر نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "کس وقت آؤگے؟"
"کیا آج رات ہی؟" میں نے پوچھا۔
"ہاں!" ڈاکٹر نے جواب دیا "آج رات ہی۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"
"شام کے بعد آؤنگا" میں نے کہا۔
"میں بھی شاید شام تک ہی آسکوں" ڈاکٹر بولا۔
"آپ آئیں یا نہ آئیں" میں نے ہنسکر کہا "لیکن میں تو آجاؤنگا"
ڈاکٹر تانگے میں سوار ہو کر مریض کو دیکھنے چلدیا اور میں بائیسکل پر سوار ہو کر اپنے ڈیرے پر آگیا۔

میں شام کے بعد ڈاکٹر کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ لیکن وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ ہوا بہت خوشگوار تھی اور لیلائے شب آہستہ آہستہ اپنے چہرہ پر سے گھونگھٹ اُٹھا رہی تھی۔ جس طرح آسمان پر تارے چمک رہے تھے اسی طرح کرمک شبتاب جھاڑیوں میں انجمن آرائی کر رہے تھے۔ دو چمگادڑیں برآمدے میں فراٹے بھر رہی تھیں۔ لیکن جب نوکر نے برآمدے میں لیمپ روشن کر کے رکھا تو یہ دونوں باہر نکل گئیں روشنی ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ پروانے مستوں کی طرح جھوم جھوم کر چاروں طرف سے آنے لگے اور کچھ تو اتنے بیتاب تھے کہ چمنی سے چمٹ چمٹ جاتے لیکن تاب وصل نہ لا کر بیہوش ہو ہو کر گرتے اور تڑپ تڑپ کر جان دیدیتے۔
میں نے روشنی مدھم کر دی اور باہر نکل کر ٹہلنے لگا۔ نوکر گھروں کی طرف کوئی شخص بیٹھا گراموفون بجا رہا تھا۔ ع پریت کی ریت بُری ہے ایک تو گانے والے کی آواز میں کچھ سوز تھا۔ دوسرے فضا بھی کچھ اداس اداس سی تھی۔ اور پھر "پریت کی ریت بُری ہے۔" ایک امر واقع تھا میں سوچنے لگا کہ انسان محبت تو اس لئے کرتا ہے کہ اس سے دل کو خوشی، مسرت اور اطمینان حاصل ہو۔ لیکن اس کے برعکس بعض اوقات یہ سودا بہت مہنگا بھی پڑتا ہے۔ اور یہی پریت یا محبت اس کے لئے آتش جہنم بن جاتی ہے اور وہی کباب سیخ والی بات صادق آتی ہے کہ پہلو پر پہلو بدلتے ہیں لیکن کل نہیں پڑتی اور پھر ستم یہ کہ ذی روح اور غیر ذی روح دونوں اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ انسان انسان سے محبت کرتا ہے تو حیوان حیوان سے۔ سارس اور کونج کی محبت تو ضرب المثل ہے اور پھر گھوڑے اور کتے کو اپنے آقا سے محبت ہوتی ہے وہ بھی کوئی چھپی ہوئی بات نہیں اور پھر یہ نظام عالم بھی اگر غور سے دیکھا جائے تو محبت کے بل پر قائم ہے ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے پھر پریت کی ریت کا بُرا ہونا انتہائی بدقسمتی ہے۔ میں انہی خیالات میں غلطاں

نہیں بیٹھنے دیتا۔"

"اس سے تو مجھے انکار نہیں۔" ڈاکٹر بولا۔ "کہ محبت کی کشش بہت تاثیر رکھتی ہے اور موجودہ سائنس کی تحقیقات کا ملخص بھی یہی ہے کہ اگر محبت زندہ ہے تو مرنے والا بھی زندہ ہے اور کسی حالت میں بھی ہم سے جدا نہیں رہتا اور اگر وہ چاہے یا یوں کہہ لو کہ جذبۂ اُلفت سے کھنچکر کبھی ہمیں اپنے وجود اثیری میں نظر آجاتا ہے لیکن میرا مطلب یہ نہیں۔ میں تو یہ پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی روح جسے عوام الناس "بھوت" کے نام سے منسوب کرتے ہیں آپ کو خواہ مخواہ پریشان کرے تو اُس سے کسی صورت سے چھٹکارا بھی مل سکتا ہے۔"

"سمجھ گیا۔" میں نے ہنسکر کہا۔ "آج کل کوئی بھوت آپ کو پریشان کر رہا ہے۔"

"ہاں" ڈاکٹر بولا۔ "اس کمبخت نے مجھے واقعی بہت پریشان کر رکھا ہے۔"

"آپ تو ڈاکٹر ہیں۔" میں نے کہا۔ "اپنے وہم کا علاج کیجئے۔"

"گویا تم مذاق سمجھ رہے ہو۔" ڈاکٹر بولا۔ "لیکن روح القدس کی قسم میں مذاق نہیں کر رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے خلاصی کیسے ہو؟"

"آخر بات کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مدت کی بات ہے۔" ڈاکٹر کہنے لگا۔ "میں ایک گرجے کا پادری تھا اور لوگ میرے پاس اقبال گناہ کے لئے بھی آیا کرتے تھے اور یہ میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ کسی سے اقبال گناہ یا اعتراف گناہ سننا ایک بہت ذمہ داری کا کام ہے۔ اگر ایک لفظ بھی کسی وقت زبان پر آجائے تو دین دُنیا دونوں میں ذلیل ہونے کا ڈر رہتا ہے۔

خیر، ایک روز ایک بہت متمول آدمی قتل ہوگیا۔ اور قتل کے شبہ میں اس کا ملازم جو ایک عیسائی تھا گرفتار کر لیا گیا۔ حالانکہ وہ اُس روز گھر پر موجود ہی نہ تھا۔"

"پھر شک کیسے ہوا؟" میں نے پوچھا۔

ڈاکٹر کہنے لگا۔ "اُس کے پلنگ پر جو کمبل تھا اُس پر خون کے نشان تھے اس کے علاوہ کچھ روز سے مقتول کو کچھ تہدیدی خطوط بھی آیا کرتے تھے اور مقتول کو اپنے اس ملازم پر شک تھا۔ بات یہ تھی کہ مقتول کا چال چلن کچھ اچھا نہ تھا۔ عیاش آدمی تھا۔"

"مالک کی عیاشی سے نوکر کو کیا سروکار؟" میں نے پوچھا۔

"نوکر پر اس لئے شک تھا کہ مقتول کا ایک ایسی عورت سے بھی تعلق تھا جو رشتہ میں نوکر کی کچھ لگتی تھی اور نوکر کو اس کا آنا جانا پسند نہ تھا۔ مقتول نے یہ سب خطوط ایک روز پولیس کو دیدیئے اور اپنے شکوک بھی بیان کر دیئے۔ خیر، نوکر گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے خلاف شہادت دینے والا تو کوئی تھا نہیں، صرف اُس کے کمبل پر خون کے نشان تھے جس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ قتل کرنے کے بعد اُس نے جلدی میں اسی کمبل سے ہاتھ صاف کئے ہونگے۔ کچھ مختصر سی عدالتی کارروائی کے بعد نوکر کو پھانسی کی سزا ہوگئی۔ اب میں ہر روز جیل میں اُس کے پاس جاتا اور اُسے طرح طرح سے اقبال گناہ کی تلقین کرتا۔ اس شخص نے اپنی زندگی کے کئی ایک ایسے واقعات مجھے سنائے کہ اُس کی سفاکی یا عیاری پر میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے لیکن مالک کے قتل سے وہ ہمیشہ انکار کر دیتا۔ میں نے اس سے ایک روز کہا کہ اگر وہ اپنے گناہوں کا بار ساتھ لے جائیگا تو اس کی روح کو سخت عذاب ہوگا۔ اور جناب روح القدس اُس کی ہرگز شفاعت نہ کرینگے۔ یہ سُن کر وہ کہنے لگا کہ جناب! جب میں نے اپنی زندگی کے تمام واقعات آپ کو بلا کم وکاست سنا دیئے ہیں تو غور تو فرمائیے کہ اگر میں نے یہ جرم بھی کیا ہو تو اس کے چھپانے سے اب میں موت سے تو بچ نہیں سکتا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ میں بالکل بے گناہ ہوں اور بلا قصور مارا جا رہا ہوں۔

جس روز اُسے پھانسی ملنی تھی اُس سے ایک روز پیشتر ایک نوجوان عیسائی میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ آپ میرا اقبال گناہ سن لیجئے اور مجھے مقدس گرجے کی معافی دیجئے۔ ہم دونوں گرجے میں آگئے اور وہ کچھ دیر اپنی لغزشیں یا گناہ تفصیل وار بیان کرتا رہا اور سب سے آخر اُس نے کہا کہ میں ہی اس متمول آدمی کا قاتل ہوں۔ وہ اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ میں اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ پاس ہی میز پر ایک چھری پڑی تھی۔ یہ شخص میری محبوبہ پر ڈورے ڈال رہا تھا۔ مجھے یہ سخت ناگوار تھا۔ میں نے منت بھی کی دھمکی بھی دی لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ میں نے طیش میں آکر میز پر سے چھری اُٹھا کر اُس کے سینے میں گھونپ دی اور نوکر کے کمرے

وہ پہاں تھا کہ ڈاکٹر بھی آ پہنچا۔

"کب آئے تم؟" اُس نے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔ پھر نوکر کو آواز دیکر کہنے لگا "کمبخت برآمدے میں روشنی تک نہیں کی ابھی تک"۔

میں نے کہا۔ "وہ تو لیمپ جلا کر رکھ گیا تھا میں نے بتی مدھم کرکے ایک طرف رکھ دیا ہے"۔

"کیوں؟" ڈاکٹر بولا۔ "کیا تمھیں بھی روشنی سے نفرت ہے؟"

"شکریہ" میں نے ہنسکر کہا۔ "سمجھ گیا۔ لیکن یہ آپ کی روشنی تو پروانوں کے لئے پیغام قضا تھی۔ میرے دیکھتے دیکھتے بیسوں جل مرے"۔

"حیات سرمدی بھی تو مرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے"۔ ڈاکٹر بولا۔

"تو آپ پھر خودکشی کیوں نہیں کرلیتے"۔ میں نے ہنسکر کہا۔

"میں خودکشی کیوں کرلوں؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"حیات سرمدی کے لئے"۔ میں نے ہنسکر کہا۔

"بھئی کون کج بحثی کرے تم سے۔ چلو اندر چل کر بیٹھیں۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے"۔

"مریض کو دیکھ آئے"۔ میں نے پوچھا "کیا تھا اُسے؟"

"نمونیہ"۔ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "دونوں پھیپھڑے خراب ہو چکے ہیں"۔

"گویا"۔ میں نے ہنسکر کہا "حیات سرمدی حاصل کرنے والا ہے"۔

"جو کچھ تم سمجھ لو"۔ ڈاکٹر بولا۔

نوکر نے کمرے میں روشنی کردی تھی۔ ہم دونوں اندر جا بیٹھے ڈاکٹر کہنے لگا۔ "اگر کچھ حرج نہ ہو تو تم آج میرے پاس ہی رہ جاؤ"۔

"کیا ڈر آنے لگا تمھیں؟" میں نے پوچھا۔

"ڈر ور کی بات نہیں"۔ ڈاکٹر بولا۔ "مجھے ذرا اطمینان قلب کی ضرورت ہے"۔

"اس کا علاج میں بتلا سکتا ہوں"۔ میں نے کہا۔

"کیا ——؟"

"شادی کر لیجئے"۔

"تمھیں تو شادی کے سوا اور کچھ سوجھتا ہی نہیں"۔ ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ "دو چار شادیاں اور کیوں نہیں کرلیتے؟"

"چار شادیاں کرنا تو مذہبًا جائز ہے"۔ میں نے جواب دیا۔

"تو پھر دیکھتے کیا ہو؟" ڈاکٹر بولا "نیک کام میں دیر کیوں؟"

نوکر نے اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے۔ ہم دونوں کھانے والے کمرے میں جا بیٹھے۔

"ایک بات پوچھوں؟" ڈاکٹر بولا۔

"شادی کے متعلق؟"

"گویا" ڈاکٹر نے ہنسکر کہا۔ "دنیا میں شادی بیاہ کے علاوہ اور کوئی بات تو کرنے کے قابل ہے ہی نہیں"۔

"پھر ——؟"

"ارواح کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"میرا تو ایمان یہ ہے کہ روح کے لئے موت نہیں"۔ میں نے کہا۔

"یہ تو ٹھیک ہے"۔ ڈاکٹر کہنے لگا۔ "لیکن کیا تمھارے عقیدے کے مطابق ارواح کبھی نظر بھی آسکتی ہیں؟"

"مجھے تو یقین ہے کہ جب چاہیں واپس آسکتی ہیں"۔ میں نے جواب دیا۔

"میں پوچھتا ہوں"۔ ڈاکٹر بولا۔ "کبھی نظر بھی آسکتے ہیں؟ کبھی تم نے بھی دیکھا؟"

"دیکھا تو نہیں"۔ میں نے کہا۔ "لیکن اگر وہ چاہیں تو ہمیں نظر بھی آسکتے ہیں"۔

"گویا یہ ارواح کی مرضی پر ہے"۔ ڈاکٹر بولا۔

"میرا تو یہی عقیدہ ہے"۔ میں نے جواب دیا۔

"اگر ہم چاہیں کہ وہ ہمیں نظر نہ آئیں"۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔

"اس میں ہمارے چاہنے یا نہ چاہنے کا سوال نہیں"۔ میں نے جواب دیا۔ "ڈاکٹر محبت ایک ایسی چیز ہے جو مرنے کے بعد بھی برقرار رہتی ہے اور میرے خیال میں اسی لئے محبت کو غیر فانی کہا جاتا ہے دل کی کشش یا جذب محبت بسا اوقات ایسے ایسے کرشمے دکھلاتی ہے کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے اور یہ محبت ہی ہے جو ارواح کو اس دنیا سے کھینچ لاتی ہے یعنی ہمارا جذبہ الفت اُنھیں اس جہان میں بھی چین سے

میں جاکر اس کے کمبل سے ہاتھ صاف کئے اور چپکے سے باہر نکل گیا۔ میں نے پوچھا کہ اب کیا ارادہ ہے وہ کہنے لگا ارادہ کیسا؟ اب جاتا ہوں لیکن میں نے اُسے خدا کا خوف دلایا اور کہا کہ وہ اسی وقت عدالت میں چل کر اپنا بیان لکھوائے ورنہ ایک بیگناہ صبح مارا جائیگا۔ لیکن وہ کہنے لگا کہ مجھے کیا پڑی ہے کہ میں مُفت میں جان گنواؤں۔ میں نے کہا کہ میں خود پولیس کو اطلاع کرتا ہوں اور تمھیں ابھی پکڑوا تا ہوں۔ یہ سن کر وہ بہت ہنسا اور کہنے لگا کہ جو جی میں آئے کیجیئے مگر اس کے نتیجہ سے بے فکر مت رہئے۔ خیر وہ پاجی تو چلا گیا، اور میں حیران تھا کہ کروں تو کیا کروں۔ گرجے کے قوانین کے مُطابق نہ میں اس کا نام بتلا سکتا تھا اور نہ اس کو پکڑوا سکتا تھا۔

آخر کچھ سوچ کر میں ایک مجسٹریٹ کے پاس گیا اور اُس سے کہا کہ ابھی ابھی ایک شخص میرے پاس آیا تھا۔ وہ مقدس گرجا کا معافی نامہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے اس متمول آدمی کے قتل کا بھی اقرار کیا ہے۔ آپ اس کے ملازم کو چھوڑ دیجیئے وہ بالکل بے گناہ ہے۔ میں حلف اٹھاتا ہوں کہ ملازم اپنے آقا کا قاتل نہیں مجسٹریٹ کہنے لگا کہ اسے اس میں تو کچھ شک نہیں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں بالکل سچ ہے لیکن جب تک میں قاتل کا نام و پتہ نہ تبلاؤں اور اسے گرفتار نہ کر لیا جائے عدالت کچھ نہیں کر سکتی۔ میں نے کہا کہ گرجے کے قوانین کی رُو سے میں اس شخص کا نام و پتہ ہرگز نہیں تبلا سکتا اس پر مجسٹریٹ کہنے لگا کہ جب اصل ملزم ہی موجود نہیں تو ہم اس شخص کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں جس کے کمبل پر خون کے نشان موجود ہیں اور جو شخص خود یہ اقرار کر چکا ہے کہ وہ اپنے آقا سے خوش نہ تھا۔ قصہ مختصر ایک بے گناہ آدمی کو تختہ دار سے بچانے کے لئے جو کچھ میں کر سکتا تھا کیا۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی اور اگلے روز اس بے گناہ کو پھانسی دے دی گئی۔

شام کا وقت تھا اور میں گرجے کے باغ میں ٹہل رہا تھا۔ مقدس روح القدس کی قسم مجھے اس بیگناہ کے پھانسی پانے کا بہت افسوس تھا۔ اچانک مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ کوئی شخص میرے پیچھے چل رہا ہے لیکن میں اسے وہم سمجھا۔ میں چہل قدمی کرتا ہوا گرجے سے باغ کے دروازے تک جاتا اور

وہاں سے لوٹ کر گرجے تک آتا۔ اب جو میں دروازے پر پہنچکر لوٹنے لگا تو یہ آواز آئی۔ "پادری صاحب! ایک بے گناہ کو پھانسی دلواکر آپ خوش تو بہت ہونگے۔" سچ جانو یہ الفاظ سنتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے میں نے ادھر اُدھر دیکھا لیکن وہاں کوئی بھی نہ تھا آخر یہ سمجھ کر کہ شاید میرا ضمیر ہی مجھے ملامت کر رہا ہو پھر چہل قدمی کرنے لگا اس واقعے کو دو چار روز گذر چکے تھے۔ اتوار کا دن تھا میں گرجے میں تقریر کر رہا تھا اور لوگ خاموش بیٹھے سُن رہے تھے۔ میں نے تقریر کرتے ہوئے جب لوگوں سے یہ کہا کہ ایک بیگناہ کی جان بچانے کے لئے انسان کو اگر کچھ قربانی بھی کرنی پڑے تو اُس سے گریز نہیں کرنا چاہئے تو اس وقت مجھے عقب سے یہ آواز سنائی دی۔ "جس طرح آپ نے میری جان بچانے کے لئے قربانی کی تھی۔"

یہ الفاظ سن کر میرے بدن میں کپکپی سی پیدا ہو گئی اور دو ایک منٹ تک میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ کچھ لوگ بڑے تعجب سے میری طرف سے دیکھنے لگے۔ بہرکیف مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ یہ آواز میرے وہم کی پیدا کردہ چیز نہیں بلکہ اس شخص کی آواز ہے۔ جس کے متعلق مجھے معلوم تھا کہ وہ بالکل بے گناہ ہے۔

اس واقعے کو کئی روز گذر چکے تھے اور مجھے کچھ اطمینان ہو چکا تھا کہ شاید اب وہ پھر پریشان نہ کریگا۔ لیکن ایک روز جب میں دو ایک دوستوں کے ساتھ بیٹھا چاء پی رہا تھا اور کچھ جزا و سزا پر گفتگو ہو رہی تھی یکایک پھر وہی آواز سنائی دی۔ "پادری صاحب! کیوں لوگوں کو دھوکا دے رہے ہیں آپ۔ کیا یہ بھی روح القدس کی تعلیم ہے کہ کسی بے گناہ کو مت موت سے بچاؤ۔"

یہ الفاظ سن کر میں کانپ گیا اور شاید میرے چہرے کا رنگ بھی کچھ متغیر ہو گیا تھا کیونکہ میرے دوست کچھ تعجب سے میری طرف دیکھنے لگے تھے۔ اس وقت تک تو مجھے صرف آواز ہی سنائی دیتی تھی۔ لیکن ایک روز میں ایک مریض کو دیکھ کر واپس آ رہا تھا کہ مجھے پھر محسوس ہونے لگا کہ کوئی شخص میرے پیچھے پیچھے چل رہا ہے میں نے ایک دو بار پلٹ کر دیکھا لیکن کچھ بھی نظر نہ آیا۔ پھر مجھے محسوس ہونے لگا کہ کوئی شخص میرے دوش بدوش چل رہا ہے اور پھر یہ آواز سنائی دی۔

"آپ اتنے پریشان کیوں ہیں۔ میں وہی بدنصیب ہوں جس کی موت کا باعث صرف آپ کی خاموشی ہے۔ ذرا میری طرف تو دیکھئے شاید اب بھی آپ کو مجھ پر کچھ رحم آجائے۔"

لیکن یہاں دیکھنے کی ہمت کون کرتا۔ میں ذرا تیزی سے چلنے لگا تو پھر آواز آئی۔ "اوہو آپ تو کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں گویا آپ کو میری طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں۔"

اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ کوئی شخص جو ابھی ابھی میرے ساتھ چل رہا تھا اب مجھ سے آگے نکل گیا ہے۔ میں جیب سے رومال نکال کر چہرے پر سے گرد و غبار صاف کرنے لگا لیکن جب میں نے رومال ہٹایا تو وہی ملازم میرے آگے آگے جا رہا تھا اس کے گلے میں پھانسی کی رسی تھی۔ میں اسی جگہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا اور مقدس انجیل جیب سے نکال کر ہاتھ میں پکڑی دو چار قدم آگے جا کر وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ پاک مریم کی قسم اس کی شکل دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے چہرہ اتنا بھیانک تھا کہ توبہ ہی بھلی۔ رسی کے پھندے کے باعث اس کی گردن بہت سکڑی ہوئی تھی اور آنکھیں معلوم ہوتا تھا کہ ابل کر باہر نکل آئی ہیں۔ "پادری صاحب! یہ سب آپ کی مہربانی ہے۔ روح القدس کو کیا مُنہ دکھائینگے آپ؟" اتنا کہہ کر وہ دیکھتے دیکھتے میری نظروں سے غائب ہو گیا۔

اب وہ دوسرے تیسرے روز اسی حالت میں مجھے نظر آتا آخر میں نے تنگ آکر گرجے سے علیحدگی اختیار کر لی اور وقت سیر و سیاحت میں گذارنے لگا اس واقعہ کو کچھ اوپر تین سال ہو چکے ہیں مشن والے اس جگہ اپنا خیراتی ہسپتال کھولنا چاہتے تھے اور انھیں ایک تجربہ کار آدمی کی ضرورت تھی آخر ان کے مجبور کرنے پر میں اس جگہ چلا آیا۔ یہاں آنے پر بھی مجھے کوئی سال ایک ہونے کو ہے اور اب وہ پھر مجھے پہلے کی طرح پریشان کرنے لگا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "لیکن اتنا عرصہ تو وہ آپ کو نظر نہیں آیا؟"

"نظر تو نہیں آیا لیکن اس کی آواز کبھی نہ کبھی ضرور سنائی دیتی ہے۔"

"یہاں یہ واقعہ کب پیش آیا؟" میں نے پوچھا۔

ڈاکٹر بولا۔ "ایک روز یہاں ایک بڑھیا میرے پاس آئی اس کا بیٹا پولیس والے پکڑ لے گئے تھے وہ کہتی تھی کہ وہ بے گناہ ہے۔ میں نے کہا اگر تیرا بیٹا واقعی بے گناہ ہے تو وہ ضرور بچ جائیگا۔ یہ الفاظ میرے مُنہ سے

نکلے ہی تھے کہ پاس سے آواز آئی۔ "پادری صاحب! ایک بڑھیا کو جھوٹی تسلی دیتے آپ کو شرم تو نہیں آتی"۔ خیر جب وہ بڑھیا چلی گئی تو میں اندر جاکر صوفے پر لیٹ گیا اور ایک کتاب دیکھنے لگا۔ مجھے شاید کچھ اونگھ سی آگئی۔ کتاب میرے ہاتھ سے نیچے گر گئی میں نے کتاب اٹھانے کیلئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ پاس سے آواز آئی۔ "یہ لیجئے"۔

میں نے آنکھ کھول کر جو دیکھا تو وہی کمبخت کتاب ہاتھ میں پکڑے کھڑا تھا۔ اس روز سے وہ برابر ہر روز مجھے پریشان کر رہا ہے میں نے مشن والوں کو لکھ دیا ہے کہ مجھے اس خدمت سے جلدی سبکدوش کر دیں گے"۔

اُس وقت لیمپ کی روشنی کچھ مدھم سی پڑنے لگی۔ میں نے کہا معلوم ہوتا ہے لیمپ میں تیل نہیں ہے"۔

لیکن ڈاکٹر نے کچھ جواب نہ دیا۔ روشنی اور بھی مدھم ہونے لگی، اور میں نوکر کو آواز دینے کے خیال سے جونہی اٹھا تو ڈاکٹر کہنے لگا "بیٹھ جاؤ"۔

"لیمپ بجھ جائیگا"۔ میں نے کہا۔

لیکن ڈاکٹر نے پھر مجھے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ روشنی کافی مدھم ہو چکی تھی اور کمرے میں کچھ دھواں دھواں سا نظر آرہا تھا۔ میں دروازے کے سامنے تھا اور ڈاکٹر کی دروازے کی طرف پشت تھی۔ دفعتہ مجھے دروازے میں کسی شخص کا سایہ نظر آیا۔ یہ سایہ بڑھتے بڑھتے میز کی طرف آگیا۔ تو یہ ہے تو یہ! ــــــ ہمارے سامنے ایک نوجوان آدمی کھڑا تھا۔ چہرہ اس قدر خوفناک تھا کہ دیکھ کر دل میں وحشت پیدا ہوتی تھی۔ اُس کے گلے میں رسی کا پھندا تھا اور آنکھیں اُبل کر باہر آرہی تھیں۔

وہ چپ چاپ کھڑا ڈاکٹر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور ڈاکٹر سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ میری حالت کیا تھی اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔

تأثّرات

از جناب مولانا انعام اللہ خاں صاحب ناصرحسن پوری

آہ کی سینہ سوزیاں، آنکھ کی خونفشانیاں
بندہ نواز ہیں یہ سب، آپ کی مہربانیاں

رازِ وفا نہ فاش ہو، ناز نہ بے نیاز ہو
دُور نہ ہوں خدا کرے، آپ کی بدگمانیاں

دل کی خلش نہیں گئی، ٹیس جگر میں ہے ابھی
لُطفِ نگاہِ ناز کی باقی ہیں کچھ نشانیاں

اِس سے یہ مُدّعا نہیں دید کی تاب ہے کِسے
عِشق کے چھیڑنے کو ہیں حُسن کی لن ترانیاں

مَست گھٹا کے جوش کو دیکھ کے یاد آگئیں
عہدِ شبابِ رفتہ کی بھُولی ہوئی کہانیاں

بی-اے پاس کرنے کا آسان طریقہ

منشی فاضل پاس کرنے کے بعد صرف انگریزی کا امتحان میٹرک ایف-اے اور پھر بی-اے کا دیکر بی-اے کی پوری ڈگری حاصل کریں اور اردو کا امتحان ادیب عالم دیکر میٹرک و ایف-اے پاس کر سکتے ہیں مکمل قواعد کے لئے علیحدہ فہرست کتب پتہ ذیل پر طلب کریں جن کتب کی رعایتی قیمت نہیں دی گئی اُن پر ۲ر فی روپیہ کمیشن ہوگی (علاوہ مطبوعات یونیورسٹی)

نام کتاب	قیمت	رعایتی قیمت
منشی فاضل ۱۹۳۹ء		
(۱) ویس وعجم	۴ر سے	
جواہر البحور بی اے عربی کورس (نثر)	عہ ۱۲ر	
شعر العجم ۴/	عہ ۴ر	عہ ۴ر
العروض والقوافی ۵/	عہ ۱۲ر	۱۴ر
(۲) چہار مقالہ	۶ر	۱۲ر ۴ر
ابوالفضل اول وسوم معہ فرہنگ	۱۲ر	۸ر
حاجی بابا اصفہانی	سے	عہ ۸ر
سیاحتنامہ ابراہیم بیگ دوم	عہ	۱۲ر
وکلائے مرافعہ	۳ر	۲ر
(۳) انتخاب قصائد قاآنی	۸ر	۶ر
غزلیات نظیری تا ردیف راء	۱۰ر	۶ر
دیوان فرخی حصہ شامل نصاب	عہ	۱۰ر
منطق الطیر مطبوعہ تاج بکڈپو	۱۲ر	۸ر
رباعیات باباطاہر معہ ترجمہ و شرح	۴ر	۳ر
〃 ابوسعید ابوالخیر مترجم	۱۲ر	۸ر
(۴) تاریخ وصاف	عہ	
سیر المتاخرین از بابر تا جہانگیر	عہ	۱۰ر
(۵) اخلاق جلالی	عہ	۱۲ر
رموز حکمت	عہ	
درۃ الاخبار مطبوعہ یونیورسٹی	عہ	عہ ۱۲ر
کشف المحجوب حصہ شامل نصاب	عہ	عہ ۴ر
(۶) ترجمہ و جواب مضمون		
اختیاری مضمون		
(۱) روح الاجتماع	عہ	
افادات مہدی	سے	〃

نام کتاب	قیمت	رعایتی قیمت
انتخاب مخزن دوم (نثر)	عہ	
رویائے صادقہ	عہ ۴ر	
ادبی خطوط غالب	عہ ۱۲ر	
(۲) دیوان حالی معہ مقدمہ	عہ ۴ر	۴ر
دیوان غالب	۶ر	
بانگ درا	عہ ۸ر	
خلاصہ العروض	۱۲ر	۸ر
کتب امدادی		
حل دبیر عجم	۱۰ر	۶ر
ترجمہ جواہر البحور حصہ نثر مکمل	عہ ۸ر	عہ
خلاصہ شعر العجم ۴/	۴ر	۲ر
〃 〃 ۵/	۳ر	۲ر
ترجمہ چہار مقالہ	۸ر	
〃 ابوالفضل اول	عہ	۸ر
〃 〃 سوم	عہ ۸ر	۱۲ر
〃 وکلائے مرافعہ	۳ر	۲ر
فرہنگ حاجی بابا	عہ ۸ر	
〃 سیاحت نامہ	۸ر	۵ر
ترجمہ قصائد قاآنی	۱۴ر	۱۰ر
سیر المتاخرین	عہ ۴ر	۱۲ر
درثمین خلاصہ سوالاً جواباً	۸ر	۶ر
تاج ٹیسٹ پیپرز ۱۹۳۹ء	عہ	عہ
ترجمہ تاریخ وصاف	عہ ۸ر	عہ
دیوان فرخی معہ فرہنگ	عہ ۴ر	۱۲ر
خلاصہ تاریخ وصاف	۸ر	۵ر
〃 〃 سوالاً جواباً	۳ر	۲ر

نام کتاب	قیمت	رعایتی قیمت
ترجمہ اخلاق جلالی	عہ	
چارٹ 〃	۴ر	۲ر
ترجمہ کشف المحجوب	عہ	عہ
خلاصہ اخلاق جلالی سوالاً جواباً	عہ	۸ر
معنی مطالب خلاصہ کشف المحجوب	۸ر	۵ر
اسرار فلسفہ خلاصہ رموز حکمت	۸ر	۵ر
شرح منطق الطیر	عہ	۱۲ر
〃 غزلیات نظیری	عہ	۱۲ر
گنجینۂ اسرار خلاصہ درۃ الاخبار	۸ر	۵ر
ابناء الاخیار ترجمہ 〃 〃	عہ ۸ر	عہ
ضمیمہ اتالیق عجم قسم اول	۳ر	۲ر
بادہ شیراز مجموعہ مضامین فارسی	عہ	
پرشین کمپوزیشن	عہ	
بادہ شیراز یعنی مجموعہ مضامین فارسی	عہ	
پرچہ جات منشی فاضل ۲۹ء تا ۳۸ء	۱۱ر	۸ر
مخزن فضیلت	۱۰ر	۵ر
حل پرچہ جات ۳۲	۴ر	۲ر
〃 〃 〃 ۳۳	۴ر	۲ر
〃 〃 〃 ۳۴	۴ر	۲ر
〃 〃 〃 ۳۵	۴ر	۲ر
〃 〃 〃 ۳۶	۴ر	۲ر
〃 〃 〃 ۳۷	۴ر	۲ر
〃 〃 〃 ۳۸	۴ر	۱ر
ترجمہ سیاحت نامہ		
〃 〃 دوم	عہ ۴ر	۱۰ر
〃 حاجی بابا مکمل	عہ	

نام کتاب	قیمت	رعایتی قیمت
ادیب عالم ۱۹۳۹ء		
مصباح القواعد نحو	عہ ۱۲ر	
نکات سخن ہر سہ حصہ مکمل	عہ	
(۲) آبحیات	سے	
(۳) مجموعہ نظم آزاد	۸ر	
مسدس حالی	۶ر	۴ر
انتخاب مخزن اول (نظم)	عہ	
قصائد ذوق	۴ر	۳ر
گلزار نسیم یعنی یادگار نسیم	عہ ۴ر	۱۲ر
عود ہندی غالب	۸ر	۵ر
غالب از مہر	عہ ۱۲ر	عہ ۱۰ر
(۵) دربار اکبری	۸ر	
زندگی	عہ ۱۲ر	
(۶) جواب مضمون اردو		
کتب امدادی		
خلاصہ مصباح القواعد نحو	۳ر	۲ر
〃 آبحیات	۸ر	۶ر
شرح قصائد ذوق	عہ ۴ر	
فرہنگ عود ہندی	۴ر	۳ر
خلاصہ غالب	۱۲ر	۸ر
خلاصہ دربار اکبری	عہ	۱۰ر
مجموعہ مضامین اردو	۸ر	
پرچہ جات ادیب عالم		
۲۷ تا ۳۴	۸ر	۵ر
۲۵ تا ۳۷	۳ر	
طبع رواں مجموعہ مضامین اردو	عہ	زیر طبع
کلید کامیابی یعنی حل پرچہ جات	عہ	
خلاصہ نکات سخن	۵ر	۴ر

(تاج ٹیسٹ پیپرز ۱۹۳۹ء طلبہ منشی فاضل کے لئے مختلف لائق پروفیسروں سے سٹ کرائے گئے ہیں قیمت عہ)

ملنے کا پتہ: ملک نذیر احمد تاجر کتب و مالک تاج بکڈپو موہن لال روڈ بیرون موری گیٹ - لاہور

(فرمائش خریداری کے وقت رسالہ کا حوالہ ضرور دیں ورنہ رعایتی قیمت نہ دی جائیگی)

مدراس کا ایک باکمال شاعر

شمس العلماء محمد عبدالرحمٰن شاطر کی شاعری پر ایک نظر

از جناب سید احمد اللہ صاحب قادری ایڈیٹر "تاریخ"

لسان الحکمۃ شمس العلماء محمد عبدالرحمٰن شاطر مدراس کے باکمال شاعر جن کا مشرب صوفیانہ اور مسلک فلسفیانہ ہے اپنے اعلیٰ مذاق سخن کے باعث ہندوستان میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں ان کا کلام قدیم اور جدید تحقیقات کا آئینہ ہوتا ہے۔

شاطر عالی خاندان بزرگ ہیں۔ ان کے دادا نواب سکندر جنگ نواب عظیم جاہ، پرنس آف آرکٹ کے حقیقی خالہ زاد بھائی تھے نواب ہدایۃ الدین خاں شہید ان کے دادا کے پرنانا تھے۔ ان کی نانی نواب اعظم جاہ کی صاحبزادی اور نواب اعظم الدولہ کی پوتی تھیں اور دادی نواب والاجاہ کی نواسی ان کے والد ... گوار خان بہادر مولوی عبدالغنی خاں زبردست عالم تھے جنہوں نے "یوسف زلیخا" کے فسانے کو سترہ سال کی عمر میں بزبان فارسی منظوم کیا تھا۔ ان کا ایک قصیدہ صنعت عاطلہ میں مشہور ہے۔

شاطر کے والد کا ننھیال حیدرآباد میں بڑا معزز گنا جاتا ہے نواب منیر الملک داماد میر عالم اس خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ شاطر کے اجداد سے فرخ شاہ اور سلیمان شاہ فرمانروائے کابل ہوتے ہیں۔ شاطر کا نسب چند واسطوں سے حضرت ناصر پر منتہی ہوتا ہے۔ جو حضرت عمر الفاروق رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ کے پوتے اور حضرت امام حسن علیہ السلام کے نواسے تھے۔

شاطر کو سید شاہ حسینی القادری المتخلص بہ محرم سے بیعت حاصل ہے شعر میں کسی سے اصلاح نہیں لیتے

فیضِ حق را کمینہ شاگردیم عقل کل را ہمینہ فرزندیم

۱۸۹۸ء سے انکو خاندانی اعزاز کے صلہ میں پنشن ملا کرتی ہے ۱۹۰۵ء میں انہوں نے اعلیٰحضرت غفران مکان کے جوبلی دربار میں ایک قصیدہ پڑھا تھا جسے سرکار نے بے حد پسند فرمایا۔ ۱۹۱۹ء سے مدراس یونیورسٹی کے بورڈ آف اسٹیڈیز کے رکن اور ۱۹۱۱ء سے ممتحن ہیں اسی سال گورنمنٹ نے انکو سرٹیفکیٹ آف آنر عطا فرمایا۔ ۱۹۱۳ء سے پرنس آف آرکٹ کے ایجنٹ اور ۱۹۱۰ء سے آنریری مجسٹریٹ ہیں۔ اسی سال گورنمنٹ نے ان کو مسلمانوں کا نمائندہ مقرر کرکے وزیر ہند اور وایسرائے سے گفتگو کرنے کا موقع دیا۔ ۱۹۱۹ء میں پبلک سٹی کانفرنس کے رکن ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں ان کی خدمات اور قابلیت کے اعتراف میں مدراس کے مسلمانوں نے "لسان الحکمۃ" کا خطاب ایک ایڈریس کے ساتھ پیش کیا۔ اس جلسہ کے انعقاد کے لئے جو اشتہار جاری ہوا تھا۔ اس پر (۹۴) معززین مدراس کے دستخط ثبت تھے۔ جس کی تائید سر محمد عثمان سابق گورنر مدراس نے فرمائی سر حبیب اللہ اس کے میر مجلس تھے۔ سر عبدالرحیم (حال صدر اسمبلی) اور سر سی پی راماسوامی آیر (دیوان ٹراونکور) نے بھی اس میں شرکت فرمائی تھی۔ اس کے دو ماہ بعد جون میں گورنمنٹ کی طرف سے "شمس العلماء" کا خطاب ملا۔ ۱۹۲۰ء سے یہ میسور یونیورسٹی کے ممتحن اور بورڈ کے ممبر ہیں ۱۹۲۲ء میں جب پرنس آف ویلز مدراس رونق افروز ہوئے تو یونیورسٹی کی جانب سے ان کو بطور خاص پیش کیا گیا۔ اس موقع پر ایک فارسی نظم پڑھی جس کے صلہ میں خلعت اور تمغہ سے سرفراز ہوئے ۱۹۲۲ء میں مدراس کے ایک عربی مدرسہ کا سنگِ بنیاد رکھا اور اسی سال گورنمنٹ کے فارسی مترجم مقرر

ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس نے پنڈتوں کے ساتھ انہیں خلعت دیا۔ ۱۹۲۲ء میں یہ بورڈ آف اگزامنرس کے "چیرمین" بنائے گئے اس کے علاوہ مدراس یونیورسٹی کے بورڈ آف اسٹیڈیز کے ممبر بھی ہیں۔

۱۹۲۶ء میں خسرو دکن، سلطان العلوم جب مدراس تشریف لے گئے تو ان کی صاحبزادیوں نے فارسی میں قصائد لکھ کر گزارے جنہیں سرکار نے شرف قبولیت بخشا۔

شاطر کے خاندان علم وفضل کے لحاظ سے جنوب میں ضرب المثل ہے۔ ان کی تصنیفات میں مثنوی "اعجاز عشق" ادبی حلقوں میں خاص شہرت رکھتی ہے ۱۹۲۷ء میں اس کا ضمیمہ شائع ہوا۔ اس کے ماسوا ایک منظوم رسالہ "احسان عشق" ہے جس میں شعری الہامات، رباعیات اور نعتیہ کلام ہے۔ ۱۹۱۰ء میں گلدستۂ شاطر کے نام سے کلام کا مجموعہ چھپا تھا۔

اعجاز عشق ان کی وہ معرکۃ الآرا نظم ہے جس نے اُردو شاعری میں انقلاب پیدا کیا۔ مولانا حالی، علامہ شبلی، ڈاکٹر نذیر احمد، رائٹ آنریبل سر امیر علی، نواب عماد الملک، سر اقبال، علی حیدر طباطبائی، عبدالحلیم شرر، وحید الدین سلیم، شاد عظیم آبادی وغیرہ، اساتذہ فن سے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔

شاطر سب سے پہلے جنوبی شاعر ہیں جنہیں شاعری کی حیثیت سے شمال میں بھی غیر معمولی درجہ حاصل ہے۔ مولانا حالی کا خیال ہے کہ ان کی شاعری ترقی کرکے درجۂ کمال پر پہنچ گئی ہے ان کے بعض اشعار پر خود مولانا حالی کو رشک آتا تھا کہ ایسا نرالا انداز بیان انہیں نصیب نہیں ہوا۔ حالی نے اُن کے اس شعر کی بیحد تعریف کی ہے ؎

بے محل اٹھتا نہیں ہے ایک بھی تیرا قدم
کون ہے تجھ پر سوار اے ابلقِ لیل و نہار

شرر مرحوم نے مندرجہ ذیل شعر کو "الہام" کہا ہے ؎

حرکتِ قسری ہے بیشک ذاتِ قاسر پر دلیل
گیند اچھلے ہیں یہاں دستِ قضا نے بیشمار

شرر کا ان کی نظم کے متعلق خیال ہے کہ اُردو کی بے مثال نظموں سے ہے گرامی ان کے کلام کی نسبت فرماتے ہیں کہ "الہامات" ہیں۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی اعجاز عشق پر جن علماء اور اساتذۂ فن نے تقاریظ لکھے ہیں ان میں سے چند کے اقتباس ذیل میں پیش کئے جائیں تاکہ بیش قیمت آرا کا اظہار ہو سکے۔

شبلی (۲۱ مارچ ۱۹۰۵ء اعظم گڈھ)

"میں مدت سے آپ کی قادر الکلامی اور خوش فکری کا معترف ہوں آپ کے کلام میں فلسفیانہ خیالات جس خوبی سے ادا ہوتے ہیں اس کی مثالیں اُردو میں بہت کم ہیں"۔

ڈاکٹر نذیر احمد ایل۔ ایل۔ ڈی (۲۲ جولائی ۱۹۰۰ء۔ دہلی)

"ایسا کلام ہندوستانیوں کے لئے مشکل اور مدراسیوں کے لئے محال ہے"۔

نواب عماد الملک بہادر (۵ اپریل ۱۹۰۵ء حیدرآباد دکن)

"اعجاز عشق کی جتنی تعریف کی جائے تھوڑی ہے۔ مضامین و الفاظ دونوں کے اعتبار سے اس میں محاسن بے شمار ہیں"۔

رائٹ آنریبل جسٹس سر امیر علی (۲۰ مئی ۱۹۰۸ء۔ لندن)

"آپ کے مضامین پڑھنے سے مجھے جو فرخندگی حاصل ہوئی اس کو بیان نہیں کرسکتا۔ میں بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ میں نہ صرف آپ کے کلام اور شاعری کا مداح ہوں، بلکہ جو عزت و احترام آپ کا میرے دل میں مرتسم ہے وہ آپ کے حکیمانہ خیالات اور باریک بینی کا نتیجہ ہے"۔

شاد عظیم آبادی (۱۳ اکتوبر ۱۹۰۳ء عظیم آباد)

"ایسے عمدہ مضامین کے ساتھ قصیدے اس زمانے کے لوگوں میں کسی نے نہیں کہے ہیں یا میری نظر سے نہیں گزرے، میں آپ کے اشعار کی کہاں تک تعریف کروں، حق یوں ہے کہ قلم توڑ دیا"۔

علی حیدر طباطبائی (۳۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء حیدرآباد دکن)

"ساری نظم موتیوں سے بھرا ہوا دریا ہے اور چند اشعار کو پڑھ کر کہنا پڑتا ہے کہ کانِ جوہر بے بہا ہے"۔

پروفیسر عبدالغفور شہباز (۲۹ ستمبر ۱۹۰۵ء۔ بھوپال)

"میں آپ کو ہندوستان کا حکیم سنائی سمجھتا ہوں"

وحید الدین سلیم (یکم مئی ۱۹۰۵ء۔ پانی پت)

"عام شعرا کے طرزِ کلام سے آپ کی طرزِ سخن کو کوئی نسبت نہیں"۔

سر اقبال (۲۴ فروری ۱۹۰۵ء)

"اشعار نہایت بلند پایہ اور معنی خیز ہیں۔ بندشیں صاف اور ستھری

اشعار کا الٹمٹونی درد مصنف کے چوٹ کھائے ہوئے دل کو نمایاں کر کے دکھا رہا ہے۔ آپ کا اسلوبِ بیان واقعی نرالا ہے اور آپ کی صفائی زبان آپ کے ہم وطنوں کے لئے سرمایۂ افتخار ہے میرا تو یہ خیال تھا کہ آپ اصل میں ہندوستان کے رہنے والے ہوں گے۔ مگر یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ آپ کی پرورش بچپن سے مدراس ہی میں ہوئی۔"

گرامی (۱۴ اپریل ۱۹۱۰ء حیدر آباد دکن)

شاطر مدراسی آں عالی دماغ — کز سخن پیرِ مغاں دادش ایاغ
مستی عقل ست مضمر در سرش — جوہرِ حکمت چکد از ساغرش
پردہ دار جلوہ ہائے رازِ عشق — نقشبندِ معنی "اعجازِ عشق"

اس موقع پر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا یہ قول یاد آتا ہے۔ جو انہوں نے غالب مرحوم کی نسبت کہا تھا کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں "مقدس وید" اور "دیوان غالب"۔ لیکن میں ان میں شاطر کی مثنوی "اعجازِ عشق" کا اضافہ بھی ضرور سمجھتا ہوں۔

شاطر کا کلام چونکہ ادق اور فلسفیانہ ہوتا ہے اور اس میں تصوف کے حقائق و دقائق اور حکمت کے ایسے اسرار و غوامض پائے جاتے ہیں۔ جو عام دسترس سے بالاتر ہیں۔ اس لئے اکثر ان کے کلام کو بھی غالب کے کلام کی طرح مافوق الفہم سمجھتے ہیں لیکن بات یہ ہے کہ ان کا کلام زیادہ تر تلمیحات پر مبنی ہوتا ہے اور جس کے سمجھنے سے عامۃ الناس کے اذہان و ایقان قاصر رہتے ہیں۔ اس لئے وہ ان کے ادراک و امکان سے بلند و باہر ہونے کے باعث عسیر الفہم ہو گیا ہے۔

ذیل میں ان کے کلام کا کچھ حصہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ وہ اصحاب جنہیں کلام دیکھنے کا موقع نہیں ملا مستفید ہو سکیں۔

ظاہر و باطن مرا ہے باطن و ظاہر ترا
تجھ سے میں ہوں آشکار اور مجھ سے تو ہے آشکار
نغمے اور نالے ہیں پوشیدہ نفس کے تار میں
عشق ہے مضراب اور انسان کا دل ہے ستار
آگے آگے اپنی عظمت ہے تو پیچھے پیچھے نور
کس طرف کھینچے لئے جاتے ہیں یہ لیل و نہار
اے محبت سینۂ عاشق ہے جولانگاہِ برق

یاں خس و خاشاک ہرگز پا نہیں سکتے ہیں بار
ناصح ناداں نہ گھبرا زلزلے سے اس قدر
خاک کے نیچے کوئی لیتا ہے کروٹ بیقرار
حوصلہ تیرا پتنگے کو کہاں بلبل نصیب
جل کے ہو جانا ہے ٹھنڈا یہ وفائی کا شعار
انجمن میں ہم ہیں لیکن انجمن دل میں نہیں
رب خلوت خانۂ دل ہے فقط تصویر یار
جب خدا ہم ہو نہیں سکتے تو بندے ہی نہیں
شیوۂ تسلیم مجبوری سے کر لیں اختیار
لامکاں بھی ایک زینہ ہے کسی کے بام کا
دل کہیں لامکاں ہے اور کہیں دل ہے یار
جذب ثقلی ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے ترا
دفترِ عالم کا شیرازہ ہے تجھ سے استوار
عشق کے مجرم کو دیتا ہے سزا خود اُسکا دل
نفس لوامہ میں پوشیدہ ہیں دوزخ بیشمار
محتسب تنزِ خدا کے پاس جنت بھی تو ہے
کیوں فقط دوزخ پہ ہے تیری سیاست کا مدار
کارگاہ دہر میں فعل عبث کوئی نہیں
ایک نے کھائی اگر ٹھوکر تو سنبھلے تین چار
دل وہ مقناطیس ہے زلزلہ نہ ہو جسکی کشش
زلزلے گو جسم کے کشور میں آتیں بے شمار
کشتگانِ عشق کو برزخ ہے زندانِ جہاں
زندگی کہتے ہیں جسکو موت کا ہے انتظار
عشق کی گرمی نہیں جس شئے میں وہ نابود ہے
برف کی ٹکروں کی ٹکر سے بھی پیدا ہوں شرار
ایک فانی دوسرے فانی پہ مرتا ہے یہاں
یہ عجب نے دہرِ فانی کی ہے اے پروردگار
تو نے عالم کی حقیقت کھولدی اے ٹیلیسکوپ
صفحۂ علم ازل کا آئینہ ہے روزگار

آنکھ جھپکی عرصۂ کون و مکاں طے ہوگیا
شہپرِ جبریل بالِ طائرِ دل پر نثار
ٹوٹنے والے ستارے ارض پر لائے حیات
سائنس کو کلون! اسی تحقیق پر ہے افتخار
مادہ اب تا قیامت سر اٹھا سکتا نہیں
برکلے کی تیغِ استدلال کا اللہ رے وار
مہد سے لیکر لحد تک ہم وہی ہیں بالیقین
سارے اجزا جسم کے بدلے اگرچہ بار بار
کیا عجب موجود ہوں سب عالمِ اصغر میں بھی
جتنے عنصر عالمِ اکبر میں ہیں اے ہوشیار
بعد مردن جب ہوا کشفِ غطا سمجھے یہ ہم
بطنِ مادر کی طرح دنیا بھی ہے تاریک و تار
علم حق میں جو تجلی طور سے مخصوص تھی
ہوتی کیونکر اس سے ظاہر کو جبل تھے بیشمار
بجلیاں تیغِ سکندر کی ہوئیں خاکِ سیاہ
خامۂ ہومر کے گوہر آج تک ہیں نور بار

میت کو زمین پہ سیر کرتے دیکھا
شیطان کو انساں سے ڈرتے دیکھا
دیکھا شق القمر زمانے میں ترے
سورج کو بھی ڈوب کر ابھرتے دیکھا

یہ مضامین حدیث شریف سے اخذ کئے گئے ہیں کہ میت کو چلتے پھرتے دیکھنا ہو تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دیکھا جائے حضرت عمر رض کو دیکھ کر شیطان بھاگ جاتا تھا یہ بھی حدیث شریف ہے چوتھے مصرع میں رجعتِ شمس کی طرف اشارہ ہے۔

سمجھے اُمّی کو سُن کے قرآن شاعر — دیکھا شق القمر تو جانا ساحر
مجنوں کہا کہ شعب سے نکلے جو رسول — کیا عقل کے دشمن تھے عرب کے کافر

شاطر نے اپنا مشرب نہایت لطیف پیرایہ میں اس طرح بیان کیا ہے

مشرب مرا توحید ہے مذہب اسلام — محرم مرشد ہے اور نعمان امام
فاروقی و قادری و چشتی ہوں میں — اور خواجہ نقشبند کا بھی ہوں غلام
کر دے گا وہ دل پہ نقش اللہ کا نام

شاطر شعرائے اُردو میں غالب، انیس، اکبر، اقبال اور محسن کے کمالاتِ شاعری کے معترف ہیں۔

الفاظ کی بندش و فصاحت دیکھو — مضمون کی جدّت و بلاغت دیکھو
ہے سہل ممتنع کلام اکبر — محبوب الٰہی کی کرامت دیکھو

اُردو میں ہے اچھے شعرا کی کثرت — کس کی نہیں کچھ نہ کچھ وطن پر منّت
لیکن اقبال، انیس، اکبر، شاطر — چاروں کا تخیل ہے مفیدِ ملت

اکبر، اقبال، محسن اور شاطر کی — تخیل میں ہے عجب نکتہ پردازی
ہاں غالب وہ تو ہے طلسم معنی

انہوں نے مثنوی اعجاز عشق کے خاتمہ میں شاعری کی حقیقت نہایت دلکش انداز میں بیان کی ہے۔ فاضل شاعر کو اس کا اچھی طرح سے احساس ہے کہ وہ شعر کی دنیا میں معمولی حیثیت نہیں رکھتا ہے بلکہ وہ اپنے کمالاتِ فن سے خوب آگاہ ہے۔

ہے مری تیغِ زباں شاطر علی کی ذوالفقار — اور عصائے موسوی ہے خامۂ سحر نگار
طائرِ سدرہ ہوں میں ہے کون ہمصفیر — سمجھیگا کیا خاک تو نغموں کو میرے اے ہزار

اپنی قسمت پر تو اے مدراس بیحد ناز کر
خاک سے اٹھا ہے تیری ایک فخرِ روزگار
کس کو خلاقِ معانی کا لقب زیبندہ ہے
کس کے اے شاطر ہیں مخلوقاتِ فکری بیشمار
گر کسی شاعر کے مضمون سے توارد ہو کہیں
صاف آئیگا نظر دونوں میں فرق نور و نار

خاتم اہلِ سخن ہے شاطرِ حکمت شعار　　نکتہ سنج مصحف دل رازدان روزگار

یہ حقائق یہ دقائق اسکی قسمت میں نہ تھے　　گرچہ فیضی بھی تھا شاعر اور بڑا حکمت شعار

یہ مضامین اور ہی کچھ ہیں وہ لفظی تھی ادر　　دعوئ باطل سے خاقانی ہے کیسا شرمسار

جسنے دیکھا غور سے شاطر کو اور اعجاز کو　　اُسنے عقلِ کل کی ہستی مان لی بے اختیار

شاطر ایطا کو جائز سمجھتے ہیں ان کی اکثر رباعیوں میں ایطا واقع ہے۔

ان کے کلام کی مختصر خصوصیات یہ ہیں کہ یہ مسائل حکمت وفلسفہ میں خیام و فاریابی کے صحیح جانشین ہیں اور رموز تصوف کے بیان کرنے میں عطار و ثنائی۔ جذبات کی ترجمانی میں گوئٹے اور غالب کے ہم پلہ ہیں۔

ان کی شاعری کا جب ہم بغور مطالعہ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کلام نہ صرف باطنی زمان و مکان اور خیالات و احساسات کی توضیح وتفسیر ہے بلکہ اس میں القائی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہ تجدیات ربانی کا کرشمہ ہے اور مبداء فیاض کا عطیہ — جو محض ان سے مخصوص کیا گیا ہے۔

"تُو . . . . سے"

(سانیٹ)

از محترمہ [illegible] صاحبہ

ارے بے مہر! تجھکو یاد ہے وہ ساعتِ رنگیں
وہ ہلکی چاندنی۔ وہ موسمِ گُل اور حسیں وادی
لئے تھی گود میں اپنی گُلِ عشق آفریں وادی
وہ جہلم کے حسیں پانی میں عکسِ چہرۂ پرویں

وہ غنچوں کے تبسم سے فضا میں نکہتیں برپا
مہکتے، مسکراتے سے گلوں کے احمریں گچھے
جو ہنس پڑتے نسیم جانفزا کے گدگدانے سے
وہ کلیوں کے حسیں نغموں سے کیفِ دلنشیں پیدا

اسی مدہوش کن عالم میں اے جانِ تمنا جب
کہا تھا مجھسے، میری روح تم، اور جان ہو اب تم
مری دنیا، مری عقبیٰ ہو اور ایمان ہو اب تم
مگر او بیوفا! ٹوٹے امیدیں بن کے وعدے سب
فریبِ آرزو دیکر کیا برباد یوں مجھکو، ارے ظالم وہ پیمانِ وفا کچھ یاد ہیں تجھکو؟

چار آنسو تربتِ معصوم پر

افکارِ تازہ خان صاحب حکیم محمود علی خاں صاحب ماہرؔ۔ اکبرآبادی

سرزمینِ دل میں تخمِ رنج و غم بوتا ہوں میں
تُو بھی رو ماہرؔ کہ تیرے حال پر روتا ہوں میں

راس آتی ہے رُخِ عالم کی شست و شو جسے
اہلِ دل سب گوہرِ سیّال کہتے ہیں جسے

ہاں وہ آنسو جس کے شیشے میں ہے عکسِ کائنات
ہاں وہ آنسو جس کے پیمانے میں ہے آبِ حیات

جو ہے وجہِ درسِ عبرت جو ہے مقبولِ خدا
جو ہے نازِ آدمیت اور فخرِ ارتقا

انتہائے غم ہے جس کی ہر جھلک سے آشکار
ہے مسرّت کی فراوانی بھی جس کی اک بہار

عالمِ فانی میں آنکھیں کھولتا ہے جب بشر
گریۂ اوّل سے ہوتا ہے دل اُس کا بہرہ ور

اور جب ہوتی ہے گل دنیا میں شمعِ زندگی!
اشک آخر میں بدل جاتی ہے ہر تابندگی

بچہ جب تک رو نہیں لیتا تو رہتا ہے اُداس
اور بے روئے نہیں آتی مسرّت کوئی راس

آنسوؤں کی جگمگاہٹ ہی سے پاتی ہے ضیا
خلوتِ محبوب ہو یا بارگاہِ کبریا

آہ کی مضراب سے بجتا ہے سازِ این و آں
آنسوؤں کے تار سے نغمے اُبلتے ہیں یہاں

ہو وہ محرابِ عبادت یا حریمِ دلبری
شمعِ شیون ہی سے ہے دونوں جگہ روشن گری

غم ہے لازم روح کی تابندگی کے واسطے
اشک روغن ہے چراغِ زندگی کے واسطے

آنسوؤں میں غرق جب ہوتی ہے انساں کی دعا
موت مل جاتی ہے اُس کو زندگی ہے چیز کیا

ماسوائے گریہ اب جو کچھ ہے سب بے سود ہے
میرے مرنے اور جینے کا یہی مقصود ہے

وقت ماہرؔ سوگوارِ عشرتِ مرحوم ہے
اب مرے آنسو ہیں اور اک تربتِ معصوم ہے

کورٹ شپ اور ہندوستان

ہندوستانی میں ایک دلچسپ بحث

(جو آل انڈیا ریڈیو دہلی اسٹیشن سے براڈ کاسٹ ہوئی اور اسٹیشن ڈائرکٹر صاحب کی اجازت سے شائع کی جا رہی ہے)

از محترمہ کشور زمانی بیگم صاحبہ رحمان
از محترمہ قیصر عشرت بیگم صاحبہ

کشور زمانی بیگم - کہو قیصر اچھی ہو آج بہت دن کے بعد دکھائی دیں -

قیصر جہاں بیگم - آپا بیگم اچھی ہوں - بریلی گئی ہوئی تھی - بھائی کی شادی تھی -

کشور زمانی بیگم - اچھا بھائی کی شادی تھی - کہو سمدھیانہ تو اچھا ملا - بھاوج پسند آئیں -

قیصر جہاں بیگم - جی ہاں اچھے لوگ ہیں شریف خاندان ہے -

کشور زمانی بیگم - بھائی کو بھی دلھن پسند ہے -

قیصر جہاں بیگم - ان کی پسند ہی کیا - نہ آئے گی تو کیا کریں گے -

کشور زمانی بیگم - اور کیا تمہاری پسند پہ راضی ہو جائیں گے -

قیصر جہاں بیگم - ہونا ہی پڑتا ہے - ان کے ماں باپ کو پسند ہے - ان کو بھی پسند ہے -

کشور زمانی بیگم - کیا خوب ابھی تک تم اسی رٹ پہ ہو -

قیصر جہاں بیگم - میری رٹ کیا ہے - آپا زمانے کی رسم یہی ہے -

کشور زمانی بیگم - زمانے کی رسم کو میں نہیں کہتی - میں تو یہ پوچھتی ہوں کہ تمہارے بھائی دلھن سے خوش نظر آتے ہیں - کیا اندازہ لگایا -

قیصر جہاں بیگم - آپس کی کئی باتیں تو ایسی ہوئیں جس سے کچھ بدمزگی پیدا ہو گئی - اور وہ کچھ خوش نظر نہیں آتے -

کشور زمانی بیگم - اسی لئے تو میں کہتی ہوں - کہ اس قسم کی اندھی شادیاں ٹھیک نہیں ہوتیں -

قیصر جہاں بیگم - مگر ہمارے ملک میں تو شادیاں اسی طرح ہوتی ہیں -

کشور زمانی بیگم - وہی تو اکثر بربادیاں ثابت ہوتی ہیں -

قیصر جہاں بیگم - پھر کیا آپ کی رائے میں شادی سے پہلے لڑکا لڑکی کو سامنے لانا چاہئے - اور وہ آمنے سامنے بیٹھ کر ایک دوسرے کو پسند کر لیں -

کشور زمانی بیگم - اس میں کیا مضائقہ ہے - شادی کے طریقہ میں اس قسم کی اصلاح کیوں نہیں کی جاتی -

قیصر جہاں بیگم - یہ طریقہ مغربی ملکوں کا ہے - ہماری معاشرت اس آزادی کی اجازت نہیں دیتی -

کشور زمانی بیگم - بس جہاں شادی میں مرضی کا نام آیا - اور تم لوگوں نے مغربی آزادی پر نلم دھرنا شروع کئے -

قیصر جہاں بیگم - اور کیا مغربی آزادی ہماری ملکی معاشرت کے خلاف نہیں -

کشور زمانی بیگم - جتنی مغرب کی بے جا آزادی خلاف ہے - اتنی ہی ہمارے ملک کی بے جا قید کچھ کم تکلیف دہ نہیں - بے سوچے سمجھے جو پابندیاں لگائی ہیں - وہ بھی تو مضر ہیں -

قیصر جہاں بیگم - کوئی بے جا قید نہیں - موجودہ رواج ہماری ضرورت اور زمانے کی معاشرت یا تہذیب کے موافق ہے - اگر ہم ان سے

بچکا قدم بھی رکھیں۔ تو نتیجہ یقیناً خراب ہوگا۔ ہمارے بزرگوں نے
سوچ سمجھ کر ہی یہ طریقے مقرر کئے ہیں۔
کشور زمانی بیگم۔ مگر اب زمانہ بدل رہا ہے۔ اس لئے ہمارے بزرگوں
کو ان طریقوں کی اصلاح بھی کرنی چاہئے تعلیم اور تمدن نے کتنی ترقی
کی ہے۔ یہ بھی تو دیکھو۔
قیصر جہاں بیگم۔ مگر اصلاح اس طرح نہیں ہو سکتی۔ کہ اپنے ملکی رسم و رواج
اور تمدن کے مناسب طریقوں کو توڑ پھینکیں۔ اور لڑکے لڑکی
کو پسند کا سودا کرنے دیں۔
کشور زمانی بیگم۔ یہ کونسی عقل کی بات ہے۔ کہ دو زندہ انسان بے سوچے
سمجھے اپنی عمریں ساتھ گزارنے کا فیصلہ کر لیں۔ اور اُن میں سے کسی
ایک کو بھی یہ خبر نہ ہو۔ کہ اُن دونوں کی مزاجی کیفیت کیا ہے۔ اور
کس طرح گذارہ ہوگا۔
قیصر جہاں بیگم۔ اس کی دیکھ بھال کے لئے ماں باپ کافی ہوتے ہیں۔ شادی
سے پہلے اولاد کی ہر بات کی دیکھ بھال والدین ہی کرتے ہیں۔ اولاد
کو دیکھنے یا کچھ سوچنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔
کشور زمانی بیگم۔ خوب آپ کی دلیل تو بہت معقول ہے۔
قیصر جہاں بیگم۔ اس کی معقولیت پر آپ کو کیا اعتراض ہے۔
کشور زمانی بیگم۔ اعتراض عقل کو ہے یا مجھے۔
قیصر جہاں بیگم۔ وہ عقلی اعتراض بھی فرمائیے۔ کیا ہے۔
کشور زمانی بیگم۔ یہ کہ جنہیں عمر بھر ساتھ رہنا سہنا ہو۔ اُن سے تو پوچھا
تک نہ جائے۔ کہ کہاں اور کس جگہ باندھے جا رہے ہیں۔ اور
والدین یا سرپرست چٹ منگنی اور پٹ بیاہ رچا کے اس کے منتظر
ہوں۔ کہ اُن کا یہ انتخاب خدائی فیصلہ ثابت ہو۔
قیصر جہاں بیگم۔ شادی کے رشتے کو خوشگوار اور کامیاب بنانے کے لئے
والدین اور سرپرست کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھتے۔ اس سے زیادہ
لڑکا لڑکی کیا کریں گے۔ اور انہیں حق ہی کیا ہے۔
کشور زمانی بیگم۔ کیا خوب ان کی زندگی کا فیصلہ ہو۔ اور انہیں بولنے
تک کا حق حاصل نہیں۔
قیصر جہاں بیگم۔ ان کے بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور یوں تو ہمارے
ملک میں بھی مرضی معلوم کر لی جاتی ہے۔ ایجاب و قبول کیا ہے۔
ہاں زمانے کی ضرورت اور ملکی تہذیب و لحاظ کے دائرہ میں
رہ کر سب کچھ کیا جاتا ہے۔
کشور زمانی بیگم۔ مگر کیا ہمارے ہی ملک کا قدیم رواج یہ نہ تھا۔ کہ
لڑکی اپنے بر کا انتخاب خود کرتی تھی۔ اسلام میں بھی عرب کا قدیم
رواج ہی رہا ہے۔ کہ لڑکے لڑکی کی مرضی معلوم کرنا لازمی تھا۔
اور اب تک موجود ہے۔ ایجاب و قبول ہی تو صحیح معنوں میں
نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد کچھ ہے۔ اور آج کل کی رسم کچھ اور ہے
قیصر جہاں بیگم۔ صحیح معنوں سے آپ کا کیا مقصد ہے۔ یہ ایجاب و قبول
کس طرح ہونا چاہئے؟
کشور زمانی بیگم۔ مقصد یہ ہے کہ لڑکے اور لڑکی دونوں کی پسند اور مرضی
کا جواب لئے بغیر رشتہ نہیں ہونا چاہئے۔
قیصر جہاں بیگم۔ ظاہر میں یہ بات تو آسان ہے۔ مگر آپ نے اس کی
خرابیوں پر غور نہیں کیا۔ ذرا سوچئے اس میں ایک خرابی تو یہ ہے
کہ یہ دونوں ابتدائی عمر کے لحاظ سے ایسی صحیح رائے ایک دوسرے
کے متعلق قائم نہیں کر سکتے۔ جیسے اُن کے تجربہ کار اور باخبر
والدین اُونچ نیچ سمجھ سکتے ہیں۔
کشور زمانی بیگم۔ نہیں ہمارے ہاں شادیاں بلوغ پر ہوتی ہیں۔ ہر
بالغ اپنے نیک و بد کو سمجھنے کی اچھی طرح صلاحیت رکھتا ہے۔
بلکہ میں تو یہ کہوں گی۔ کہ ان دونوں کو اپنی آئندہ زندگی کی اونچ
نیچ سمجھنے کا جتنا حق ہے۔ وہ کسی دوسرے کو نہیں۔
قیصر جہاں بیگم۔ آپ کا خیال ہی قطعی مغربی ہے۔ والدین ہر ممکن کوشش
سے لڑکے لڑکی کے حالات کو پہلے سے سمجھتے اور موزوں رشتہ
تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شادی کے بعد اگر میاں بیوی
اپنی تہذیب کی مناسب رواداری اور مذہبی معاشرت کے دائرے
میں رہ کر ایک دوسرے کے فرائض کو سمجھ لیں۔ تو کبھی ناگواری کا
امکان ہی نہیں ہو سکتا۔
کشور زمانی بیگم۔ مغرب کے پیچھے کیوں پڑی ہو۔ سنو۔ اسلام نے عورت
کو مرد کا لباس بتایا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ۔ لباس میں ایک دوسرے

پنگھٹ

کی پسندیدگی کو والدین کیا کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اس کے علاوہ کھانے پینے اور تمام چیزوں میں ہر شخص کی پسند اور رغبت جدا ہوتی ہے۔ باپ کو ایک طرح کی چیز پسند ہے۔ تو بیٹے کو دوسری طرح کی، اور بھائی کو تیسری طرح کی۔

قیصر جہاں بیگم۔ مگر ماں باپ اور بھائی سب اپنی اولاد کے لئے ہرگز بے جوڑ اور ناموزوں لباس پسند نہیں کرتے۔ اُن کی سب سے بڑی خوشی یہی ہوتی ہے کہ اچھی سے چیز اپنی اولاد کے لئے انتخاب کریں۔ اور اولاد اُن کے ساتھ عمر گزارتی ہے۔ وہ اس کے مزاج کو سمجھتے ہیں۔ اگر اولاد اس انتخاب کو ناموزوں کہے۔ تو غلط فہمی اور خودسری ہے۔

کشور زمانی بیگم۔ انتخاب اگر ناموزوں ہو تو کیوں نہ کہا جائے۔ اسی لئے کسی مذہب میں اندھی شادی کا حکم نہیں۔ اسلام نے صاف طور پر اجازت دی ہے۔ کہ اولاد کو اُن کے رشتہ کی اطلاع ہو جائے۔

قیصر جہاں بیگم۔ اطلاع کی اور بات ہے۔ وہ ہو جاتی ہے۔ مگر یہ پسند اور مرضی کا سوال۔

کشور زمانی بیگم۔ پسند جناب۔ اپنی مرضی اور پسند کا حکم خود مذہب نے دیا ہے۔ ہمارے ملک میں ہندو بھائیوں میں سوئمبر کی رسم کیا تھی۔ لڑکیاں اپنی مرضی اور پسند سے بر کا انتخاب کرتی تھیں۔ اور اس کے گلے میں مالا ڈالتی تھیں۔

قیصر جہاں بیگم۔ یہ راجہ مہاراجوں کی باتیں تھیں۔ عوام میں اُس وقت بھی ایسا نہ ہوتا تھا۔ اور ماں باپ کی مرضی سے رشتے ہوا کرتے تھے۔ سوئمبر کی رسم میں بھی بڑی حد تک ماں باپ ہی کا اختیار ہوتا تھا۔ اب یہ مغرب کی تقلید۔

کشور زمانی بیگم۔ توبہ۔ یہ تم مغرب مغرب کیوں رٹے جاتی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری موجودہ شادیوں کا طریقہ فریقین کی منشا کے خلاف۔ قدیم طرز تمدن کے خلاف اور انسانی فطرت کے خلاف۔ اور سچ پوچھو۔ تو مذہب کے خلاف ہے۔ بے جوڑ اور حالات سے ناواقف ہوتے ہوئے عمر گذارنے کے لئے رشتہ قائم کرنا کون سی عقلمندی ہے۔

قیصر جہاں بیگم۔ یہ حقیقت ہے آپا نئی روشنی کی تیزی نے جن لوگوں کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دی ہے۔ وہاں میاں بیوی مذہبی فرض آپس کی رواداری اور تعلقات کی خوشگواری کا خیال نہیں کرتے اور اسی لئے یہ سارے جھگڑے ہیں۔ عقل۔ مذہب اور تمام ضروریات زندگی کا تقاضا صاف ہے۔ کہ جو کام بھی کیا جائے۔ مرد اور عورت اپنے اپنے ادب و تہذیب کے دائرہ میں رہیں۔ ورنہ جھگڑے فساد۔

کشور زمانی بیگم۔ کیا یہ جھگڑے غلط انتخاب کے سبب نہیں۔

قیصر جہاں بیگم۔ ہم یہ کیسے مان سکتے ہیں۔ اگر انتخاب کی غلطی کے سبب سے ایسا ہوتا۔ تو مغربی ملکوں کی شادیاں سو فیصدی کامیاب اور خوشگوار ہوا کرتیں۔ وہاں لڑکے لڑکی کے آزادانہ میل جول کورٹ شپ اور ذاتی پسند و انتخاب کے باوجود روزمرہ سینکڑوں جھگڑے اور طلاقیں ہوتی ہیں۔

کشور زمانی بیگم۔ وہ جھگڑے وہاں کے لوگوں کی بے جا آزادی کے ہیں۔ میں اپنے ملک میں اس آزادی اور غیر معاشرت کے رواج کو نہیں کہتی۔ یورپ کے حالات تم نے سُنے ہیں۔ اور میں نے خود آنکھوں سے دیکھے ہیں۔

قیصر جہاں بیگم۔ ہاں آپ کئی بار یورپ جا چکی ہیں۔ آپ ہی فرمایئے۔ کیا وہ لوگ خود اپنی اس بے جا آزادی سے تنگ نہیں آ گئے ہیں۔ اور شادی کی آزادی کے باوجود پچھتر فیصدی شادیاں ناخوشگوار نہیں ہو رہی ہیں۔ اور روز کتنے طلاق نامے۔

کشور زمانی بیگم۔ ہاں ہاں میں سب کچھ جانتی ہوں۔ مانتی ہوں۔ کہ ان کی بہت سی باتیں بے جا آزادی کے سبب مُضر ہیں۔ میں کب کہتی ہوں کہ ہم اُن کی تقلید کریں۔ مگر اپنی خرابی کا علاج کا تو ہمیں کرنا لازم ہے۔

قیصر جہاں بیگم۔ علاج کا مطلب یہ تو نہیں۔ کہ جس سر میں درد ہے۔ اُس سر کو ہی قلم کر دیا جائے۔

کشور زمانی بیگم۔ مگر یہ مطلب بھی نہیں ہو سکتا۔ کہ جھوٹی شرم اور بے جا قید کے خیال سے معالج سے دردسر کا حال نہ کہا جائے۔ اور اُس کے علاج کی فکر نہ کی جائے۔ چاہے درد کی شدت سے دماغ پھٹ جائے۔ اسی طرح گھر برباد ہو جائیں۔ مگر اولاد کی مرضی کے موافق شادی کی اجازت نہ ملے گی۔ یہی مطلب۔

قیصر جہاں بیگم۔ آپا دیکھئے۔ شادی کے بعد کی زندگی اولاد کی آزادی اور خودمختاری

کی ہوتی ہے۔ دونوں میاں بیوی شادی کے بعد جس طرح چاہیں۔ اپنی زندگی کو خوشگوار بنائیں۔ ایک دوسرے کو چاہتے۔ کہ آپس میں رواداری اور مساوات کے ساتھ یگانگت کا برتاؤ کرے۔

کشور زمانی بیگم۔ اور اگر دونوں کی طبیعتوں میں فرق ہے۔ اور مزاج کی ناموافقت طرز معاشرت اور رہنے سہنے کے طریقوں میں اختلاف ہو۔ پھر رواداری اور یگانگت کیا بنا ئے گی۔ اور شادی کے بعد تعلقات کس طرح خوشگوار ہو سکیں گے۔

قیصر جہاں بیگم۔ یہ سب حالات والدین پہلے ہی معلوم کر سکتے ہیں۔ ایسا بے جوڑ رشتہ ہی کیوں ہو۔ کیا نوعمر اور ناتجربہ کار اولاد بزرگوں سے زیادہ زمانے کی حالت کو سمجھ سکتی ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا۔ کہ بزرگوں کی سرپرستی کا بندھن توڑ کر بے حجابی اختیار کر لی جائے۔

کشور زمانی بیگم۔ نہیں قیصر۔ میں یہ کب کہتی ہوں۔ مگر آج کل بزرگ شادی بیاہ کے معاملہ میں جو خالص اپنی مرضی اور پسند سے فیصلہ کرتے ہیں۔ یہ غلط ہے لڑکی کو تو قطعی بے زبان سمجھتے ہیں۔ اور لڑکے کی رائے بھی صفائی سے معلوم نہیں کی جاتی۔ کہ جنہیں عمر بھر نباہ کرنا ہے۔ ان کے مزاج عادات اور تعلیمی حالات ایسے تو نہیں جس سے اختلاف کا ڈر ہو۔

قیصر جہاں بیگم۔ والدین کیا نہیں دیکھ لیتے۔ سچ پوچھئے تو اولاد کو در پردہ پہلے ہی رشتہ کی بھی خبر ہو جاتی ہے۔ اور انتخاب میں والدین کا تجربہ اور مرضی ہر طرح اولاد کی رائے پر فائق ہوتی چاہئے۔

کشور زمانی بیگم۔ اولاد کو در پردہ خبر ہو جاتی ہے۔ مگر کیا انہیں بولنے کا حق اور رائے دینے کا بھی اختیار ہوتا ہے۔

قیصر جہاں بیگم۔ آیا ہماری معاشرت کے شرم و حجاب اس کی اجازت ہرگز نہیں دیتے کہ کھلم کھلا۔ لڑکے لڑکی سے ان کی شادی کی بات چیت کی جائے۔ اور جب سرپرست والدین ہوں تو اولاد کا خود مختار ہونا کیا معنی۔

کشور زمانی بیگم۔ اچھا اگر اُن سے پوچھ لیا جائے تو کیا حرج ہے۔ خصوصاً بڑا ظلم رشتہ کے وقت لڑکی پر ہوتا ہے۔ کہ اُسے بے زبان جانور بنا کر باندھا جاتا ہے۔

قیصر جہاں بیگم۔ بے زبان جانور نہیں۔ مہذب انسان کے لئے۔ عورت کا پردہ صرف صورت شکل کا نہیں بلکہ خیال کا بھی ہوتا ہے۔ اس صورت میں ہم کیسے یہ بے شرمی اور بے پردگی گوارا کرینگے کہ صاف صاف شادی کا انتخاب لڑکی کے سپرد ہو جائے۔ اور انتخاب میں اولاد کو اختیار کیوں کر دیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ملک کا پردہ اور لحاظ۔

کشور زمانی بیگم۔ پردہ کا یہاں کیا ذکر والدین چاہیں تو بہت آسان ہے۔ سنو والدین یا سرپرست جب انتخاب کرتے ہیں اسوقت پورا فیصلہ نہ کریں۔ اور پہلے لڑکے کے والدین لڑکی کے والدین سے بے تکلف میل جول بڑھائیں۔

قیصر جہاں بیگم۔ یہ تو اب بھی رواج ہے۔ کہ انتخاب کے بعد سمدھیانوں میں آنا جانا۔ اور میل جول رہتا ہے انتخاب کے فوراً بعد شادی نہیں ہو جاتی۔

کشور زمانی بیگم۔ اس میں بہت کچھ تکلیف کی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

قیصر جہاں بیگم۔ پھر وہ بے تکلفی کیا ہو۔

کشور زمانی بیگم۔ یہ کہ والدین آپس میں رشتہ داری اور سچی دوستی کے تعلقات قائم کریں۔ اور اس درمیان میں لڑکے کے والدین لڑکی کے گھرانے کے طور طریق۔ وہاں کے لوگوں کے مزاج اور رہنے سہنے کے طریقوں سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔ اسی طرح لڑکی کے والدین لڑکے کے گھرانے سے۔

قیصر جہاں بیگم۔ موجودہ رواج اس کے خلاف کب ہے۔ عام طور پر یہی ہوتا ہے سب رشتے اسی طرح ہوتے ہیں۔

کشور زمانی بیگم۔ نہیں میری بات پوری سن لو۔

قیصر جہاں بیگم۔ اچھا فرمائیے۔

کشور زمانی بیگم۔ والدین اس میل کے دوران میں اپنے طور پر لڑکے لڑکی کے مزاج تعلیم و تربیت کی جو حالت دیکھیں۔ اور اپنی اولاد کے مزاج کی موافقت کا جو اندازہ کریں۔ وہ حال لڑکی لڑکے کو بتا کر ان کی مرضی معلوم کر لیں۔

قیصر جہاں بیگم۔ اس کے لئے ہمارے بزرگ تیار نہ ہوں گے۔ ہماری تہذیب اور شرم و لحاظ اس کو گوارا نہ کرینگے۔ آپ ہماری معاشرت اور

بزرگوں کے احساس کا اندازہ فرمائیے جوان لڑکی سے اس کی شادی کی بات چیت ہم کس طرح کر سکتے ہیں۔

کشور زمانی بیگم - اچھا صاف صاف کہئے اگر شرم ولحاظ کا خیال ہے۔ تو گھروں میں اس طرح ذکر کر سکتے ہیں کہ ان کے کانوں میں پہنچ جائے یا لڑکی کی سہیلیوں یا لڑکے کے دوستوں کے ذریعہ سب کچھ کہلوا دیں۔ اور ان کی رائے اور مرضی کا حال ان ہی کی معرفت معلوم کر لیں۔

قیصر جہاں بیگم - میں پہلے کہہ چکی ہوں کہ درپردہ اطلاع ہو جاتی ہے مگر اس رائے اور پسند کے سوال میں اولاد کی خودسری اور بے حجابی اس حد تک بڑھ جانے کا ڈر ہے۔ کہ ہماری معاشرت میں بہت سی اور خرابیاں ایسی پیدا ہو جائیں گی جنہیں ہم درست نہ کر سکیں گے۔ اور ایک اصلاح کے خیال میں اپنا شعار اور تہذیب و وقار بہت کچھ کھو دیں گے۔

کشور زمانی بیگم - ہرگز نہیں۔ اگر ہمارے قدیم خیال کے بزرگوں اور نئی پود کے درمیان ایک مناسب سمجھوتا ایسا ہو جائے۔ تو زندگی کے حقیقی میل ملاپ کا یہ رشتہ صحیح معنوں میں کامیاب بن سکے اور شادی خانہ بربادی نہ بنے اولاد کو ان کی مرضی کا اختیار دینا بہت ضروری ہے۔

قیصر جہاں بیگم - دیکھئے اس عمر میں لڑکا لڑکی ایک کچی لکڑی کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کی عقل انہیں بہت کم اونچ نیچ سمجھنے دے گی۔ اور اندیشہ ہے کہ کہیں آزاد ہو کر خرابی کی طرف نہ دوڑ پڑیں اس لئے ہمارے بزرگوں نے سوچ سمجھ کر یہ طریقہ اختیار کیا ہے اس کی مخالفت خطرہ سے خالی نہیں۔

کشور زمانی بیگم - یہ خوف اور وہم ہی ہمیں اصلاح معاشرت سے روکتا ہے۔ حاکمانہ مرضی ہی سے اولاد کی خودسری اور بے حجابی کا ڈر ہو سکتا ہے۔ مگر ان کی مرضی کی اجازت دینے سے کوئی خرابی نہیں ہو سکتی آخر جب وہ اپنی پسند سے رشتہ کریں گے۔ تو اس کے نباہ کے خود ذمہ دار ہوں گے۔

قیصر جہاں بیگم - آیا اس آزادانہ پسندیدگی کا خیال ہمارے ملکی رواج ہی کو نہیں مٹا دے گا۔ بلکہ ہماری معاشرت اور تہذیب کو بھی اس سے سخت نقصان پہنچے گا۔ اور نوجوان دماغوں میں بے جا آزادی کا زہر پھیل کر ان کو غلط راستہ پر لے جائیگا پسند اور رائے سے سو کی جگہ دو رشتے بھی مشکل سے طے پائیں گے۔ اور پیچیدگیاں اور بھی جائیں گی۔

کشور زمانی بیگم - ہماری معاشرت کا یہ مسئلہ صرف فضول باتوں نے اس قدر پیچیدہ بنا دیا ہے۔ کہ اس کا سلجھانا ظاہر میں دشوار نظر آتا ہے۔ ورنہ اس کا طے ہونا کچھ دشوار نہیں۔ سب سے آسان سمجھوتہ اور حل اس طرح ہو سکتا ہے کہ ماں باپ اپنی اولاد کے خیالات اپنے طور پر پڑھنے کی کوشش کریں۔ اور اپنے مطالعہ کے اس نتیجے سے وقتاً فوقتاً شادی سے پہلے دار رہیں کہ ان کے دوستوں اور سہیلیوں کی معرفت واقف کرا دیں اور اس طرح رائے اور مرضی معلوم کر لیں۔ اس کو نہ کوئی مذہب منع کرتا ہے۔ اور نہ عقل۔

قیصر جہاں بیگم - یہ مسئلہ میں پھر یہی کہوں گی۔ کہ مغربی آزادی کے خیال سے پیچیدہ بنا ہوا ہے۔ ورنہ اگر ہمارے ملک کے میاں بیوی اپنے اپنے مذہبی شعار اور مشرقی تہذیب کے دائرہ میں اپنے فرائض سمجھ کر رواداری اور میل ملاپ سے رہیں۔ تو دنیا میں جنت بنانا ان کے اپنے ہاتھ ہے۔

سمدھیانہ کی گفتگو اور رشتہ کی بات چیت سے اگر شادی سے پہلے اولاد واقف ہو جاتی ہے۔ سوال صرف رواداری کا ہے۔ اور مذہب اور عقل سب نے میاں بیوی کو بار بار اسی کی ہدایت کی ہے۔ اور یہی خوشگوار تعلقات کی رہبر ہے ۰

چشمۂ شاہی کشمیر کا ایک نظارہ

(از جناب ملک غلام عباس خاں صاحب بی۔اے (علیگ)

چمن میں پھرتے ہیں بیباکیاں دکھائے ہوئے
حسین غنچوں کی مانند مسکرائے ہوئے

حسین لبوں پہ تبسم کی دل رُبا موجیں
کہ غنچے جوشِ مسرت سے کھلکھلائے ہوئے

بسہ نقابوں میں شاداب و دلرُبا چہرے
ستارے کالی گھٹاؤں میں جگمگائے ہوئے

خرامِ ناز پہ صدگونہ مہ‌ وشوں کا ہجوم
فضا ہے میکدۂ حُسن کو اُٹھائے ہوئے

قدم قدم پہ وہ کرتے ہیں حشر سامانی ۔
نقاب چہرۂ پُرنور سے اُٹھائے ہوئے

نگار خانۂ فطرت ہے چشمۂ شاہی
مصوّروں نے ہیں ڈیرے جہاں جمائے ہوئے

نسیم جب سے چھُٹا ہے وہ خطۂ فردوس
ملال و حُزن کی دُنیا ہے دِل اُٹھائے ہوئے

"گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں انھیں کی یاد میری زندگی ھے"

میری اور دوسروں کی نظر میں

ایک بلند پایہ تنقیدی مضمون

از جناب عطاء اللہ صاحب پالوی

چند دن ہوئے کہ اُردو زبان کے مشہور رسالہ عالمگیر" (لاہور) کے حسین وجمیل جون نمبر ۱۹۳۶ء (جو اشاعت خاص" کے نام سے شائع ہوا ہے اور جس کی ایک کاپی جناب مدیر کی بے پایاں نوازشوں کی بدولت مجھ تک بھی پہنچی ہے) کی ورق گردانی کے سلسلے میں جناب شمس العلما مولانا محمد امین صاحب عباسی چڑیا کوٹی مولوی فاضل، پروفیسر عربی، اسلامیہ کالج، ڈھاکہ" کا ایک (نامکمل) تنقیدی مضمون "ہندی اور عربی کے ہم معنی[1] اشعار" کے عنوان سے میری نظر سے گزرا۔ پروفیسر صاحب موصوف نے اپنے اس گرانقدر مضمون میں دو بڑی اور میٹھی زبانوں کے ہم معنی اشعار پیش کرنے کا تذکرہ کرتے ہوئے بطور تمہید" ہندی شعرا کے نقطۂ نظر سے حقیقت شعر اور شاعری سے بحث" اور" عربی علماء بلاغت کی ادا کا ضمنی طریقہ" سے ذکر فرمانے کا وعدہ کیا ہے مگر مضمون کے ابتدائی صفحات میں فاضل پروفیسر نے (خلاف وعدہ) عربی، انگریزی، یونانی اور فرانسیسی شعرا اور ادبا کے بھی منثور افکار اس عنوان پر پیش کئے ہیں کہ "شعر کیا ہے؟"

اس میں شبہہ نہیں کہ لائق پروفیسر نے "شعر کیا ہے" کے عنوان پر مشاہیر کے اکثر اقوال فراہم کئے ہیں اور اُن کی یہ سعی قابل

[1] اس مضمون کی جو سرخی قائم کی گئی ہے وہ کہتی ہے کہ اس میں عربی اور ہندی کے ہم معنی اشعار پیش کئے گئے ہیں۔ لیکن مولانا موصوف نے یہ لکھنے کے باوجود کہ

"کسی نثر نظم کا اگر ترجمہ کیا جائے اور پڑھنے والا اصل نظم سے واقف ہو
تو اسکو ترجمہ سے جو لذت اور مسرت ہو گی۔ وہ مسرت اس شخص کو حاصل
نہیں ہو سکتی جو اصل سے واقف نہیں"

ہندی کے اشعار پیش کئے ہیں نہ ہندی شعرا کے نام۔ صرف ترجمہ سے مضمون کی زینت فرمائی ہے۔ عطاءاللہ

تحسین ہے۔ نیز میرے مضمون کو "شعر کیا ہے" سے کوئی سروکار نہیں پھر بھی ضمنی طریقے پر میں یہ ضرور عرض کروں گا۔ کہ مضمون کی نوعیت کے لحاظ سے اس کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ نیز تقریباً ہر زبان اور ملک کے بڑے بڑے عقلا، فضلا اور شعرا نے اس عنوان پر اتنے نظریئے پیش کئے ہیں اور وہ باہم اکثر [illegible] اس قدر مختلف و متضاد واقع ہوئے ہیں کہ ان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ میرے خیال میں اس کا تعلق صرف اپنے اپنے احساسات و جذبات کا ہے اور ہر شخص کے احساسات و جذبات مختلف تھے، ہیں اور رہوں گے، لہذا یہ ضرور نہیں کہ ہر شخص کو اُن سے اتفاق ہی ہو۔ مگر ان سب باتوں کے علاوہ اس سلسلے میں مجھے جو خاص طور پر کہنا ہے۔ وہ یہ کہ آخر اس میں کیا خوبی یا کونسا اہم راز مضمر ہے۔ کہ ہم جب اس قسم کے اقوال پیش کریں تو دوسروں ہی کے! خصوصاً شعر و شاعری سے متعلق؛ کیا ہماری زبان میں اس عنوان پر بہترین اقوال موجود نہیں؟ آخر ہماری یہ غلامانہ ذہنیت ہمیں کب تک دوسروں کی محتاج اور دوسروں کی نظر میں ذلیل بنائے رکھے گی؟ لائق پروفیسر نے (جن کا اہم کام یہی تھا اور ہے کہ ہمارے سے کم علموں کے ذہن و دماغ میں بلندی و تڑپ پیدا کریں) حیرت ہے کہ اس چیز کو کیوں فراموش کر دیا۔ بہر حال! اس عنوان پر کہ "شعر کیا ہے" اُردو زبان میں یوں تو سیکڑوں مقالات موجود ہیں۔ لیکن میں عرض کروں گا کہ اس جگہ۔

خود زبانِ شعر سے آ، شعر کی تفسیر سُن

اُردو زبان کے علاوہ ساری زبانوں میں اس عنوان پر اچھے اچھے اقوال موجود ہیں۔ لیکن آئیے اپنی زبان کی عظمت و بلندی ملاحظہ فرمائیے۔ دورِ حاضر کا سب سے بڑا شاعر کہتا ہے:۔

شعر کیا؟ جذبِ دروں کا ایک نقشِ ناتمام" + "مشتبہ سا اک اشارہ ایک مبہم سا کلام" کیف میں اک لغزشِ پا کلکِ گوہر بار کی" + "اضطراری ایک جنبش سی لبِ گفتار کی" ایک صوتِ خستہ و موہوم سازِ ذوق کی" + "مرتعش سی ایک آواز انتہائے شوق کی" "بے حقیقت نے کے اندر زمزمہ داؤد کا" + "عارفِ محدود پر اک عکس لامحدود کا" شعر کیا؟ عقل و جنوں کی مشترک بزمِ جمال + شعر کیا ہے؟ عشق و حکمت کا مقامِ اتصال ظلمتِ ابہام میں پرچھائیں تفصیلات کی" + "پیچ و خم کھاتے بگولے میں جھلک ذرات کی" جوئے قدرت کی روانی دشت موضوعات میں + ٹوٹتا نگیں ست رو کا اندھیری راتیں شعر کیا؟ کچھ سوچنا دل میں بہ لحنِ دلنشیں "شعر کیا؟ ہر چیز کہکر کچھ نہ کہنے کا یقیں شعر کیا ہے؟ نیم بیداری میں ہنسا صبح کا + برگِ گل پر نیند میں شبنم کے گرنے کی صدا تر زبانی اور خاموشی کی مبہم گفتگو + لفظ و معنی میں توازن کی نہفتہ آرزو

بادلوں سے ماہِ نو کی اک اُٹھتی سی نفیس
جھلکنا قطرے کے روزن سے عروسِ بحر کا

(جوش ملیح آبادی)

یہ وہ "تشریحِ شعر" ہے جس پر ساری زبانوں کی ساری تفسیریں قربان کی جا سکتی ہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ "شعر" کی سی نازک اور لطیف شے کی فصیح و بلیغ تعریف میں ان سے زیادہ جامع اور صحیح و فصیح الفاظ استعمال کرنے کی کوشش نہ کسی زبان میں اب تک کامیاب ہوئی اور نہ اُردو میں اب آئندہ بار آور ہوگی۔ بھلا ایسی صورت میں آخر یہ کیا ظلم ہے کہ میدانِ شاعری میں بھی ہم انگریزی ستونوں کا سہارا لئے بغیر کھڑے ہی نہ ہوں!

فاضل پروفیسر نے تعریفِ شعر کے بعد تحریکِ جذباتِ شعری" کی بحث (جس میں قدرتِ بیان کا مفہوم بھی پنہاں ہے) کے سلسلے میں فرمایا ہے:۔

> شاعر جب کسی جذبہ کو اپنے حسنِ بیان سے حرکت میں لانا چاہتا ہے اور اس کے ہیجانات اس خوش اسلوبی سے ادا کرتا ہے کہ سننے والا یہی سمجھتا ہے کہ شاعر اس جذبہ سے متاثر ہے اور حقیقتاً یہ کیفیت اس میں موجود ہے اور اس ذریعے سے اس جذبہ کو سننے والے کے دل میں تحریک ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض ناقدین کلامِ غالب اور دیگر شعرائے اُردو "(داد دین ہمارے ہیں۔ ع) نے اس تحریکِ جذبات کے لئے جن کی شاعر بذریعہ الفاظ محاکات کرتا ہے اور اس کے

ملہ اس کہنے سے یہ خیال نہ فرمایا جائے کہ انگریزی ادب سے استفادہ کا میں مخالف ہوں۔ بیشک وہ مفید ہے لیکن اُس حد تک جس حد تک ضروری ہو ورنہ پھر محض تقلید ہی کہا جائیگا۔ عطاء اللہ

صورات مثلاً معشوق کے مظالم، معشوق کا تلوّن، عاشق کی شب بیداری، ہجر کی کلفتوں کی تصویر کھینچنا۔ اس کو وہ لوگ اپنی ناواقفیت یا تعجب سے حقیقت پر محمول کر کے معشوق کو بُری صورت میں پیش کرتے ہیں۔

ان سطور (جن کے متعلق مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اپنی عدم صلاحیت و نافہمی کی وجہ سے ذرا بھی نہیں سمجھا) کے بعد اپنے بیان کی تائید اور غالباً "عدم صداقتِ تحریکِ جذبۂ عشق" کے ثبوت میں قابل پروفیسر نے غالب[1] (اُردو شاعر) اور متنبّی (عربی شاعر۔ اگرچہ صرف شعرائے اُردو ہی کا حوالہ دیا گیا تھا) کا ایک شعر (جن کی بلاغت کا قابل پروفیسر کو خود اعتراف ہے) بدترین صورت میں پیش کرنے کے ساتھ اُردو زبان کے ایک نازک اور سَجل اندام شعر ؎

گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
اُنھیں کی یاد میری زندگی ہے

پر جو فاضل مقالہ نگار نے خاردار تنقید فرمائی ہے اُسے پڑھ کر حضرت جوش ملیح آبادی کے یہ چند شعر بے اختیار یاد آ گئے۔ ہائے اس کافر نے تنقیدِ شعر کے سلسلے میں کیا چبھتی ہوئی بات کہی ہے:-

نظم! اے نقادِ فن یہ کیا ستم کرتا ہے تو + کوئی نوکِ خار سے چھوتا ہے نبضِ رنگ و بُو!
شاعری اور منطقی بحثیں + یہ کیسا قتلِ عام + برشِ مقراض کا دیتا ہے زُلفوں کو پیام!
کیوں اُٹھاتا ہے جنسِ شاعر کے پرکھنے کیلئے + کیا شمیمِ سنبل و نسریں ہے چکھنے کے لئے!
اے ادب ناآشنا! یہ بھی نہیں تجھکو خیال + ننگ ہے بزمِ سخن میں مدرسے کی قیل و قال!
منطقی کانٹے پہ رکھتا ہے کلامِ دلپذیر + کاش اس نکتے کو سمجھے تیری طبعِ حرف گیر

سچ بتا اے عاشقِ دیرینۂ فکرِ معاش + زہر میں تریاق کے عنصر کی بھی کی ہے تلاش!
تو کبھی ہے نگارِ غم کے محل کے قریب + آنچ سی محسوس ہوتی ہے کبھی دل کے قریب!
طرزِ معنی پر بھی او نافہم چڑھ سکتا ہے تو + کیا مصنّف کی کتابِ دل بھی پڑھ سکتا ہے تو!
یہ نہیں تو پھیر لے آنکھیں یہ جلوا اور ہے
تیری دنیا اور ہے شاعر کی دُنیا اور ہے

حقیقت یہ ہے کہ "تنقیدِ شعر" بڑا ہی مشکل کام اور اس عنوان پر قلم اُٹھانا ایک بڑی ہی اہم ذمّہ داری اپنے سر لینا ہے کیونکہ "تنقید" سے قبل شعر کا مدار واقعی سمجھ لینا ضروری ہے۔ اور شعر فہمی کے لئے خصوصاً غزل کے اشعار کہ وہ دراصل دو محبّت کے مارے ہوئے عاشق و معشوق کی منظوم گفتگو کے اہم اجزا اور دُکھے ہوئے دلوں کی پرسوز صدا ہوتے ہیں، صحتِ ذوق اور وسعتِ نظر ہی نہیں بلکہ ایک محبّت آشنا دل کی بھی ضرورت ہے۔ بغیر اس کے کامیابی ممکن نہیں۔

بہرحال! متذکرہ شعر پر پروفیسر صاحب کی تنقید ملاحظہ ہو فرماتے ہیں:-

"ایک شاعر کہتا ہے کہ

گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
اُنھی کی یاد اپنی زندگی ہے!"

اس سے معلوم ہوا کہ شاعر یہ دکھانا چاہتا ہے کہ اس کو اپنی عمر بھر میں صرف ایک دن ایسا نصیب

---

[1] غالب کا زیرِ بحث شعر یہ ہے:- "آج وہاں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں ٭ عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا"۔
اس شعر پر شارحین دیوانِ غالب یا ناقدین کلامِ غالب نے جو کچھ بارشِ تحسین و آفرین یا اظہارِ ناپسندیدگی و نفرین کیا ہے اس سے مجھے بحث نہیں لیکن مولانا کی پیش کردہ شرح تقریباً لفظ بلفظ صدائے بازگشت ہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایک دوسرے قابل پروفیسر جناب عندلیب شادانی ایم۔ اے کی اس شرح کی جو انہوں نے اپنے ایک تنقیدی مضمون مطبوعہ "ساقی" میں شائع کرائی ہے اور جس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ظاہراً تو وہ شرح یقینی درست ہے لیکن حقیقتاً ہرگز نہیں شعر اپنے اصلی اور صحیح معنی میں جذبۂ بیخودی کی اچھی تصویر ہے۔ شاعر کی تمنائے سرفروشی انتہائی کمال کو پہنچ گئی ہے۔ دوسرے کفن باندھ کر یعنی قتل ہو جانے کا مصمم ارادہ کر کے مع تیغ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ معشوق کے ہاتھ سے قتل ہو جانے کی تمنا لیکر سب لوگ گئے اور واپس چلے آئے۔ اب آج ہم (لفظ "میں" پر زور دے کر پڑھیے) بھی تمنا لیکر جاتے ہیں اور اس سرفروشانہ شان سے جاتے ہیں کہ تلوار ساتھ ہی رکھ لیتے ہیں۔ اب دیکھیں تو کہ وہ میرے ("میرے" پر زور دیجئے) قتل کرنے میں کیا عذر کرتے ہیں؟ عطاء اللہ

ہوتا تھا۔ کہ اس دن وہ خوش ہوتا۔ لیکن وہ کونسی خواہش تھی جس کے حصول سے اس کو تھوڑی دیر کے لئے مسرت حاصل ہوئی۔ اس کو وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ ممکن ہے کہ (الکنایۃ ابلغ التصریح) پر عمل کیا گیا ہو۔ اس لئے کہ نفسی خوشی تو کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ کسی مرلذ یذ سے خوشی حاصل ہوگی یا کسی مدعاء کے حصول سے خوشی ہوگی۔ کیا صورت یہی ہو یعنی یہ ٹھیرے کہ اس خوشی کی چند گھڑیاں کو یاد کر کے ہم زندگی بسر کر رہے ہیں اور اب اسی کی یاد کھانا، پینا، سونا، جاگنا تمام ضروریات زندگی کی قائم مقام ہے تو ظاہر ہے کہ ایسی چیز کس قدر بلائے مبرم ہوگی جس کی وجہ سے تمام زندگی بیکار ہو جائے اس سے یہی معلوم ہوا کہ ویسی خوشی زندگی میں پھر کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ اب صرف اس کی یاد باقی ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس یاد سے اگر مسرت ہوتی ہے تو جب خوشی کی وہ گھڑیاں یاد آتے ہی خوشی ہوتی ہے تو پہلے مصرعہ کا حصول باطل ہوتا ہے اور اگر اس سے مسرت نہیں ہوتی تو اس کی یاد بیکار ہے اور وہ مایۂ حیات نہیں ہو سکتی[1]"

جہاں تک مجھے علم ہے یہ شعر ۱۹۳۰ء سے "ادبی دنیا" میں جلوہ ریز ہے۔ سب سے پہلے اسے پروفیسر وجاہت حسین عندلیب شادانی ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) نے ایک افسانہ کے تحت پیش کیا تھا۔ اس کے بعد چھ یا سات چوٹی کے ادیبوں اور اردو زبان کے نامور فسانہ نگاروں نے اس شعر کو عنوان قرار دے کر اس پر بہترین رومانی افسانے لکھے اور یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ وہ افسانے خاص طور سے مقبول ہوئے۔ پھر ستمبر ۱۹۳۲ء میں "سچی کہانی" والے سحر نگار افسانہ نویس "پریم پجاری" نے اپنی ایک غزل بعنوان "زندگی" میں اس شعر کو بھی پیش کیا۔ اور اسی نمبر میں "ریزۂ مینا" کے تحت جو اُن کا خط شائع ہوا اُس سے معلوم ہوا کہ درحقیقت یہ شعر اُسی گمنام شاعر و افسانہ نویس کا ہے۔ غرض اُس وقت سے اس وقت تک یہ شعر اس قدر ہر دلعزیز اور عالمگیر شہرت کا مالک بن چکا ہے۔ کہ شاید ہی کوئی پڑھا لکھا اس کی جاذبیت سے بے خبر اور اُس کے حسن سے بے پرواہ ہو۔ نیز جہاں تک میرا علم محدود ہے میں عرض کروں گا کہ یہ شعر اُردو زبان میں اپنے رنگ کا ایک اور اب تک[2] صرف ایک ہے۔ اور حضرت جگر مرادآبادی کے علاوہ (مگر اب پروفیسر جناب محمد امین صاحب بھی اسی صف کے ایک فرد ہیں) مجھے کوئی ایسا صاحب ذوق نہیں ملا جس نے اس شعر کو والہانہ انداز سے نہ پڑھا یا مصنف کی خوش ذوقی اور حقیقت نگاری کی ثنا خوانی نہ کی ہو۔ بقول حافظ

ہر کجا بشنیدہ اند از لطف تحسیں کردہ اند

بہرکیف اب آیئے اس شعر کی باریکی اور لائق پروفیسر کی تنقید کا تجزیہ کیا جائے۔ صاحب موصوف فرماتے ہیں:۔

"شاعر یہ دکھانا چاہتا ہے کہ اُس کو اپنی عمر بھر میں صرف ایک دن ایسا نصیب ہوا۔ کہ اُس میں وہ خوش ہوا"

ہرگز نہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ خوشی کی صرف چند گھڑیاں آئے

---

[1] اگرچہ شعر پر سب کچھ لکھ دیا گیا ہے۔ پھر بھی آخری جملہ یہ ہے:۔ "آئندہ کسی موقع پر اس کے متعلق مفصل لکھا جائیگا" معلوم نہیں آئندہ اور کیا قیامت ڈھائی جائیگی۔ عطاء اللہ

[2] "اب تک" کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا ہے کہ اب اس طرف بابو گوپی شیام سکسینہ متخلص بہ مضطر رامپوری نے "ابن قل ہو اللہ" کا جواب لکھنے کی کوشش کی ہے ایک منظوم رومانی افسانہ کے تحت فرماتے ہیں:۔

یاد اُن کی بہت ہے تمہیں تڑپانے کو مضطر
ایام تھے کچھ عیش کی گھڑیوں میں گزارے

مگر باوجود اس کے کہ مضطر صاحب نے اسی ٹکر کا شعر (بدانست خود) کہا ہے لیکن افسوس ہے کہ شعر ہنوز اُس اختصاری جامعیت اور کہربائی حسن سے معرا ہے جو اول الذکر کی امتیازی خصوصیت ہے۔ عطاء اللہ

نصیب ہوئیں۔ جیسا کہ فاضل پروفیسر نے آگے خود فرمایا ہے کہ "تھوڑی دیر کے لئے مسرت حاصل ہوئی" اور شاعر کا یہ کہنا اس لحاظ سے بھی فطرتاً بالکل درست ہے کہ ہر شخص جب وہ اپنی تمام گزشتہ عمر کا جائزہ لے گا تو محسوس کرے گا کہ ساری زندگی میں انتہائی مسرت کے صرف چند ہی لمحے اُسے میسّر ہوئے تھے اب چاہے وہ مسرت کسی نوع کی ہو یا نوعۂ مسرت کوئی بھی ہو۔ پھر مقامِ حیرت کیا ہے؟ اس کے بعد لائق پروفیسر فرماتے ہیں:۔

"وہ کونسی خواہش تھی جس کے حصول سے اس کو تھوڑی دیر کے لئے مسرت حاصل ہوئی۔ اس کو وہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ ممکن ہے کہ (الکنایۃ ابلغ من التصریح) پر عمل کیا گیا ہو۔ اس لئے کہ نفسی خوشی تو کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ کسی امر لذیذ سے خوشی حاصل ہوگی۔ یا کسی مدعا کے حصول سے خوشی ہوگی۔"

متذکرہ شعر غزل کا ایک شعر ہے اور بقول علامہ نیاز "غزل نام ہے اس گفتگو کا جو ایک گوشت پوست والے عاشق اور ایک گوشت پوست والے معشوق کے درمیان ہوتی ہے" پھر اس کا مفہوم سمجھنے کے لئے مقالہ نگار کو کیا دقت ہوئی۔ یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ نیز میں یہ بھی نہ سمجھ سکا کہ نفسی خوشی کیوں کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ بہرکیف مقالہ نگار صاحب اگر غور فرماتے تو یہ دیکھ اور سمجھ لیتے کہ اس شعر میں سب کچھ موجود ہے۔ اور اس میں نہ کوئی کنایہ ہے نہ کوئی ناقابل فہم نکتہ۔ شاعر صاف صاف کہہ رہا ہے کہ یہ خوشی معشوق کے وصال کی خوشی تھی اور ہے۔ غزل کا آخری شعر ہے

"محبت دونوں جانب سے محبت
نہ پوچھو، آہ، کیسی زندگی ہے"

آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

"معنی یہ ٹھیرے کہ اس خوشی کی چند گھڑیاں کو یاد کر کے ہم زندگی بسر کر رہے ہیں اور اب اسی کی یاد کھانا، پینا، سونا، جاگنا تمام ضروریاتِ زندگی کی قائم مقام ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ایسی چیز کیوں نہ در بلائے مبرم ہوگی۔ جس کی وجہ سے تمام زندگی بیکار ہو جائے۔"

لائق پروفیسر نے اس جگہ محبت ناآشنایانہ انداز سے ایسی بچگانہ بات کہی ہے کہ اُن کی اعلیٰ علمی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے مجھے حیرت ہوتی ہے۔ پھر اس سے بھی زیادہ بلیغ تشریح یہ ملاحظہ ہو:۔

"اس یاد سے اگر خوشی ہوتی ہے تو پہلے مصرع کا حصر باطل ہوتا ہے اور اگر اس سے مسرت نہیں ہوتی۔ تو اس کی یاد بیکار ہے۔ اور مایۂ حیات نہیں ہو سکتی۔"

پروفیسر صاحب! یہ شعر ہے شعر اور ایسا شعر جسے ایک دُکھے ہوئے دل کی پُرسوز آواز کہہ سکتے ہیں پھر آپ اسے منطقی دلائل سے کیوں پرکھتے ہیں۔ آیئے میں اپنی بساط بھر کوشش کرتا ہوں کہ اس شعر کو سمجھا دوں۔

سب سے پہلے ضرورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ "عاشق" کی صحیح تشریح اپنے الفاظ میں کر دوں اور یہ بتا دوں کہ چاہے دُنیا نے جو کچھ تعریف کی ہو لیکن میرے نزدیک اس کی صحیح تعریف کیا ہے؟ میرے نزدیک صحیح معنی میں عاشق اس پیکرِ انسانی (مرد ہو یا عورت) کو کہتے ہیں جو اپنی تمام و کمال نفسانی خواہشات سمیت ایک ایسے فردِ جنسِ مخالف[1] کے ساتھ والہانہ محبت رکھے جس کا دائمی حصول قطعاً ناممکن ہو۔

---

[1] فی زمانہ ایک عورت اور مرد کے درمیان والی محبت (خصوصاً افسانوں میں) ایک ایسی متعاصفت شے تسلیم کی جاتی ہے جس میں نفسانی خواہشات کا ذرّہ برابر بھی دخل نہ ہو۔ میں اسے ہرگز نہیں مانتا۔ کیونکہ ایسا نہیں ہوتا اور نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح آجکل عاشق و معشوق کا درجہ ان دونو مُسند جوڑوں کو بھی دیا جاتا ہے۔ جو عمارتِ عشق و محبت کے کسی زینے پر پہنچ کر رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ میں اسکو قطعی غلط سمجھتا ہوں۔ کیونکہ میاں بیوی کبھی عاشق و معشوق نہیں ہوتے اور نہیں ہو سکتے۔ عطاء اللہ

اب یہ غور فرمائیے کہ جب ایک عاشق (جو بیک وقت شاعر بھی ہے) ایک ایسی ہستی سے عشق و محبت رکھتا ہے جس کا حصول ناممکن ہے۔ تو یہ یقینی ہے کہ اس کی ساری زندگی کلفت و مصیبت اور غمگینی و ناامیدی میں بسر ہوگی اور یہ ضروری ہے کہ اس کے دل میں ہمیشہ ایک خاص طرح کی خلش، تڑپ اور کسک محسوس ہوا کرے گی۔ بقول "پریم پجاری"[1] ؎

خلش ہو، درد ہو، کاہش ہو، کچھ ہو
فقط "جینا" بھی کوئی زندگی ہے؟

نیز ایسی صورت میں ایک عاشق شاعر کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی زبان و قلم سے جو آواز بھی نکلے گی وہ درد و اثر کا ایک مستقل اور مجسم اور حسرت و یاس کا ایک لاجواب مرقع ہوگی۔ جناب تبسم نے بالکل درست فرمایا ہے کہ:۔

"اگر سازِ حیاتِ انسانی کو مضرابِ غمِ عشق سے چھیڑ دیا جائے تو لاکھوں مغموم نغمے مستیاں برساتے ہوئے فضائے عالم پر بکھر جاتے اور اپنے تاثرات سے ارض و سما کو مسخر کر لیتے ہیں کیونکہ ان نغمات کی گرمی اور شعلۂ عشق کے التہاب سے جو دل خاکستر ہو جاتے ہیں۔ ان کی داستانیں بے حد دلکش اور دلنواز ہوتی ہیں"

چنانچہ دیکھ لیجئے کہ تمام وہ شعرا جو واقعی ایک عاشق کی حیثیت بھی رکھتے تھے (یہاں اُن شعرا کا قطعاً ذکر نہیں جو استادوں کے حکم سے زبردستی عاشق ہوا کرتے یا صرف عاشقانہ اشعار لکھ کر خود کو عاشق ثابت کرنے کی سعی لا حاصل کوشش کرتے تھے یا ہیں)، تمام عمر ملول و محزون اور ساری زندگی مایوس و پراگندہ خاطر رہا کئے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں درد و اثر کا ایک دریا موجیں مارتا پھرتا ہے۔ زیر بحث شعر کا مصنف بھی اسی صف کا ایک نمایاں فرد معلوم ہوتا ہے اور اس کا کلام بھی اس کی مفصل روئدادِ عشق نظر آتا ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو۔ بقول ظفر

ظفر شعر و سخن سے رازِ دل کیونکر نہ ہو ظاہر

کہ یہ مضمون سارے دل کی گہرائی سے نکلتے ہیں

سنئے! شاعر، عاشق مزاج شاعر، پہلو میں ایک محبت اور درد آشنا دل رکھنے والا شاعر گزر رہا تھا کہ اس کے ہوش و حواس پر ایک حسین ساحرہ، ایک پردہ دُنیا کی دوشیزۂ حور نے اپنے دیدار کی آتش فشاں بجلی گرا دی۔ شاعر اس بجلی کے اثر سے بدحواس ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو اُسے محسوس ہوا کہ وہ بجلی اُس کا دل چھید کر گزر گئی ہے اور دل کے اندر خون کی وہ بوند جو پہلے خاموش تھی۔ اس بجلی کے اثر سے سیمابی اثرات کی حامل ہو چکی ہے۔ وہ تڑپنے لگا اور اُس کی تلاش شروع کر دی۔ ایک زمانے تک خاک چھانتا رہا۔ آخر ایک مقام پر وہ بجلی کوندتی ہوئی یا بالفاظ دیگر اُس کی متلاشی نظر آئی۔ عاشق تھا دیکھتے ہی ایک والہانہ انداز سے دوڑا۔ بجلی فطرتی نسوانی وقار کو قائم رکھنے کے لئے ایک جلوہ ریز اور عطر بیز کمرے میں یا پردہ کے اندر روپوش ہو گئی۔ عاشق بھی بلا پس و پیش ایک بیتابانہ انداز سے وہیں چلا گیا۔ وہاں کیا ہوا یہ اشعار ہی ملاحظہ فرمائیے زیادہ لطف آئے گا:۔

وہ شوقِ ناشکیب کی گستاخ دستیاں * اٹھنا وہ درمیان سے پردۂ حجاب کا
وہ حسنِ شرمگیں کی ادائے سپردگی * وہ ارتعاش کیف لبِ کامیاب کا
ارماں بھرے دلوں کی وہ خاموش گفتگو * وہ ہمدگر فشار علاجِ اضطراب کا
وہ چاندنی سی چاکِ گریباں سے ضو فگن * وہ نوش لب میں کیف بہشتی شراب کا

[1] یہ اشعار "پریم پجاری" ہی کے ہیں جو "پچی کہانی" کے عنوان سے "ساقی" کے جنوری نمبر ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئے ہیں۔ اگرچہ ان سے اور اُس شعر سے کوئی نسبت نہیں۔ لیکن انہیں اس جگہ محض اس وجہ سے میں نے لکھ دیا ہے کہ منظوم و منثور عبارتیں مل کر ایک اچھا خاصا افسانہ ہو جاتی ہیں۔ نیز یہ وہ اشعار ہیں جو آرٹ کا بہترین نمونہ ہیں اور اُردو شاعری میں اتنا بہتر اور ایسا معیاری آرٹ اب تک میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔ قارئین پڑھیں اور ایک ایک لفظ پر غور فرما کر لطف اٹھائیں۔ لیکن ہاں

حسن فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

عطاء اللہ

پیدا ہوا حواس پہ وہ کیف بے خودی تکمیل ہر ہوس وہ تقاضا شباب کا
مگر یہ فضا کب تک خوشگوار رہ سکتی تھی؟ آخر چند ساعتوں کے بعد دونوں کو علیحدہ ہونا پڑا۔

میرے نزدیک عاشق کے لئے معشوق کا وصل ممکن ہے لیکن اس کا حصول ناممکن۔ کیونکہ محبت کو ختم کر دینے والی چیز معشوق کا دائمی حصول ہے۔ اس کا وقتی وصل نہیں۔ بلکہ یہ تو وہ چھڑکاؤ ہے جو ایک مشتعل آگ کو بجھانے کی بجائے اور بھی بھڑکا دیتی ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا۔ عاشق پہلے سے زیادہ مغموم و محزون واپس لوٹا۔ اس وقت سے اب تک پھر کبھی اُس کی نظر اُس پر نہیں پڑی۔ مگر وہ اُس کی یاد (حدت، تڑپ اور بے چینی ⟨جو ملنے کے بعد اب اور زیادہ ہو گئی ہے⟩) اپنے دل میں لئے ہوئے زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔ اب ایسی صورت میں اگر وہ شاعرانہ انداز میں کہتا ہے کہ ؎

گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
اُنہیں کی یاد میری زندگی ہے

تو وہ کیا غلط کہتا ہے؟ اور اس جذبہ کو سننے سے قاری کے دل میں تحریک نہیں ہوتی تو اور کیا ہوتا ہے؟

اب شاید یہ سوال ہوگا کہ آخر خوشی کی چند گھڑیاں گزارنے کی یاد پر زندگی کے دارومدار ہونے کا کیا ثبوت؟ تو میں عرض کروں گا۔ کہ تحقیقاً کسی خاص مسرت وغم پر موت وحیات کا انحصار ہے یا نہیں یہ قابل بحث نہیں۔ کیونکہ ہر بات جو شعر میں بیان کی جائے قابل ثبوت نہیں ہوا کرتی۔ اور اس لئے اس پر بحث کرنا ہی غلط ہے۔ پھر بھی اتنا ضرور ہے کہ عشقیہ شاعری میں ادنیٰ ادنیٰ باتوں پر اپنی موت وحیات کا مدار رکھنا شاعروں کا خاص طرز تحریر اور طریقۂ گفتگو رہا ہے۔ اگر تلاش کی جانے لگے تو سینکڑوں اشعار اس عنوان پر ملیں گے۔ اس وقت ثبوت میں مندرجہ ذیل شعر حاضر ہے۔ میلی ہروی کہتا ہے ؎

ہم از وفا مدار بدہ وعدہ کہ من
از ذوق وعدۂ تو بہ فردا نمی رسم

(اے معشوق! تو وصل کا وعدہ کیوں نہیں کر لیتا؟ کیا تو اُس کے ایفاء کے خوف سے ڈرتا ہے؟ نہیں تو بے خوف ہو کر وعدہ کر لے کیونکہ صرف وعدۂ وصل کی خوشی مجھے اتنی ہوگی کہ میں آج ہی مر جاؤنگا اور کل تجھے وعدہ وفا کرنے کی نوبت نہ آئے گی)

اس شعر میں موت کی وجہ شاعر نے صرف وعدۂ وصل قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اگر وہ "ہاں" کر دے تو میں ابھی مر جاؤں۔ لیکن اگر اس جگہ میں یہ بھی دعویٰ کر دوں کہ شاعر نے اس شعر میں یہ بھی کہا ہے کہ اس کی زندگی جو اب تک قائم ہے وہ محض اس وجہ سے کہ شاید کبھی معشوق کا وصل نصیب ہو یا شاید کبھی وہ وعدۂ وصل کر لے۔ بالفاظ دیگر وہ زندہ ہے صرف اُمید وعدۂ وصل پر، تو مجھے جھٹلانے کے لئے کوئی ثبوت اور کوئی دلیل موجود نہیں۔ اُردو زبان کے کسی شاعر کا شعر ہے:۔ ؎

متاعِ زیست ہے میرے دلِ حزیں کیلئے
وہ اک خلش جو ہوئی اور بار بار ہوئی

اس جگہ شاعر نے کسی "خلش" کو "متاع زیست" کہا ہے۔ اب کہہ دیجئے اعتراض کہ یہ قطعاً غلط ہے!۔ بہرکیف ظاہر ہے کہ جب شعرا کے یہاں اس قسم کے شاعرانہ نظریئے موجود ہیں تو کسی شاعر کا یہ کہنا کہ میری زندگی کا مدار صرف خوشی کی اُن چند گھڑیوں پر ہے جو میں نے اپنی عمر میں ایک دفعہ گزاری تھیں، خلاف عقل یا موجب حیرانی ہرگز نہیں۔ اور نہ یہاں اُس کو یاد کر کے خوش ہونے کا کوئی سوال ہے۔ متذکرہ شعر میں لفظ "زندگی" ہی وہ کانٹا ہے جو لائق پروفیسر کو کھٹکا اور جس پر انہوں نے اتنی لمبی چوڑی تنقید فرمائی ہے۔ اور صرف یہی ایک لفظ ایسا ہے جس پر ساری بحث کا مدار ہے۔ لہذا عرض ہے کہ میدانِ شعر میں لفظی اعتراض یا بحث کوئی چیز نہیں۔ کیونکہ ایک ہی غزل میں ایک ہی شاعر دو متضاد خیال بھی پیش کرتا ہے۔ میں اس جگہ اسی شاعر اور اسی زمین کے چند اور اشعار نقل کر دیتا ہوں جن کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوگا کہ متذکرہ شعر پر محض لفظ "زندگی" کی وجہ سے اعتراض کرنا قطعاً غلط ہے۔ شاعر نے "زندگی" کا دارومدار بہت سی چیزوں پر بتایا ہے اور سب قطعاً درست ہے:۔

ہلاکِ انجام، تکمیل تمنا ✦ بقائے آرزو ہی زندگی ہے
وہ جیا ہے جس قدر بھی مختصر ہو ✦ محبت کی جوانی زندگی ہے

اپنی زندگی کا مدار بھی دو چیزوں پر بتاتے ہیں:۔

رُلاتی ہے مجھے کیوں چاندنی رات ؞ یہ ہی اک راز میری زندگی ہے
گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں ؞ اُن ہی کی یاد میری زندگی ہے

اب بتائیے کیا بحث کیجئے گا! پروفیسر صاحب! یہ چیز قابلِ گرفت نہیں۔ کسی بڑے شاعر کا دیوان اُٹھا لیجئے۔ آپ دو متضاد چیزیں ایک ہی غزل میں دیکھ لیں گے۔ دراصل "غزل" کے تمام اشعار علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں اور اُن کے لئے یہ ضرور نہیں کہ وہ باہم مربوط بھی ہوں۔ لہٰذا شاعر آزاد ہے کہ اُن میں جو کچھ چاہے اور جہاں پر چاہے کہے . . .

رہا "عشق" و "محبت" کے متعلق (کیونکہ یہ ہی جذبہ ایسا ہے جو انسانی زندگی کو تلخ بنا دیتا ہے) مولانا کا یہ فرمانا کہ:۔

"ایسی چیز کسی قدر بلائے بے سرم ہو گی جس کی وجہ
سے تمام زندگی بیکار ہو جائے"

یا کسی "یاد" کے متعلق یہ کہنا کہ:۔

"اگر اس سے مسرّت نہیں ہوتی۔ تو اُس کی یاد
بیکار ہے"

تو اس کے متعلق بجز اس کے اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے کہ:۔ ع

اس "تپش" کا ہے مزہ "دل" ہی کو حاصل ہوتا

اور یہاں حال یہ ہے کہ مولانا کا سارا اعتراض محض سینہ میں ایک محبت نا آشنا دل کی موجودگی اور عشق و محبت کے جذبات و اثر کی نا وابستگی کی وجہ سے ہے۔ پروفیسر صاحب! اس کا تعلق "علم" سے نہیں "احساس" سے ہے اور ایسا احساس کہ جسے،

"آدمی محسوس کر سکتا ہے کہہ سکتا نہیں"

تو پھر میں آپ کو اس کے متعلق کیا بتاؤں! اور جبکہ بقول شاعر

نہیں کچھ بھی تم ہو محبت سے واقف

تو پھر آپ اُس کی لذّت و لطافت کیا سمجھیں گے! بقول کسی کے اس کا مزہ بہارِ عشق کی رنگینیوں میں کھوئے ہوئے اور خمارِ محبت میں ڈوبے ہوئے دلوں سے پوچھئے تو معلوم ہو جائیگا کہ لمحاتِ فرقت جس قدر سخت اور تلخ ہوتے ہیں۔ اُسی قدر شیریں اور لذت آفریں بھی۔ ہائے حقیقت نگار "پریم پجاری" نے خوب ہی کہا ہے۔ ؎

"آہ کی قدر، اشک کی قیمت
کوئی سنگ ناشناس کیا جانے"

بہرکیف! اگرچہ حافظ کا یہ قول ایک دم درست ہے کہ ؎

حافظ تو ختم کن کہ ہنر خود عیاں شود
با مدعی نزاع و محاکمہ چہ حاجت ہست

لیکن آخر میں اتنا کہے بغیر رہا نہیں جاتا کہ میری نظر میں زیر بحث شعر تحریک جذبات محبت میں بہترین شعر ہے اور اسے سُن کر تمام چوٹ کھائے ہوئے دل وجد کرتے اور کر سکتے ہیں۔ اب اگر ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کی نظر میں یہ شعر مہمل نظر آتا ہے اور جو اس کے باوجود اپنی جگہ اٹل ہیں تو میں شاعر سے یہی کہوں گا کہ ؎

معاف کر دو انہیں دل نہیں گداز اُن کے

غزل!

(از جناب عبدالستار صاحب قمر اجنالوی)

چھوڑ دو اِس جستجو سے کیا حاصل
نام میرا ہے بے نشانوں میں

دِل جلانے کو میں کہاں جاؤں
برق سوتی ہے آشیانوں میں

اب اگر اُن کا ہو گیا دیدار
پھر کہاں جان نیم جانوں میں

بدنصیبی ہے اب کہاں اے دل!
بات پہلی سی مہربانوں میں

ذکرِ عشرت بھلا کہاں ہمدم!
نامرادوں کی داستانوں میں

اپنے دُنیا سے ہوں میں ناواقف
گویا رہتا ہوں آسمانوں میں

محبت کے دو پھول ۲

ایک دلگداز منظوم افسانہ

از جناب وکیل احمد صاحب حافظ غازی پوری

ہو چکی تھی اُس کو مدت دشت میں رہتے ہوئے
کٹ رہی تھی زندگی رنج و الم سہتے ہوئے

یاد تھیں زائر کو لیکن بحر کی پہنائیاں
سامنے نظروں کے تھیں طوفان کی گہرائیاں

ساتھیوں کا خوف سے جی بے طرح چھوٹا ہوا
آندھیوں کا زور اُس پر بادباں ٹوٹا ہوا

موج مثلِ کوہ تھی تو کشتی بشکلِ کاہ تھی!
مضطرب تھا ہر نفس اِک اِک کے لب پر آہ تھی

گیند کی مانند کشتی کا اُچھلنا الاماں!
زور سے پانی کا وہ پیہم اُبلنا الاماں!

ایک نے جیسے اُچھالا دُوسری نے لے لیا
صنعتِ انساں سے گویا بحر کا یہ کھیل تھا

کشتیِ آہن تھی یا گہوارۂ بے اختیار
تُند و تیز موجوں پہ جس کی زندگی کا انحصار

جا رہی تھی جس طرف لیجا رہا تھا ناخدا
سامنے آنکھوں کے نقشہ تھا اُمید و بیم کا

شورشِ امواج تھی یا برقِ آتش بار تھی
زندگی گویا اجل سے برسرِ پیکار تھی

ناگہاں ٹکرا گئی آ کر جزائر کے قریں
آنکھ جھپکاتے ہی کشتی تھی نہ وہ منظر کہیں

چند تختے سطح پر تھے وہ بھی تھے گرداب میں
اور تھوڑی دُور پر اک شخص پیچ و تاب میں!

چھُٹ چکا تھا دوستوں سے عافیت سے دُور تھا
زندہ رہنے پر مگر وہ ہر طرح مجبور تھا

تھے جزائر کے مناظر اُس کو فردوسِ نظر
اور خود رو پھول پھل پر زندگی ہوتی بسر

صبح سے تا شام ساحل ہی پہ رہنا کام تھا
کوئی کشتی دیکھ پائے یہ خیالِ خام تھا

نغمۂ اُمید چھڑ جاتے تھے اکثر یاس میں
نا اُمیدی کی جھلک بھی دیکھتا تھا آس میں

طبعِ محزوں ساتھ لیکر اِس کو سوتی غار میں
الحذر کیسی بھیانک رات ہوتی غار میں

کچھ دنوں میں خود بخود آسودگی ہونے لگی
اور کشتِ صبر میں تخمِ سکوں بونے لگی

جاں گسل تھیں اس قدر لیکن اسے تنہائیاں
ہیچ تھیں نظروں میں بحر و دشت کی رعنائیاں

سینکڑوں اُمید لیکر ہر طرف جاتی نظر
ہو کے محرومِ تمنا پھر پلٹ آتی نظر

جی بہت گھبرا گیا جب منظرِ معمول سے
دل کو بہلانے لگا وہ سیرِ عرض و طول سے

اس اثر کے ساتھ ہی وہ ہر طرف پھرنے لگا
آبِ جُو کے پاس دیکھا ایک گلہ بھیڑ کا
دیکھ کر جس کو ہوا پیدا کچھ اُس کو آسرا
اور وہ بیتاب ہو کر اُس طرف کو چل دیا
ہر قدم میں جستجو تھی ہر نفس بیدار تھا
بادۂ اُمید سے قلبِ حزیں سرشار تھا
اجنبی کو دیکھ کر بھیڑیں ہوئیں غمناک سی
جو سراپا علم تھیں کرنے لگیں وہ سرکشی
غیر معمولی صدا سے پڑ گئی اک کھلبلی! گلہ باں نے دیکھ کر بھیڑوں کا یہ حال کر دی
دُور ہی سے دیں تسلّی کی صدائیں بار بار
جس سے گونج اُٹھیں بیاباں کی فضائیں بار بار
سُن کے یہ آواز زائر اس طرف مائل ہوا
رنجِ تنہائی بھی دل سے کچھ نہ کچھ زائل ہوا
ہو گئی اُس کے تجسّس میں ترقی بالیقیں
ناوکِ نو سے مگر زخمی ہوا قلبِ حزیں
گلہ باں دوشیزۂ صحرا نظر آئی اُسے
اِک نئی دُنیا میں لائی دشت پیمائی اُسے
قد وہ بوٹا سا کہ جس پر سرو بھی نثار
چال وہ گلریز جس پر ہو فدا جانِ بہار
شان میں وہ سادگی جس سے قناعت آشکار
آن میں وہ نرمیاں جس پر تصدق سبزہ زار
سر سے لیکر پاؤں تک ہر ساز و سامانِ جمیل
کس لئے کہئے نہ اُسکو روحِ عنوانِ جمیل
زُلفِ برہم، ناشناسِ شانۂ زینت فزا
خاک کے ذرّے تھے کچھ جس پر چمکتے جابجا
مانگ ایسی دشت میں جیسے نشاں ہو لیک کا
رہنمائی جس کی ہو وجہِ حصولِ مُدّعا
تھی جبیں یا ایک لوحِ زرفشاں خاموش تھی
اور اُس پر زلفِ مشکیں، ماہ در آغوش تھی

چشم و ابرو کے اشارے کیف زا و بادہ ریز
عارضِ گلگوں عرق آلود یعنی حشر خیز
نرم بوسے بڑھ کے لیتی تھی نسیمِ عطر بار
اور پھرتی رقص میں چاروں طرف مستانہ وار
مہرِ لب گلرنگ میں دوشیزگی بیدار تھی
بادۂ نسوانیت سے ہر ادا سرشار تھی
گردن و سینہ پہ رقصاں حسن و افسونِ شباب
دیکھ کر جس رنگ کو روئے شفق تھا آب آب
سطحِ سینہ سیم آسا، اور وہ گلگوں حباب
آئینہ میں دیکھتے تھے ہر گھڑی اپنا شباب
تھا جمال اس کا کہ تھا اک خندۂ نورِ سحر
گوشۂ مشرق میں گویا حسن کا فورِ سحر
لرزشِ مژگاں و ابرو، حشر سامان فتنہ کار
گردشِ چشمِ سیہ، دورِ شرابِ خوشگوار
جنبشِ لب غنچہ ساماں، گلفروشِ نوبہار
گوہرِ دنداں پہ صدقے قطرہ ہائے آبشار
ہر تبسّم جانِ فطرت، ہر تکلّم زود اثر
ہر ستم جانِ تمنّا، ہر کرم تیرِ نظر
محو تھا زائر ادھر رنگینیوں میں حُسن کی
صورتِ آئینہ حیراں اس طرف اک اجنبی
ناگہاں بیدار دُنیا ہو گئی احساس کی
گلہ باں دوشیزہ" اس سے اس طرح کہنے لگی
کون ہو تم؟ کس لئے پھرتے ہو آوارہ یہاں!
آج تک دیکھا نہ تم سا کوئی ناکارہ یہاں!
چھیڑتے ہو کس لئے بھیڑوں کو بے جرم و خطا
مطمئن چرتی تھیں وہ تم نے پریشاں کر دیا!
ہو گئیں سب منتشر اس سے تمہیں کیا مل گیا!
بس یہی نا! ایک فتنہ بے سبب پیدا ہوا
دُور ہو جاؤ خلل اندازیاں اچھی نہیں

بے زبانوں سے یہ رخنہ سازیاں اچھی نہیں

گو عتابِ حُسن کا "معصوم سا" انداز تھا
زارِ حساس کو بھی غیرتوں پر ناز تھا
ناخنِ زخمہ سے وہ چھیڑا ہوا اب ساز تھا
اور اس کا ہر نفس اک نغمۂ صد راز تھا
حُسن کی بیزاریوں سے خود ہوا بیزار سا
چل پڑا چپ ہو کر اک جانب مگر بیمار سا

جا چکا وہ دُور نظروں سے جب اوجھل ہو گیا
مٹ گیا جب چٹکیوں سے بھی تعلق تیر کا
تو ہوا پھر نرم دل حُسنِ ستم آرا ذرا
اپنی طرزِ گفتگو پر بھی ہوا افسوس سا
سرد مہری کی جگہ سرگرمیاں پیدا ہوئیں
سخت گیری کے عوض میں نرمیاں پیدا ہوئیں
ہر گھڑی رہنے لگا پیشِ نظر اُس کا خیال
زرد چہرہ ہو چلا ہونے لگا دل بھی نڈھال
اُس کے دل میں چُبھ چکا تھا نشترِ حُسن و جمال
ایسے حالِ زار میں لازم تھا احساسِ ملال
ہو گیا برہم سکوں عشقِ ستم ایجاد سے
گونج اُٹھا صحرا کا صحرا شورشِ فریاد سے
اِس طرف بے چین دوشیزہ اُدھر ناشاد وہ
درد کا احساس اِسکو عشق میں برباد وہ
مثلِ بُلبل یہ قفس میں، شاکیٔ صیّاد وہ
یہ قتیلِ تیغِ حسرت، کُشتۂ جلّاد وہ
نشۂ ناز و لطافت سے کوئی تو چُور تھا
بادۂ احساس و غیرت سے کوئی مخمور تھا
حُسن کو بڑھنے نہ دیتیں حسن کی تابانیاں
عشق کو روکے ہوئے خود عشق کی حیرانیاں
گلستاں تک تھیں اُدھر محدود گل افشانیاں
اور صحرا تک اُدھر تھیں بے سرو سامانیاں
اِک طرف آنِ محبت اور غیرت آشنا
اِک طرف شانِ جنوں لیکن لطافت آشنا
دیکھکر یہ رنگِ اُلفت یہ انوکھا ماجرا
دیوتا نے عشق کے اُلفت کی دیوی سے کہا
یہ تمنّا بھی نئی ہے یہ تماشا بھی نیا
مِل چکے باطن میں دونوں اور ظاہر میں جُدا
نشۂ احساس ان کا تیز ہونا چاہیئے
ساغر و مینا کو بادہ ریز ہونا چاہیئے

موسمِ خوابیدہ میں پیدا ہوا پھر انقلاب
مطرب نے رکھ لیا پھر سامنے چنگ و رباب
عارضِ گُلرنگ پر چھانے لگا رنگِ شباب
اور صحرا ہو چلا پابند ذوقِ اضطراب
لالہ و گل کی ضیاؤں سے چمک اُٹھے چمن
نکہتوں کی موج سے کیا کیا مہک اُٹھے چمن
رنگ بدلا دیکھ کر یہ فطرتِ خاموش کا
دل میں دوشیزہ کے اُمڈا ایک دریا جوش کا
بڑھ گیا ذوقِ طلب جوشِ محبت کوش کا
حوصلہ سا حوصلہ تھا وہ بھی ساغر نوش کا
بھیڑ کا گلہ لئے وہ جانبِ صحرا چلی
پا خمستاں سے نکل کر نکہتِ صہبا چلی
چھوڑ کر بھیڑوں کو وہ ہر سمت چرنے کے لئے
چشمۂ خوش آب پر پہنچی نکھرنے کے لئے
عکس اپنا اُس نے دیکھا اب جو سطحِ آب پر
چھا گیا اک کیف سا ذوقِ دلِ بے تاب پر
عالمِ تصویر میں وہ صورتِ تصویر تھی
اور سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی تھی بیخودی
ناگہاں وہ صورتِ محبوب وجہِ آرزو

مسکراتی آئی زیرِ سطحِ موجِ آبِ جو
گو دبی تھی اُس کی کُھلی آنکھیں تبسم آشنا
بند تھے کہنے کو لب لیکن تبسم آشنا
دیکھتے ہی یہ تماشا مضطر و حیراں ہوئی
اضطرابِ قرب سے گھبرا اٹھی لرزاں ہوئی
بھیڑ کے گلے کی جانب دیکھ کر یاں چھوئی
اِک نگاہِ الوداعی صبر کا ساماں چھوئی
اس طرح لہرا کے کودی چشمۂ خاموش میں
حُسن کا جیسے ستارا عشق کی آغوش میں
سطحِ سیمابی میں اک ہیجان سا پیدا ہوا
موج اندر موج پر گرداب کا دھوکا ہوا
دائرہ پھیلاؤ میں موجوں کا حد سے بڑھ گیا
بلبلے کچھ اوپر آئے بعد اس کے کچھ نہ تھا
حلقۂ دامِ فنا سے ہر نفس گھبرا اُٹھا
ذرّہ ذرّہ دہر کا تڑپا کبھی تھرا اُٹھا

زائرِ ساکت اُدھر اپنی جگہ بیٹھا ہوا
کچھ نقوشِ ذہن کی ترتیب میں مصروف تھا
یک بیک دل کی جگہ کچھ دردِ دل پیدا ہوا
اور آنکھیں ہو چلیں اشکِ محبت آشنا
آرزوئے دوست نے کچھ کر دیا مجبور سا
شیشۂ دل بھی نظر آنے لگا کچھ چور سا
وحشت و اوہام نے یوں الغرض گھیرا اُسے
اُٹھ کے ہونا ہی پڑا پھر بادِ پیما اُسے
ذرّہ ذرّہ ہو رہا تھا محملِ لیلا اُسے
اِتنے ہی میں پھر نظر آیا وہی صحرا اُسے
قالبِ صحرا تھا خالی شکلِ جاں کوئی نہ تھا
ہر طرف بھیڑیں تھیں مضطر گلہ باں کوئی نہ تھا
اس کو پہلے دیکھ کر پھر کچھ سمجھ کر سوچ کر

اِک جگہ سب آ گئیں جو ہو رہی تھیں منتشر
ہو گیا حلقہ میں اُن کے اسطرح وہ جلوہ گر
پنبہ ہائے ابر کے ہالے میں جیسے ہو قمر!
اُن کی اُلفت دیکھ کر اس کو بھی اُلفت ہو گئی
ہو گیا کافور غم تازہ محبت ہو گئی
بیٹھ کر وہ بھی لبِ جو اُن کو بہلانے لگا
مضطرب روحوں پہ لطفِ خاص فرمانے لگا
اُن کی ہر آواز پر جی اُس کا بھر آنے لگا
اور رہ رہ کر خیالِ دوش تڑپانے لگا
پھر گیا آنکھوں میں نقشہ حُسن کے انداز کا
تھرتھرا اُٹھا ہر اک پردہ دلِ ناساز کا
تھا ابھی مصروف وہ محبوب کے اسباب سے
پڑ رہی تھی ضرب دل پرشش کے مضراب سے
اُس نے دیکھا دُور پر کچھ چشمۂ خوش آب سے
کھیلتے موجِ صبا کو اِک گلِ نایاب سے
دیکھتے ہی پھول کو اِک بیخودی سی چھا گئی
کھنچ کے آنکھوں میں شرابِ ارغوانی آ گئی
چھوڑ کر بھیڑوں کو وہ سوئے گلِ خنداں چلا
ہر قدم کی لغزشوں میں شوق بے تابانہ تھا
پھول کے نزدیک جیسے ہی وہ بالکل آ گیا
بے تحاشا چُومنے کے واسطے آگے جُھکا
جس طرح ساغر جُھکا کرتا ہے مینا کی طرف
یا رواں ہوتا ہے قطرہ اپنے دریا کی طرف
لب ابھی ملنے نہ پائے تھے گلِ شاداب سے
ساز کو دُوری ابھی تھی شوق کے مضراب سے
بُلبلے اُٹھنے لگے کچھ چشمۂ پُر آب سے
ہٹ گئی اس کی توجّہ موقعِ کم یاب سے
زیرِ سطحِ آب دیکھا پرتوِ جانِ جمال
مایۂ احساسِ فطرت، مرکزِ حسنِ خیال

زلف موجوں سے پریشاں صورت آشفتہ حال
روحِ پیشانی پہ بل، آنکھوں میں کچھ کچھ انفعال

اس ادا نے کر دیا تھا اور بھی پیدا کمال
لب تھے گو خاموش لیکن ان میں پنہاں تھا سوال

چھوڑ کر مجھ کو، گلِ فطرت کی اتنی آرزو
ہائے وہ دن جب تجھے تھی صرف میری آرزو

طعنۂ خاموش نے بے تاب و حیراں کر دیا
وہ اچھل کر چشمۂ پُرآب میں یُوں گر پڑا

ٹوٹ کر گرتا ہو جیسے کوئی تارہ چرخ کا
کچھ نہ آیا پھر نظر امواجِ مضطر کے سوا

مٹ گئے سب ولولے دل سوزِ نیاز و ناز کے
ہو گئے طے مرحلے ذوقِ بلا انداز کے

دفعتہً روئے جہاں پر چھا گئی افسردگی
گلشن و صحرا ہوئے مصروفِ رنجِ بے دلی

روح کی بیداریوں میں خامشی کا ڈھنگ تھا
کائناتِ رنگ و بو بے رنگ تھی، بے رنگ تھا

ذرّہ ذرّہ دہر کا حیران و ششدر ہو گیا
لمحہ لمحہ زندگی کا سب کو دوبھر ہو گیا

دیکھ کر قدرت نے دنیائے وفا کا انقلاب
کر دیا اک اور عالم اس ادا سے بے نقاب

آبِ جو کے پاس پھولا تھا جو اک رنگیں گلاب
بس اسی کے سامنے پیدا کیا اس کا جواب

ہلکی ہلکی بھینی بھینی نکہتیں آنے لگیں
گلشن و صحرا پہ پھر بیداریاں چھانے لگیں

چشمۂ سیمیں کی موجیں بڑھ کے ٹکرانے لگیں
مچھلیاں مسرور ہو کر دل میں اترانے لگیں

موسمِ گل کی فضا میں ابرِ مستی چھا گیا
پھر وہی پینے پلانے کا زمانہ آ گیا

ایک اُن میں عشق تھا اور ایک اُن میں حسن تھا
پھول دونوں تھے مگر دونوں کی فطرت تھی جدا

ایک بالکل سادہ فطرت دوسرا رنگیں ادا
کر رہے تھے سامنے رہ کر مقدر کا گلا

یہ ستم موجِ ہوا سے جب نہ دیکھا جا سکا
اور تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ اصلا آ سکا

ڈالی ڈالی پتی پتی سے گزر جانے لگی
اک ادائے خاص سے ہر سمت لہرانے لگی

گیسوئے فطرت کو وہ رہ رہ کے بکھرانے لگی
جس طرف جاتی نہ تھی اس سمت بھی جانے لگی

جھوم کر دو پھول بھی آخر گلے سے مل گئے
وصل کے احساس سے حسرت کے غنچے کھل گئے

مٹ گئیں محرومیاں جاتی رہیں مجبوریاں
قرب کی آغوش میں کھونے لگیں سب دوریاں

اب نہ تھا احساسِ فرقت اب نہ تھے وہ رنج و غم
بادۂ پُرکیف تھا عیش و نشاط و مبدم

جب ہوا چلتی تو خوش ہو ہو کے پیہم جھومتے
انبساط و کیف سے اک دوسرے کو چومتے

ایجاد اولین!

قصے کے پیرایہ میں ایک وقیع اور ٹھوس علمی مقالہ

از جناب چوہدری محمد طفیل صاحب تنیر بی۔ اے۔ بی لٹ جرنلسٹ

ستمبر کے آخری دن تھے۔ موسم بہت کچھ تبدیل ہو چکا تھا۔ دن کو اگرچہ گرمی پڑتی تھی۔ لیکن رات کو کافی ٹھنڈک ہو جاتی تھی۔ ایک دن شام کے وقت حسب معمول ٹھنڈی سڑک پر جا رہا تھا۔ میرے آگے آگے کالج کے چند طالب علم آپس میں باتیں کرتے جا رہے تھے۔ اُن کی بحث کا موضوع "دنیا کی بہترین ایجاد" تھا۔ ایک نے کہا ریل سب سے زیادہ مفید اور کارآمد شے ہے۔ دوسرے نے کہا ریل جس قدر مفید ہے اسی قدر نقصان دہ بھی ہے۔ تجارت کو فروغ دیتی اور سفر میں آسانیاں بہم پہونچاتی ہے لیکن اگر کہیں ٹکر ہو جائے تو قیامت بپا ہو جاتی ہے۔ تیسرا بولا۔ بہترین ایجاد ٹیلیگراف ہے۔ چوتھے نے جواب دیا۔ سب فضول ہے ٹیلیفون سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں اپنے گھر میں بیٹھے بٹھائے جس سے جی چاہے باتیں کر لو۔ پانچویں نے جواب دیا پریس بہت بڑی ایجاد ہے۔ دنیا کے تمام مہذب ممالک پریس کے بل پر زندہ ہیں۔ چھٹا بولا ہم ریڈیو پر دل بہلاتے ہیں۔ ساتویں نے کہا سینما سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ دیکھ بھی لو اور آواز بھی سن لو آٹھواں موٹر کار کے حق میں تھا۔

میں نے گنا تو ان کی تعداد نو تھی۔ ایک ابھی تک نہیں بولا تھا غریب چشمہ لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے گنتا جا رہا تھا۔ سب نے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا "تم کیوں نہیں بولتے؟ تمہارا کیا خیال ہے؟"

اُس نے جواب دیا۔ "آپ تو بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں۔ میں اُس چیز کو بہترین سمجھتا ہوں جو مجھے ہر وقت فائدہ دیتی ہے۔ میری عینک دنیا کی بہترین ایجاد ہے مثل مشہور ہے کہ آنکھیں بڑی نعمت ہیں وہ تو تقریباً جا چکی تھیں۔ لیکن عینک نے بچا لیں اب دیکھئے میں بھی آپ کی طرح بخوبی دیکھ سکتا ہوں۔

پہلا پھر بولا "اس لحاظ سے تو میری گھڑی اچھی ہے جو وقت پر کالج پہنچنے میں مدد دیتی ہے۔" اب اُن کی سنجیدہ گفتگو مذاق کا پہلو اختیار کر چکی تھی اس لئے میں نے اپنی راہ لی۔

رات کافی گذر چکی تھی لیکن میں مسئلہ کے اہم پہلوؤں پر غور کر رہا تھا۔ جب سوچتے سوچتے تھک گیا۔ تو بستر پر کروٹیں لینے لگا۔ گر نیند کو پر لگ گئے تھے اور دنیا کی بہترین ایجاد کے تصفیہ کا مسئلہ دماغ پر مسلط ہو رہا تھا۔ میں جب بھی سونے کی کوشش کرتا تھا۔ دماغ خود بخود اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتا تھا۔ آخر کہاں تک سوچتا۔ مجھ پر غنودگی سی طاری ہو گئی اور آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ خیالات کے ہجوم میں دماغ پریشان ہو گیا اور خواب کا فرشتہ مجھے عالم خیال میں لے گیا۔

میرے سامنے اب ایک وسیع ہال تھا۔ جس کے ایک طرف پلیٹ فارم بنا ہوا تھا۔ وسط میں ایک بڑا میز تھا جس پر گلدستے رکھے ہوئے تھے۔ سامنے ایک زرنگار اور مرصع کرسی تھی۔ ارد گرد بہت سے

وجیہہ و سنجیدہ مزاج لوگ بیٹھے ہوتے تھے جو کم و بیش جملہ مہذب ممالک کے نمائندہ تھے۔ اُن میں بہت کم ایسے چہرے تھے۔ جو ایک دوسرے سے مشابہ تھے۔ باقی حصے میں بنچیں اور کرسیاں رکھی ہوئی تھیں جن پر عام لوگ بیٹھے ہوئے کسی آنے والے کے انتظار میں گردنیں لمبی کئے بار بار صدر دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کچھ لوگ جگہ کی کمی کے باعث ہال کے کونوں اور دروازوں میں کھڑے تھے میں بھی ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں تالیوں کا شور برپا ہوا۔ اور ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں کہ صدر صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ ساتھ ہی ایک سفید ریش بزرگ ہال میں داخل ہوئے جن کو دیکھتے ہی سب کھڑے ہو گئے۔ یہ بزرگوار ہر طرف سے سلام لیتے ہوئے کرسی صدارت پر متمکن ہو گئے۔ عام پبلک ہمہ تن گوش ہو کر نہایت صبر و سکون کے ساتھ اپنی جگہ پر بیٹھ گئی جب ہر طرف خاموشی چھا گئی تو صدر صاحب نے کھڑے ہو کر فرمایا۔

"صاحبان! آج ہم اس مقام پر اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ اس مسئلہ پر غور کریں کہ دنیا کی بہترین یا اولین ایجاد کیا ہے تاکہ ہمارے معلومات میں اضافہ ہو میں اگرچہ کوئی سائنسدان یا موجد نہیں ہوں۔ تاہم اس اہم جلسہ کی صدارت کے فرائض سرانجام دینے کے لئے ایک غیر جانبدار شخص کی طرح آپ کے درمیان موجود ہوں۔ آج عالم کے جملہ مشہور موجد یہاں تشریف فرما ہیں جو اپنی اپنی ایجادات کے متعلق خود بیان فرمائیں گے۔ مجھے اُمید ہے کہ سب حضرات نہایت غور سے سُنیں گے"

صدر صاحب ابھی بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ پلیٹ فارم پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک اور بزرگ کھڑے ہو گئے اور جلسے کا رنگ دیکھے بغیر ہی صدر کے پاس آ گئے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی کسی ایجاد کا ذکر کرنے کے لئے نہایت بیقرار ہیں تاکہ اوّلیت کا سہرہ انہیں کے سر رہے۔ اُنھوں نے کہنا شروع کیا۔

"جناب صدر اور حاضرین جلسہ! میں بھارت ورش کا پرانی نیشی ہوں پراچین بھارت کی سبھیتا بھی پراچین ہے کبھی وہ سمے تھا کہ ڈھاکہ کی ململ دساور کو جاتی تھی اور وہ اس قدر باریک ہوتی تھی کہ چالیس گز کا پورا تھان ایک انچ کی ڈبیہ میں رکھا جا سکتا تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جو کارخانے ایسا مال تیار کرتے تھے وہ کس کی ایجاد سے تھے اور ....

وہ کچھ آگے کہنا چاہتے تھے کہ ایک صاحب صدائے احتجاج بلند کی اور کہا کہ آپ غلام ملک سے تشریف لا رہے ہیں اور آپ کا نام بھی پروگرام میں نہیں اس لئے آپ کی شنوائی یہاں نہیں ہو سکتی۔ آپ کی ایک کیا ہزاروں ایجادیں بھی ہوں تو کسی کام کی نہیں۔ یہ جلسہ آزاد ممالک کے نمائندوں کی طرف سے منعقد کیا گیا ہے۔ اس لئے میں نہایت ادب و احترام کے ساتھ آپ سے بیٹھ جانے کی درخواست کرونگا"

قبل اس کے کہ صدر صاحب اس کے متعلق اپنا رولنگ دیں جلسے میں "بالکل ٹھیک بالکل ٹھیک" کی آوازیں آنے لگیں سوادا بھائی پھر کچھ نہ بولے اور سر جھکائے اپنی جگہ پر آ بیٹھے۔

اس کے بعد صدر نے پروگرام کے مطابق کارروائی شروع کی۔

سب سے پہلے "جان گٹن برگ" (John Gutenberg) کا نام لیا گیا جس نے آگے بڑھ کر تقریر شروع کی

"حضرات! میں جرمنی کا باشندہ ہوں میں نے پندرہویں صدی کے وسط میں چھاپہ خانہ ایجاد کیا۔ جو دور حاضر کی جملہ ایجادات میں نہ صرف سب سے پہلی ایجاد ہے بلکہ سب سے زیادہ مفید ہے۔ انسانی تہذیب کا منبع علم ہے اور علم کی نشر و اشاعت میں پریس نے جو کارِ نمایاں کیا ہے وہ کسی بیان یا تشریح کا محتاج نہیں لیکن آج کل جو درجہ پریس کو حاصل ہے وہ دنیا کی کسی دوسری ایجاد کو نصیب نہیں ہوا۔ پروپاگنڈا کا کام میری سعی کا محتاج ہے۔ پریس کے ذریعہ سے رائے عامہ کو بدلا جا سکتا ہے۔ پریس ہر قوم ہر ملک اور ہر حکومت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ دنیا کی لائبریریاں پریس کی محتاج ہیں۔ مجھے وہ زمانہ یاد ہے جب لوگ درخت کی چھال اور جانور کی کھال پر کتابیں ہاتھ سے لکھتے تھے اور اگر کوئی تصنیف ایک دفعہ ضائع ہو جاتی تھی تو بس نیست و نابود ہو جاتی تھی ...."

فرانسیسی موجد جینسن" (Gensen) نے گٹن برگ کی تائید کی اور کہا کہ میں نے ۱۴۷۰ء میں رومن ٹائپ ایجاد کیا مگر میری ایجاد میرے دوست کی تقلید میں تھی۔ پھر کوننگ" (Conning) کیکسٹن" (Caxton) "کوپر" (Cowper) اور "والٹر" (Walter) نے تائید مزید کی۔ حاضرین کی تالیوں کے شور سے ہال گونج اٹھا اور پریس کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا۔

پیٹر ہیل (Peter Hele) نے کہا

حضرات! میں نے ۱۵۰۰ء میں گھڑی ایجاد کی جس کے ذریعہ سے عامۃ الناس نے وقت کی قدر و قیمت معلوم کی۔ آج کوئی مکان کوئی گھر کوئی جیب اور کوئی کلائی گھڑی سے خالی نہیں۔ بعد میں آنے والے بزرگوں نے وقت کو روپیہ سے تشبیہ دی ہے۔ یہ میری گھڑی کی بدولت ہے کہ دن گھنٹوں، منٹوں اور سکنڈوں میں منقسم ہوا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وقت اور لہر کسی کا انتظار نہیں کرتے یا وقت گزرتے دیر نہیں لگتی لیکن گھڑی کو سامنے رکھ کر لمحات شماری کی جائے تو وقت گزرتا ہی نہیں۔ اس سے ثابت ہے کہ میں نے اپنی ایجاد سے وقت جیسی گزر جانے والی چیز کو دنیا کے لئے مقید و مسخر کر دیا ہے۔ اب دنیا کا ہر کام اپنے وقت پر کیا جاتا ہے۔ مجھے وقت کی قیمت معلوم ہے۔ اس لئے میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا۔"

حاضرین نے تحسین و آفرین کے نعرے بلند کئے اور پیٹر ہیل اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔

جینسن" (Jensen) بار دیگر اٹھا

"صاحبان! میں نے ۱۵۹۰ء میں خوردبین ایجاد کی جسے بعد میں گلیلیو (Galileo) اور فونٹانا (Fontana) نے محدب و مجوف شیشوں کی کمی بیشی سے مزید ترقی دی۔ اگر خوردبین نہ ہوتی تو آج جراثیم کا مطلق پتہ نہ ہوتا۔ اور علم طبیعات بالکل ادھورا رہ

جاتا۔ علم سائنس جسے دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی چیز کے جاننے کا دعویٰ ہے صرف خوردبین کے بل بوتے پر ہے۔ میری ایجاد چھوٹی سی ہے اس سے چھوٹا سا کام لیا جاتا ہے اس لئے اس کا بیان بھی چھوٹا ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ میری ایجاد "بقامت کہتر بقیمت بہتر" کے مصداق ہے"۔

اٹلی کے مشہور ماہر فلکیات گیلیلو (Galileo) نے بیان کیا:-

"مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ دوربین کس نے بنائی ہو۔ کیونکہ تاریخ اس بات کا پتہ نہیں دیتی اور اس کے اصل ایجاد کے متعلق بھی کسی کا دعویٰ نہیں۔ گو راجر بیکن (Rager Bacon) کو ۱۲۵۱ء میں اس کا خیال ضرور رہا۔ لیکن امر واقعہ یہی ہے کہ دوربین سب سے پہلے ۱۶۰۹ء میں میں نے بنائی تھی۔ اگرچہ ہیڈلے (Hedley) اور ہرشل (Hershal) نے ۱۷۱۶ء اور ۱۷۸۹ء میں بالترتیب اس میں اصلاح کی۔ مگر اس کا حقیقی موجد میں ہی ہوں۔ بنی نوع انسان کے لئے اپنی سرزمین کا حال جاننا کوئی باعث فخر نہیں۔ البتہ دوسرے ستاروں کی ماہیت معلوم کرنا بہت بڑا کام ہے۔ آج دنیا کو مریخ کے حالات سے واقفیت کا دعویٰ ہے۔ چاند کی سرزمین کا حال بھی دوربین نے ہی بتایا ہے۔ اگر دوربین نہ ہوتی تو آج چاند میں پہنچنے کا کسی کو بھی خیال نہ آتا۔ دور دراز مستقبل کی خبریں اسی سے حاصل کی جاتی ہیں"۔

کشش ثقل کا بانی حکیم نیوٹن (Newton) اٹھا۔

"بھائیو! آج دنیا مجھے حکیم یا فلسفی کے نام سے یاد کرتی ہے لیکن میں نے اس چیز کا راز منکشف کیا ہے جس سے طاقت، روشنی اور حرارت پیدا ہوتی ہے۔ اس کا نام برق یا بجلی ہے۔ اہل یونان نے چھٹی صدی قبل مسیح میں کہربا کی قوت مقناطیسی کا حال معلوم کیا مگر انہوں نے اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا۔ یہ میری کوشش کا نتیجہ ہے کہ میں نے سترھویں صدی میں بجلی کی تحقیق و ایجاد کی۔ آج تمام دنیا بجلی سے جگمگا رہی ہے۔ تمام مشینیں بجلی سے چلتی ہیں۔ اور ہر کام بجلی کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ انسانی جسم میں بجلی سب سے بڑی اور اصل قوت ہے۔ فطرت کی ہر چیز میں بجلی ہے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ فیصلہ آپ لوگوں پر ہے۔

جیمز واٹ (James Watt) نے اسٹیم انجن کی ایجاد کا دعویٰ کرتے ہوئے کہا۔ "اگرچہ بھاپ کی طاقت کا اندازہ کم و بیش پہلی صدی قبل مسیح میں لگایا جا چکا تھا اور ۱۶۹۸ء میں سیوری (Savery) نے اسٹیم پمپ بنایا۔ مگر اسٹیم انجن کا موجد میں ہوں۔ ۱۷۹۹ء میں ٹریوی تھک (Trevithick) نے معتد بہ اضافہ کیا۔ لیکن ......"

"جارج سٹیفن سن" (George Stephenson) نے موقعہ کو غنیمت جان کر برمحل بول اٹھا۔ "لیکن موجودہ متحرک انجن جس کی مدد سے ریل گاڑی چلتی ہے۔ میری اختراع ہے۔ میں نے ۱۸۱۴ء میں پہلا انجن بنایا تھا۔ آج تمام دنیا کی بیشتر تجارت، سفر، ڈاک۔ غرضکہ ایک کام ریل کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے کیا جاتا ہے۔ باغیوں کی سرکوبی کے لئے فوجی نقل و حرکت بہت آسان ہو گئی ہے۔ قحط زدہ علاقوں میں وقت پر مدد پہنچائی جا سکتی ہے۔

"نیپسے" (Niepce) بولا "میں نے ۱۸۲۶ء میں فوٹوگرافی کی بنا ڈالی، اور تصویریں بنانے میں کامیاب ہوا۔ پھر دوسرے سائنسدانوں نے میرے وضع کردہ اصولوں کے ماتحت کافی ترقی کی۔ ایک طرف انجن سے مدد لی۔ دوسری طرف بجلی کے ذریعہ سے آواز کو مسخر کر کے متحرک اور بولنے والی تصاویر پیش کیں۔ فی زمانہ ناطق تصاویر مہذب دنیا کے لئے لازمۂ حیات قرار پا چکی ہیں۔

"گراہم بیل" (Graham Bell) نے کہا

معزز سامعین! میں نے ٹیلیفون ایجاد کیا اور ۱۸۷۶ء میں پہلی دفعہ دو مختلف مقامات پر تبادلۂ گفتگو کیا گیا۔ یہ حیرت خیز ایجاد اصل آواز کو دوسرے مقام پر پہنچا سکتی ہے۔ کاروباری معاملات منٹوں میں طے ہو جاتے ہیں۔ ضروری خبریں فوراً دوسرے شہروں میں پہنچ جاتی ہیں۔

"تھامس ایڈی سن" (Thamas Edison) نے بیان کیا۔

"میں نے گراموفون کے علاوہ تیرہ سو ایجادات کیں۔ بجلی

کے لیمپ اور مختلف قسم کی دوسری ایجادات میری دماغی قابلیت کا نتیجہ ہیں"

الیشا گرے (Elisha Gray) نے کہا

میں نے ٹیلیگراف ایجاد کر کے دنیا پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ آج کاروباری دنیا میں تار برقی کو خاص وقعت حاصل ہے پریس والے میرے ممنون ہیں۔

ایک چینی نے "اصطرلاب" اور "قطب نما" کی ایجادوں کا دعویٰ کیا۔ ایک جاپانی اُٹھا اور کہنے لگا میں اور میرا ملک کسی چیز کا موجد نہیں۔ مگر نقالی میں ہم سب پیش پیش ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ہر قسم کا مال نہایت سستے داموں دیتے ہیں"

گلیلمو مارکونی (Guglielmo Marconi) اُٹھا اُس نے نہایت مدبرانہ انداز میں پہلے چاروں طرف دیکھا پھر کالر کے اندر انگلیاں پھیر کر گردن کو اکڑا کر بولا۔

"میری ایجادات میں بے تار برقی لہر سب سے زیادہ مفید ہے جو میں نے ۱۸۹۶ء میں معلوم کی۔ اس کی مدد سے دور دراز مقامات کی خبریں چند سکنڈوں میں تمام دنیا میں پہنچ جاتی ہیں۔ اس کے سامنے تار اور ٹیلی فون دونوں کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ اب ریڈیو کی عالمگیر مقبولیت بھی اسی ایجاد کا ایک پہلو ہے۔ اگر مجھے موقعہ ملتا تو میں ریڈیو کو اس قدر عام کر دیتا کہ لوگ فونٹین پین کی طرح جیبوں میں لئے پھرتے۔ اب بھی میرا خیال ہے کہ آئندہ دس سال میں ریڈیو بہت ترقی کرے گا۔ وہ دن دور نہیں جب اس کی مدد سے لوگ ایک مقام سے دوسرے مقام پر بآسانی پہنچ جایا کریں گے (پلیٹ فارم پر زور سے ایڑی مار کر) میرا دعویٰ ہے کہ یہ جدید ترین اور مفید ترین ایجاد ہے"

مارکونی نے تقریر ختم کی تو سامعین نے تالیوں سے اس قدر شور مچایا کہ جلسہ برہم ہونے لگا۔ ہر شخص اپنی دانست میں یہ فیصلہ کر چکا تھا۔ کہ ریڈیو بہترین ایجاد ہے۔ آخر صدرِ جلسہ نے بڑی مشکل سے "آرڈر" "آرڈر" کہہ کر لوگوں کو خاموش کیا۔ غالباً رائے شماری کا خیال تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنی اختتامی صدارتی تقریر شروع کریں ایک بوڑھا پلیٹ فارم کے آخری کونے سے آگے بڑھا اور صدر کی میز کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سر کے لمبے لمبے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اُس کی لمبی اور بے ڈول سفید گھنی ڈاڑھی جس نے کبھی شانہ کی صورت نہ دیکھی تھی۔ بجلی کے پنکھے کی ہوا سے اُس کے سینے پر لہریں مار رہی تھی۔ اس کے جسم پر ایک ہی لمبا کرتہ تھا جس میں جا بجا پیوند لگے ہوئے تھے۔ اس کی صورت دیکھتے ہی لوگوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ کسی نے آوازے کسے۔ کوئی تحقیر کے انداز میں بولا "یہ بوڑھا اب کیا کہے گا"۔ ایک طرف سے آواز آئی "بڑے میاں ذرا بلند آواز سے"

مگر بوڑھے کے چہرے پر طمانیت اور سنجیدگی برس رہی تھی لوگ جلد ہی خاموش ہو گئے۔ سائنسدانوں نے گردنیں لمبی کر لیں۔ بوڑھے نے کہنا شروع کیا۔

"صدرِ گرامی قدر، معزز موجدین و حاضرین! میں ایک گمنام موجد ہوں۔ مجھے اپنا نام بھی معلوم نہیں۔ تاریخ عالم میری نشاندہی سے عاجز ہے۔ لیکن میری کارگزاری کسی بیان کی محتاج نہیں۔ میں نے دنیا کے سامنے اپنی ایجاد اُس وقت پیش کی جب لوگ ایجاد کے لفظ سے بھی بیگانہ محض تھے۔

میں ایک غریب نجار ہوں اور میری ایجاد پہیہ ہے۔ تمام قسم کی مشینری اور دوسری ایجادیں بغیر پہیہ کے بیکار نظر آتی ہیں۔ آپ لوگ مجھے حقیر سمجھیں یا میری ایجاد کو بے حقیقت جانیں۔ لیکن اگر آپ بغائر نظر اور غور و تعمق سے دیکھنے کی کوشش کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ گو پہیہ اپنے موجد کی طرح سادہ اور معمولی چیز ہے لیکن اہمیت اور اپنے فوائد کے لحاظ سے عدیم المثال اور فقید النظیر ہے۔ اگر کسی ایسی ایجاد سے جس میں کوئی گول پرزہ، گراری یا پہیہ استعمال کیا جاتا ہے پہیہ نکال دیا جائے تو وہ ایجاد بیکار محض ثابت ہوگی بلکہ میں یہ کہوں گا۔ کہ مہذب دنیا ڈھیر ہو کر رہ جائے گی۔ اگر پہیہ نہ ہوتا تو گھڑی کبھی نہ چل سکتی۔ ریل لکڑی کے مکان سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی ٹیلی فون کا نمبر کبھی نہ ملتا۔ ریڈیو کبھی نہ چلتا۔ دوربین اور خوردبین کوئی کام نہ دے سکتیں۔ غرضکہ دنیا کی کوئی ایجاد بھی کام نہ دیتی۔

سورج، چاند، ستارے، زمین اور فطرت کی ہر چیز گول ہے اور یہی وہ چیزیں ہیں جن سے میں نے نتیجہ اخذ کر کے پہیہ ایجاد کیا ہے دنیا مجھے بھول چکی ہے۔ میری ایجاد کے مفید ترین صرف کو بھول چکی ہے۔ مجھے بھی یاد دہانی کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ اگر ہر ایک موجد آج لاف و گزاف سے کام نہ لیتا اور آپ لوگوں کا شور و غوغا بلند نہ ہوتا۔ میں آپ سے داد یا تحسین نہیں چاہتا صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ حقیقت اور واقعیت کو نظر انداز نہ کریں"........

چاروں طرف ہیئر ہیئر کا آوازہ بلند ہونے لگا۔ لوگ بوڑھے کو حقارت کی بجائے عزت و احترام کی نظر سے دیکھنے لگے۔ ایک نوجوان نے اٹھ کر اس کا ہاتھ چوم لیا۔ مارکونی نے مبارکباد دی۔ سٹیفن سن نے جوشِ عقیدت میں اٹھا لیا۔ بوڑھا اب لوگوں کے کندھوں پر تھا۔ جلسہ ختم ہو گیا اور لوگ جلوس کی صورت میں بوڑھے کو اٹھائے ہوئے باہر نکلے ہوتے ہوتے ہجوم اس قدر ہو گیا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ یہ فیصلہ پبلک کا فیصلہ تھا۔ ایجاد کا سوال ختم ہو چکا تھا اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی تھی کہ پہیہ دنیا کی اولین بہترین ایجاد ہے۔ قریب کی مسجد سے اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی اور میری آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کی خرابی کی وجہ سے طبیعت میں کسلمندی تھی لیکن اس اہم مسئلے کے حل ہو جانے سے دل مطمئن تھا۔

آہ اتاترک مصطفےٰ کمال غفران پناہ

عالی جناب نواب غازی دام اقبال آف گوڑھا اسٹیٹ

بر لبت رخت گل چو بہاراں کمال ما ٭ در داکہ بے ثمر شدہ شاخ نہال ما
زاں رو کہ داد تعلیم اتاترک را عزیز ٭ ربا اجل پذیرہمیں بر عمال ما
بر تر نقش ردائے قمر گستر اے فلک ٭ کین است حجلۂ مہ فرخندہ فال ما
رو زِ سیاہ ما ز فروغش فراغ یافت ٭ مہر کمال بود بوقتِ زوال ما
چندیں فراخت زرفشِ گردوں مقام را ٭ افتاد بدر چرخ بپائے ہلال ما
کالائے سوختہ بعیارِ طلا رسید ٭ الماس شد ز نورِ جمالش ز غال ما
آں کار صعب کس نتواں کرد کرد او ٭ آسان و سہل بود برش ہر محال ما
در بزم و رزم پیل بجز آں دیگرے نبود ٭ با با بگفت رستم دوراں بزال ما
کم گفت و بیش کرد مرآں پیکرِ عمل ٭ حالش بدست حجت ما بہرِ قال ما
فاروق سال بہ فرق نہ تاج گہر نہاد ٭ آں خسرو جلیل کہ نامش جلال ما
[illegible] مقامش خبر نداشت ٭ نشناخت شیخ مرتبۂ مردِ حال ما
[illegible] آفتاب مرکزِ جذب کواکب است ٭ او کہربائے بود پئے اتصال ما
شرح محاسنش نتواں گفت زیں جہت ٭ بشنید ہم لغت صفت خوش خصال ما
از انبیا نبود و کارے رسول کرد ٭ باد القصر خلد ہمیشہ مثال ما
در داد زندگی بہ گِل و آب چوں رواں ٭ جاں شد ز تن کہ رفتنش آں ارتحال ما
ایں قوم زندہ کرد مسیحا بچند فرد ٭ بازش فرست بار خدایا بر آل ما
تو ایزدی و خواجۂ مالی و دادرس ٭ بر خے بگوش خود شنو ایک سوال ما
آخر چرا بہ آدمیاں خلق می کنی ٭ خاکستر اذل شدن است ار مآل ما
خر دل شدست ہمتِ مردانہ آہ آہ ٭ زلبکہ بود جوہر نغش مجال ما
روحش چو پنجہ زد قفسِ عنصری شکست ٭ نشکست حسرتا غم بشکستہ بال ما
اے دل ز فرطِ غم بکفت ای چشم خوں ببار ٭ آں کو زخوبی خویش نشستے ملال ما
اے نطق گنگ نال خروش ای زباں للٰل ٭ باشد کہ پائے عرش بجند ز گال ما

طوفانِ غم بر دیدہ بحر آشنا کجاست
گر ناخدا نماند خدائے شنا کجاست

کوپن بذریعہ ڈاک بھیجئے

بخدمت مینجر صاحب امرت دھارا فارمیسی۔ لاہور

براہ نوازش کتاب امراض مخصوصہ مرداں" کی ایک جلد بوا پسی ڈاک مفت ارسال فرمادیں میں انگریزی۔ ہندی۔ بنگالی۔ اُردو ایڈیشن چاہتا ہوں۔

نام . . . .

پتہ . . . .

ڈاک و تار کا پتہ:۔ امرت دھارا۔ لاہور

جوانی کی یاد

گائی ڈی موپاساں کے ایک شاہکار کا ترجمہ

از جناب عبدالرحیم صاحب شبلی۔ بی کام

ہوٹل میں دونوں دوست اپنا کھانا ختم کر چکے تھے۔ کھڑکی میں سے انہوں نے دیکھا کہ ہوٹل کا تمام صحن گاہکوں سے اٹا پڑا ہے۔ وہ نرم و گرم ہواؤں کا لمس محسوس کر رہے تھے۔ ایسی ہوائیں بالعموم پیرس میں موسم گرما کی ساکن راتوں کو چلا کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک نے جب اس انبوہ کو دیکھا تو اس کا جی چاہا کہ وہ پُرشور دنیا کو چھوڑ کر کسی دور دراز سبزہ زار کے کنج عافیت میں چلا جائے۔ جہاں وہ چاندنی راتوں میں چمکنے والے دریاؤں، شمع پر قربان ہونے والے پروانوں اور گلشنوں میں گانے والے ہزار داستانوں کے حسین تصور میں کھو جائے۔

اس نے ایک سرد آہ بھری اور اپنے ساتھی کو کہا ——

"آہ! میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔ کسی زمانہ میں ایسی ہی نشاط انگیز شب میرے خون میں جوانی کی ایک لہر دوڑا دیتی تھی۔ لیکن اب مری زندگی افسردہ ہے۔ آہ حیات کی ساعتیں کس سرعت سے گزر جاتی ہیں۔"

دوسرے نے جواب دیا —— "بھئی مری زندگی تو اس قدر جلد گزر رہی ہے کہ مجھے علم بھی نہیں ہو سکا۔ ایک زمانہ تھا کہ میں ہشاش بشاش اور مضبوط و توانا تھا۔ لیکن اب آئینہ میں منہ دیکھتا ہوں تو حیرت انگیز انقلاب آ چکا ہے۔ اگر ہم روزانہ اپنا چہرہ آئینہ میں دیکھیں تو شاید زمانہ کے تغیرات ہمیں نظر بھی نہ آئیں۔ لیکن اگر اکٹھے چھ ماہ بعد شیشہ میں منہ دیکھا جائے تو آہ! ہمیں کس قدر صدمہ ہو!

اور عورتیں، میرے دوست! مجھے ان پر رحم آتا ہے۔ ان کی تمام مسرت۔ ان کی تمام قوتیں۔ ان کی تمام زندگی کا راز اس خوبصورتی میں مضمر ہے جو صرف دس سال تک رہتی ہے ——

ہاں، تو میں محسوس کئے بغیر بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اب کہیں پچاس برس کی عمر کو پہونچ چکا ہوں۔ اور اپنے آپ کو بالکل ناکارہ خیال کرتا ہوں۔

میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح دامِ عشق میں گرفتار رہا ہوں تم کو اپنی پریم کہانی سناتا ہوں ——

بارہ برس ہوتے وہ مجھے ساحلِ سمندر پر ملی تھی۔ صبح کو ساحل پر غسل کرنے میں خاص لطف آتا ہے۔ عورتیں بھی شب خوابی کا لباس پہن کر وہاں آتی ہیں۔ انسان اگر صبح صبح قریب کی چٹانوں پر جا کر بیٹھ جائے تو وہ غسل کے نظارے سے حد درجہ محظوظ ہوگا۔ حسین عورتیں ساحلِ سمندر پر ایک خاص ادا سے اپنا لبادہ اتار پھینکتی ہیں اور چھوٹے چھوٹے تیز قدموں کے ساتھ کف ریز لہروں میں خرامِ ناز کرنے لگ جاتی ہیں۔ بعض اوقات انہیں سردی محسوس ہوتی ہے تو وہ کپکپاتی اور ٹھٹھرتی ہیں۔ سب عورتیں اس صبر آزما امتحان کی تاب نہیں لا سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ [illegible] سمندر کا پانی صحت بخش ہے لیکن جب وہ نہانے سے فارغ ہو کر باہر نکلتی ہیں [illegible] چہروں پر ضعف و اضمحلال کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔

جب میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تو میں اُس کے حسنِ تابناک کو دیکھ کر بے خود سا ہو گیا۔ میرے سراپا میں ایک سرور آگین لہر دوڑ گئی اور مجھے محسوس ہوا کہ شاید میں پیدا ہی اِس غرض کے لئے ہوا ہوں کہ اُس زہرہ جبین سے محبت کروں۔

میں نے اُس سے بہت جلد تعارف پیدا کر لیا۔ اور پہلی ہی ملاقات میں "اسیرِ زلفِ گرہ گیر" ہو گیا۔ کسی حسینہ کا کُشتہ ناز بننا کتنا پُرلطف تجربہ ہے۔ محبت کی پہلی نگاہیں ستم آرا تو ہوتی ہیں۔ لیکن اُن میں ایک بے پایاں مسرّت پائی جاتی ہے۔

آہ اُس کی نگاہیں۔ اُس کا ہلکا ہلکا تبسّم، تاریک رات کی طرح اُس کی سیاہ زُلفیں جن کے ساتھ بادِ نسیم کے جھونکے کھیل رہے تھے اور اُس کے ملیح و صبیح چہرے کے منحنی خطوط نے مجھے قریباً پاگل بنا دیا اور اُس کے مرمریں سراپا نے مجھے ایک ایسی سحر آفرین قوت کے ساتھ جکڑ لیا کہ اُس سے چھٹکارا پانا اب میرے لئے ممکن نہ تھا۔

وہ شادی شدہ تھی لیکن اُس کا شوہر صرف ہفتہ کے دن آتا اور سوموار کو چلا جاتا تھا۔

اِس کے باوجود آہ! میں اُس سے کتنی محبت کرتا تھا۔ وہ کتنی حسین اور جوان تھی۔ خلاصہ یہ کہ وہ شباب، حسن اور تر و تازگی کا مجسّمہ تھی۔

اس سے پہلے مجھے عورت کی لطافتوں کا تجربہ نہ تھا۔ میں نے کبھی وہ حُسن محسوس نہیں کیا تھا۔ جو کسی دوشیزہ کے رخسار کے چاہِ ذقن، سیلے ہونٹوں کی کپکپاہٹ، اور نرگس کی طرح خمار آلود آنکھوں کی نیم بازی میں مضمر ہے۔

میں نے تین ماہ محبت کی آغوش میں گزارے۔ پھر میں امریکہ چلا گیا۔ میرے دل میں اگرچہ ناامیدی پیدا ہو چکی تھی۔ لیکن اُس کی یاد نے میری حیاتِ سوگوار کو قابلِ بسر بنا دیا تھا۔ میں اگرچہ فاصلہ پر تھا۔ مگر اُس کے تصوّر نے اِس دُوری کو قرب میں تبدیل کر دیا تھا۔

کئی سال گزر گئے ہیں میں اُسے فراموش نہ کر سکا۔ اُس کی معصوم تصویر ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتی اور میں محسوس کرتا کہ میری محبت میں ہر روز اضافہ ہو رہا ہے۔

حیاتِ انسانی میں بارہ سال ایک قلیل عرصہ ہے۔ ہم اِس مدت کے ختم ہونے کو محسوس بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن جب اِس عرصہ کے خاتمہ پر اپنے ایامِ ماضی پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں۔ تو ہمیں اپنی گزشتہ زندگی کے نقوش بہت مدھم محسوس ہوتے ہیں اور ہمیں یہ معلوم کر کے ایک گونہ حیرت ہوتی ہے کہ ہم بوڑھے ہو چکے ہیں۔

مجھے فی الواقع ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اپنی محبوبہ سے جدا ہوئے مجھے ابھی چند روز ہی گزرے ہیں اور میں ابھی کل ہی اس سے ساحلِ سمندر پر ملا تھا۔

گزشتہ موسمِ بہار میں میں دعوت پر کسی نزدیکی شہر کو اپنے دوستوں کے پاس جا رہا تھا۔ جب گاڑی چلنے لگی تو ایک موٹی بھدّی عورت مع اپنی چار لڑکیوں کے میرے کمرہ میں داخل ہوئی میں نے اُس کے چہرہ کو دیکھنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ وہ ہانپ رہی تھی اور اُس کے بچّے شور مچا رہے تھے۔ میں نے وقت کاٹنے کے لئے اپنے کاغذات نکال لئے اور انہیں پڑھنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ اجنبی عورت کہنے لگی — "معاف کیجئے لیکن آپ موسیو کارنیر تو نہیں ہیں؟"

"جی ہاں"

یہ سُنتے ہی اُس نے ایک پُر زور قہقہہ لگایا۔ وہ ایک مطمئن عورت کی طرح ہنس رہی تھی۔ لیکن اُس کی آواز میں ایک غمگینی کی جھلک تھی۔

"آپ نے مجھے پہچانا؟"

میں نے جواب دینے میں تامّل کیا۔ کیونکہ مجھے خیال پڑتا تھا کہ میں نے اُسے کہیں دیکھا ہے۔ لیکن .... کہاں! .... کب؛ اِس لئے میں نے کہا —

"ہاں ...... نہیں .... میں جانتا تو ہوں لیکن مجھے آپ کا نام یاد نہیں آتا ...."

وہ ذرا شرما گئی۔ پھر بولی "میڈم جولی"

مجھے ایک دھچکہ سا لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں بیہوش ہو رہا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مری آنکھوں پر سے ایک پردہ سا ہٹا دیا گیا ہے اور کچھ سنسنی خیز اور جگر پاش انکشافات ہونے لگے ہیں۔

یہ وہی تھی! کیا واقعی یہ معمولی سی موٹی عورت وہی تھی؟ اور اُس کے ہاں اتنے عرصہ میں چار لڑکیاں بھی پیدا ہو گئی تھیں؟ ان لڑکیوں کو دیکھ کر مجھے اور بھی تعجب ہوا۔ جب میں نے اُسے دیکھا تھا تو وہ ایک مست شباب حسینہ تھی۔ لیکن اب ...... اب اُس کی کیا حالت ہو گئی تھی؟ کیا یہ ممکن تھا؟ میرے دل کو بہت صدمہ ہوا اور مجھے قدرت کے اس مذموم اور وحشیانہ فعل پر بہت غصہ آیا۔

میں نے اُسے خوفزدہ نگاہوں سے دیکھا۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ یا اللہ اُس کی یہ کیا حالت ہو گئی تھی!

وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں بدل گئی تھی۔ ہیں نہ! یہ زمانہ کے انقلابات ہیں۔ میں ایک ماں بن گئی ہوں۔ ایک اچھی ماں۔ اب مجھے کسی چیز کی پروا نہیں۔ میرا خیال تھا۔ کہ اگر ہم کبھی ملے تو تم مجھے پہچان نہیں سکو گے لیکن تم بھی تو بدل گئے ہو۔ مجھے بھی پہچاننے میں دقت ہوئی۔ تمہارا رنگ فق ہوا جا رہا ہے۔ لیکن ذرا یہ بھی تو سوچو کہ اُس واقعہ کو بارہ سال گزر چکے۔ اتنا عرصہ تھوڑا نہیں ہوتا۔ میری بڑی لڑکی کی عمر دس سال ہے۔"

میں نے اُس کی لڑکی کی طرف دیکھا۔ اُس کی شکل اپنی ماں کی جوانی کی یاد تازہ کر رہی تھی۔ اگرچہ وہ ابھی کمسن تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ زندگی ایک تیز رفتار گاڑی کی طرح ہے۔

میرا مطلوبہ اسٹیشن آ گیا۔ میں نے اپنی پرانی رفیقہ کے ہاتھ کو الوداعی بوسہ دیا۔ میں زندگی کے اس انقلاب پر اس قدر حیران تھا کہ اُسے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

اُس رات جب میں گھر میں اکیلا تھا تو میں دیر تک اپنے آپ کو آئینہ میں دیکھتا رہا۔ میں نے وہ وقت یاد کیا جب میرے چہرہ پر شباب کی رونق تھی۔ میرے بال سیاہ تھے اور میری مونچھیں بھوری تھیں۔ آہ! اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میرا خونِ حیات سرد ہو چکا ہے۔

الوداع خدا حافظ۔!!

داستان زندگی

از جناب حسیب حکیم صاحب اورنگ آبادی

کبھی تو کام آئیگی یہ بیتابی مرے دل کی
تڑپ کر موج دریا میں خبر لاتی ہے ساحل کی

نشاطِ دہر سے کیا فائدہ ہم غم نصیبوں کو
کہ گریاں بزمِ عشرت میں رہا کی شمعِ محفل کی

ضیا پاشی تری مطلوب ہے اے جلوۂ رنگیں!
کہ بڑھتی جاتی ہیں تاریکیاں غم آشنا دل کی

بہت ہی مختصر ہے جادۂ ہستی یہ سنتے تھے
مگر یہ سختیاں ہمت شکن ہر ایک منزل کی

کیا ٹھنڈا ہمارے گریۂ پیہم نے ہی ورنہ
بجھائے سے کسی کے آگ بجھ سکتی تھی اس دل کی

سنبھل کر ڈالنا بحرِ طلب میں کشتیٔ دل کو
خبر ملتی ہے اس میں ڈوب کے دریا کے ساحل کی

فریبِ التفاتِ بے عنایت کس لئے کھائیں؟
نگاہیں کہہ رہی ہیں صاف جو مرضی ہے قاتل کی

سنبھلنا ہی ترے بیمار کا گویا بگڑنا تھا،
تڑپ یہ آخری تھی ایک بیکس مرغِ بسمل کی

جسے کہتے ہیں جینا نام ہے دل کے دھڑکنے کا
ہماری زندگی ہے داستاں بیتابیٔ دل کی

حکیم اس کا شرف زاغ و زغن کو کیسے حاصل ہو
گرفتارِ قفس ہونا ہے قسمت میں عنادل کی

8 JAN 1939
4 APR 1939
1 MAY 1939
8 DEC 1939
7 APR 1940
1 MAY 1940
22 SEP 1940
25 MAY 1941
3 JUL 1941